خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

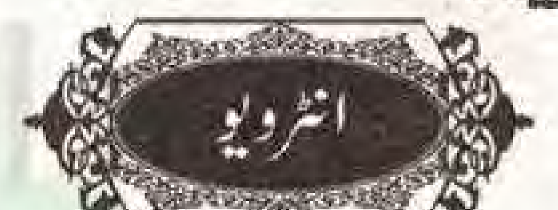
خواتین ڈائجسٹ

فروری 2014







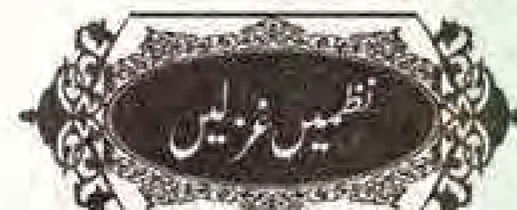
























فروری 2014
جلد 41 شمارہ 10
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ایک سیدھے، صاف، درست راستے پر چلتے ہوئے واپس مڑ جائیں اور پھر سوچیں، کہاں جانا ہے؟

بے سمتی اور گومگو کی یہ کیفیت تب پیدا ہوتی ہے جب اپنے فیصلوں کے راست ہونے کا خود بھی یقین نہ ہو۔ صداقت صاف اور واضح ہوتی ہے۔ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جواز، دلیلیں، نکتے تلاش نہیں کیے جاتے۔ تمام جہاں کے لفظوں کا انبار، دنیا بھر کے دلائل مل کر بھی غلط کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے۔

زمینی حقیقتوں سے فرار ممکن نہیں لیکن جب معاملہ اپنی بقا اور سلامتی کا ہو تو سود خسارے کے حساب بے معنی ہو جاتے ہیں۔

زبردستوں کی بالادستی کے سامنے جھک جانا، ان کے ظلم اور قہر کو برداشت کر لینا علیحدہ بات ہے لیکن اس کو درست تسلیم کر لینا، اس کے حق میں دلائل دینا۔؟

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں تواتر سے اس کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے سوچا سمجھا طریق کار ہے یا ہم سچ کی پہچان ہی کھو بیٹھے ہیں۔

اس تمام کارِلاحاصل میں میڈیا کا حصہ بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب سنجیدہ اور گمبھیر معاملات کو بحث ومباحثہ اور مذاکروں کی نذر کر دیا جائے۔ جھوٹ اور سچ کا فرق مٹ جائے تو ضمیر بھی اٹھ جاتا ہے۔

سالگرہ نمبر،

1972ء کا موسم بہار جب خواتین کے لیے ایک منفرد، خوبصورت اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلا ماہنامہ منظرِعام پر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر گھر کا پرچا بن گیا۔

خواتین ڈائجسٹ کے اجرا کو بیالیس سال ہونے والے ہیں۔ اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ ہماری خواہش ہے کہ سالگرہ نمبر میں ان تمام مصنفین کو جگہ دی جائے جن کا اس پرچے کی کامیابی میں بڑا حصہ ہے۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں جگہ پا سکیں۔

اس شمارے میں،

- اب کے مری رفوگری۔ سائرہ رضا کے ناول کا دوسرا اور آخری حصہ،
- بشریٰ احمد، سمیرا حمید، آمنہ ریاض اور نورعین کے ناولٹ،
- حیا بخاری، حنا یاسمین، صباحت یاسمین اور خولہ بنت حوّا کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ غزالہ بٹ سے ملاقات،
- باتیں یمنیٰ زیدی سے،
- میری خامشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

اس شمارے کو پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نیکی میں حصہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''مسلمان امانت دار خزانچی، جو اس پر عمل کرے جس کا اسے حکم دیا جائے اور پوری خوش دلی سے اسے کامل اور پورا پورا (مال) دے، جس کی بابت اسے حکم دیا گیا ہے، تو وہ بھی دو صدقہ کرنے والوں میں سے ایک (شمار) ہوگا۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں بھی ایک نہایت ہی اہم اصول کا بیان ہے کہ جس شخص کو جس کام کا ذمے دار یا بیت المال کا امین بنایا جائے اور وہ اپنی ذمہ داری خوش دلی سے نبھائے، کسی پر حسد نہ کرے، ایذا نہ دے اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرے تو اسے بھی اس شخص کی طرح برابر کا اجر ملے گا جس نے اس کے ذمہ کوئی کام لگایا، یا اسے خزانچی بنایا۔

2۔ اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ ہر شخص کو اپنی مفوضہ (سپرد کی گئی) ذمہ داری پوری خوش دلی اور رغبت سے ادا کرنی چاہیے

دین خیر خواہی

حضرت ابو رقیہ تمیم بن اوس داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''دین خیر خواہی (کرنے کا نام) ہے۔''

ہم نے پوچھا ''کس کی خیر خواہی؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے حکمرانوں کی اور عام مسلمانوں کی۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں خیر خواہی کی اہمیت و فضیلت اور اس کی عمومیت کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خیر خواہی کا مطلب

ہے' اس پر صحیح طور پر ایمان رکھا جائے اور اس کی عبادت اخلاص سے کی جائے۔ کتاب اللہ کی خیر خواہی' اس کی تصدیق تلاوت کا التزام' اس کی تحریف سے اجتناب اور اس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پابندی کی جائے مسلمان حکمرانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی کا مطلب ہے' حق میں ان کی اعانت' غیر معصیت میں ان کی اطاعت کی جائے' وہ سیدھے راستے سے انحراف کریں تو انہیں معروف کا حکم دیا جائے اور ان کے خلاف خروج و بغاوت سے گریز کیا جائے الا یہ کہ ان سے کفر صریح کا اظہار ہو اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی دنیا و آخرت کی اصلاح کے لیے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے' انہیں نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔

2۔ دور حاضر میں امت مسلمہ کی بدحالی کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص دوسرے کو داؤ لگانے پر لگا ہوا ہے۔ نہ ہم مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ کے خیر خواہ ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور نہ ایک دوسرے کے بارے میں ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات ہی رکھتے ہیں۔

مومن

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لیے بھی وہ چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ یہ حدیث بھی مسلمانوں کی باہمی خیر خواہی کی فضیلت اور اس کی ترغیب کے بیان میں ہے۔ اگر مسلمان اس حدیث کے مطابق عمل کریں تو مسلمان معاشروں میں جو لوٹ کھسوٹ' رشوت' بددیانتی' جھوٹ' فریب اور جعل سازی وغیرہ جیسی اخلاقی بیماریاں عام ہیں یک لخت ختم ہو جائیں۔

2۔ مسلمانوں کو تو ان کے دین نے بڑے سنہری اصول بتلائے ہیں لیکن بدقسمتی سے مسلمان ان سب سے غافل ہیں اور یوں ذلت اور بد اخلاقی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے ہوئے ہیں۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور تم میں سے ایک گروہ ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے' نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں (کی ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"(اے پیغمبر!) عفو و درگزر اختیار کر' نیکی کا حکم دے اور جاہلوں سے اعراض کر۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی زبانی لعنت کی گئی' یہ اس سبب سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جانے والے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو ان برائیوں سے نہیں روکتے تھے جن کا وہ ارتکاب کرتے تھے' البتہ بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"(اے نبی!) کہہ دیجیے! حق تمہارے رب کی طرف سے ہے' چنانچہ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"(اے پیغمبر!) جس چیز کا تجھے حکم دیا جاتا ہے' اسے کھول کر بیان کر دے۔"

اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔

"ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو برائی سے روکتے تھے اور ظالموں کی سخت عذاب کے ساتھ گرفت کی' بہ سبب اس کے جو وہ نافرمانی کرتے تھے۔"

برائی کو روکنا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص تم میں سے کسی برائی کو (ہوتے) دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل (روک) دے۔ اگر (ہاتھ سے روکنے کی) طاقت نہیں ہے تو زبان سے (اس کی برائی کو واضح کرے) اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (اسے برا جانے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ دیکھنے سے مطلب ہے' علم میں آنا' چاہے آنکھوں سے دیکھے یا نہ دیکھے۔ اس میں اسلامی معاشرے کو منکرات سے روکنے کے لیے ایک نہایت اہم حکم دیا گیا ہے۔ مسلمان جب تک اس پر عمل کرتے رہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بلا خوف و خطر' کسی ملامت گر کی ملامت سے قطع نظر اور بغیر کسی مفاد کے ادا کرتے رہے' مسلمان معاشرہ بہت سی قباحتوں' برائیوں اور گناہوں سے محفوظ رہا اور جب مسلمانوں نے اس فریضے کو فراموش کر دیا تو ان کا معاشرہ منکرات کے سیلاب بے پناہ کی زد میں آ گیا۔ کاش مسلمان پھر اس فریضے کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہوں تاکہ اس سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکے۔

2۔ انسان کے ایمان کا آخری درجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں کم از کم برائی کی قباحت ضرور ہو۔ اگر برائی کی قباحت ہی دل سے نکل جائے تو پھر ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

3۔ دور حاضر میں نوجوانان امت جس بے راہ روی کا شکار ہیں اور فتنوں کی جس قدر بھرمار ہے' اس میں اپنے ایمان کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان دعوت و تبلیغ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے۔ اس سے کم از کم وہ خود تو بھٹکنے سے بچ جائے گا۔

مومن

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھ سے پہلے اللہ نے جو نبی بھی بھیجا' اس کے اس کی امت میں سے حواری اور (مخلص) ساتھی ہوتے جو اس کی سنت پر عمل اور اس کے حکم کی اقتدا کرتے' پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوئے جو ایسی باتیں کہتے جو وہ کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ کام تھے جن کا انہیں حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جو شخص ان سے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے گا' وہ مومن ہے اور جو شخص ان سے دل کے ساتھ جہاد کرے گا' وہ مومن ہے۔ جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے گا' وہ مومن ہے۔ اور اس کے علاوہ رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان (کا درجہ) نہیں۔" (مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ منکرات کے ازالے کا' حسب طاقت' ہر مسلمان ذمہ دار ہے' بلکہ یہ اس کے ایمان کی کسوٹی ہے۔ اگر ایک مسلمان منکر کے ازالے اور خاتمے کے لیے سعی کرتا یا کم از کم اسے برا سمجھتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی دلیل ہے اور اگر وہ برائی کو دل میں بھی برائی نہیں سمجھتا تو سمجھ لو کہ اس کا دل ایمان کے کمزور ترین درجے سے بھی محروم ہو گیا ہے۔

سلامتی

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اس شخص کی مثال جو اللہ کی حدود کو قائم کرنے والا ہے اور اس کی جو ان حدوں میں مبتلا ہونے (انہیں پامال کرنے) والا ہے، ان لوگوں کی طرح ہے (جو ایک کشتی پر سوار ہوئے) انہوں نے کشتی کے اوپر (اور نیچے والے حصوں کے لیے) قرعہ اندازی کی۔ چنانچہ ان میں سے بعض کشتی کی بالائی منزل پر اور بعض نچلی منزل پر بیٹھ گئے۔ نچلی منزل والوں کو جب پانی لینے کی طلب ہوتی تو وہ اوپر آتے اور بالا نشینوں پر سے گزرتے (جو انہیں ناگوار گزرتا)۔ چنانچہ نچلی منزل والوں نے سوچا کہ اگر ہم اپنے (نچلے) حصے میں سوراخ کرلیں (تاکہ اوپر جانے کے بجائے، سوراخ ہی سے پانی لے لیں) اور اپنے اوپر والوں کو تکلیف نہ دیں (تو کیا اچھا ہو)۔ اور اوپر والے نیچے والوں کو ان کے اس ارادے سمیت چھوڑ دیں (انہیں سوراخ کرنے سے نہ روکیں اور وہ سوراخ کرلیں) تو سب کے سب ہلاک ہوجائیں گے (کیونکہ) سوراخ کے ہوتے ہی ساری کشتی میں پانی جمع ہوجائے گا جس سے کشتی تمام مسافروں سمیت غرق آب ہوجائے گی۔) اور اگر وہ ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیں گے (سوراخ نہیں کرنے دیں گے) تو وہ خود بھی اور دوسرے تمام مسافر بھی بچ جائیں گے۔" (بخاری)

اللہ کی حدوں کو قائم کرنے والے کا مطلب ہے اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کا انکار کرنے والا اور ان کے ازالہ ورفع کی کوشش کرنے والا۔ حدود سے مراد ہے اللہ کی منع کردہ چیزیں۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی معاشرے میں منکرات کے ارتکاب کے نتائج، مرتکبین کی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کے برے اثرات پورے معاشرے کو بھگتنے پڑتے ہیں، اس لیے معاشرے کو تباہی سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ فسق و فجور کا ارتکاب کرنے والوں کو اللہ کی نافرمانی کرنے سے روکا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو سارا معاشرہ عذاب الٰہی کی گرفت میں آسکتا ہے۔

دل سے برا سمجھنا

ام المومنین حضرت ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یقیناً" تم پر عنقریب ایسے لوگ حکمران بنائے جائیں گے جن (کے کچھ کاموں) کو تم پسند کروگے اور کچھ کو ناپسند۔ چنانچہ جس نے (ان کے برے کاموں کو) برا سمجھا، وہ بری ہوگیا، جس نے انکار کیا وہ بچ گیا، لیکن جو راضی ہوا اور ان کی پیروی کی (وہ ہلاک ہوگیا)۔"
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہم ایسے حکمرانوں سے قتال نہ کریں؟" آپ نے فرمایا۔
"نہیں، جب تک وہ تمہارے اندر نماز کو قائم رکھیں۔" (مسلم)
اس کے معنی ہیں جس نے دل سے برا سمجھا اور اس کے پاس ہاتھ یا زبان سے انکار کی طاقت نہیں تھی تو وہ گناہ سے بری ہوگیا اور اپنا فرض ادا کردیا اور جس نے اپنی طاقت کے مطابق انکار کیا، وہ اس معصیت سے بچ گیا اور جو ان کے فعل پر راضی ہوا اور ان کی متابعت کی، تو وہ گناہ گار ہے۔

فوائد و مسائل:

1۔ مسلم حکمرانوں کی اطاعت کو نماز کے ساتھ مشروط کرکے اس امر کی وضاحت فرمادی کہ نماز ہی کفر اور اسلام کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہے۔
اگر طاقت ہو تو حکمرانوں کو برائی سے ضرور روکے، بصورت دیگر دل سے برا جانے۔ برائی میں ان کے ساتھ شرکت و رضامندی نہایت خطرناک ہے۔ اس لحاظ سے آج کل سیاسی پارٹیوں میں شرکت بہت خطرناک معاملہ ہے کیونکہ یہ پارٹیاں جب اقتدار میں آتی ہیں تو پارٹی ممبران کو ان کے ہر اچھے برے کام میں ان کی ہم نوائی اور متابعت کرنی پڑتی ہے۔

یاجوج ماجوج

ام المومنین ام حکم زینب بنت حجش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (ایک روز) ان کے پاس بڑے گھبرائے ہوئے تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر یہ کلمات تھے۔
"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عربوں کے لیے اس شر کی وجہ سے ہلاکت ہے، جو قریب آگیا ہے۔ آج یاجوج و ماجوج کی دیوار سے اتنا حصہ کھول دیا گیا ہے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں (انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی) سے حلقہ بنا کر دکھایا۔ میں نے کہا۔
"اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہم ہلاک ہوجائیں گے جب کہ ہمارے اندر نیک لوگ بھی ہوں گے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
"ہاں جب برائی عام ہوجائے (تو پھر نیک بھی بدوں کی صف میں شمار کرلیے جاتے ہیں)۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں بھی فسق و فجور اور معصیت کی نحوست کا بیان ہے کہ جب برائی اور معصیت عام ہوجائے تو پھر بعض نیک لوگوں کے باوجود اس قوم کو ہلاک کردیا جاتا ہے، تاہم نیک لوگوں نے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ سرانجام دیا ہوگا تو قیامت والے دن، یہ برائی کا ارتکاب کرنے والوں سے الگ ہوں گے۔

راستوں کا حق

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔"
صحابہ نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لیے ان مجلسوں کے بغیر چارہ نہیں، ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر تم نے وہاں ضرور بیٹھنا ہی ہے تو تم راستے کو اس کا حق دو۔"
صحابہ نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! راستے کا حق کیا ہے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"نگاہیں نیچی رکھنا، تکلیف دہ چیزیں راستے سے ہٹا دینا (یا خود تکلیف پہنچانے سے باز رہنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام راستے اور سڑکیں جو لوگوں کی گزرگاہیں ہوں، ان پر ایسے انداز سے بیٹھنا کہ جن سے آنے جانے والے مردوں اور عورتوں کو تکلیف ہو، جائز نہیں ہے اور جب صرف بیٹھنا ہی جائز نہیں ہے تو پھر ان پر تجاوزات قائم کرکے یا شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کو بند کرکے ہزاروں لوگوں کو پریشان کرنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے جو بدقسمتی سے ہمارے ملک میں عام ہے۔
2۔ تاہم اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو تو پھر مذکورہ آداب و شرائط کے ساتھ اس کا جواز ہوگا۔ اس کے مزید کچھ اور آداب دیگر احادیث میں بیان کیے گئے ہیں، مثلاً" اچھی گفتگو کرنا، کوئی زیادہ بوجھ لادے ہوئے جارہا ہو تو اس کی مدد کرنا، مظلوم اور مصیبت زدہ کے ساتھ تعاون کرنا، بھٹکے ہوئے کی رہنمائی کرنا، چھینکنے والے کی چھینک کا جواب دینا وغیرہ۔



رباعی سے رکابی تک

انشاجی

کیا مرد واقعی سست اور بے سلیقہ ہوتے ہیں؟

ہمارے اس سے اختلاف یا اتفاق رائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عمومی رائے یہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی صفحے پر آپ ایک کارٹون دیکھیں گے۔ میاں نے لمبے ڈنڈے والے جھاڑو سے فرشوں کی صفائی کرنے کے بعد باورچی خانے میں بہت سی پلیٹیں دھولی ہیں۔ لیکن ابھی کچھ باقی بھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں میاں نے کچھ زیادہ دیر لگادی ہے۔ کیونکہ بی بی پہلے اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو سنتی رہیں پھر ڈرائنگ روم میں رسالوں میں تصویریں دیکھتی رہیں۔ آخر اس سے بھی اکتا گئیں۔ کارٹون میں وہ میاں سے کہہ رہی ہیں۔ "ذرا جلدی کام کیا کرو جی! میرا بھی کچھ خیال ہے؟ کتنی دیر سے اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

یہ مسئلہ بہت سے گھروں کا ہے۔ مرد لوگ گھر کی صفائی' چائے بنانے۔ برتن دھونے وغیرہ میں اتنی دیر لگادیتے ہیں کہ بیویاں عاجز آجاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ بیوی بستر میں پڑی ہیں' میاں چائے دانی بھر کر ان کے بستر کے پاس کی میز پر رکھ تو گئے لیکن پھر جاکر فرش رگڑنے لگے یا ناشتا بنانے لگے۔ اتنا خیال نہیں کہ چائے بنا کر بھی دینی ہے۔ ادھر بیوی ایک ہاتھ سے اخبار تھامے اسے پڑھ رہی ہیں۔ دوسرے سے سر کھجا رہی ہیں۔ ان کا کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو شاید خود بھی بنالیتیں۔ میاں صاحب ناشتا بنا کر بچوں کو نہلانے اور کپڑے بدلنے میں جُت جائیں گے اور پھر اپنے اور بیوی کے جوتے پالش کرنے کے بعد ان کو دفتر جانے کی جلدی پڑ جائے گی۔ شام کو آتے ہی باورچی خانے میں جاگھسیں گے یا غسل خانے میں بیٹھ کر بچوں کے کپڑے دھوئیں گے۔ اس سے فارغ ہوئے تو کچھ سلائی کا کام لے بیٹھیں گے۔ قمیصوں کے بٹن ٹانک رہے ہیں۔ جرابیں رفو کر رہے ہیں۔ گلدان سجا رہے ہیں۔ گویا ہر چیز کا خیال ہے۔ نہیں خیال تو بیوی کا جو اپنے کمرے میں پڑی برابر ریڈیو سن رہی ہیں یا معمے حل کر رہی ہیں اور بور ہو رہی ہیں۔ میاں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آکر ان کے پاؤں ہی داب دے۔

☼ ☼ ☼

ایک صاحب نے پچھلے دنوں ایک مضمون میں اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی اور اشارتاً کہا تھا کہ مردوں کو خانہ داری کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ شوہر صاحب علی الصبح بیوی کو بستر ہی میں چائے کی ایک گرما گرم پیالی بنا کر دے دیا کریں تو یہ معمولی سی بات باہمی محبت میں اضافے کا موجب ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ بہت سے مردوں کو سویٹر بُننے نہیں آتے۔ حالانکہ یورپ میں چند صدی پیشتر یہ کام مرد ہی انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے انہوں نے کئی فائدے بھی گنوائے تھے کہ سویٹر بُننے سے سگریٹ پینے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ وہ یوں کہ سگریٹ کا گل جھاڑنے کے لیے ہر بار سلائیاں ہاتھ سے رکھنی پڑتی ہیں اور یہ سلائیاں چلانا اتنا دلچسپ شغل ہے کہ چند دن کے بعد مرد سگریٹ پر لعنت بھیج دے گا کہ اس سے سویٹر بُننے کا مزا کرکرا ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ہماری رائے میں مردوں کے لیے شروع ہی میں اس قسم کی تربیت کا بندوبست ہو تو اچھا ہے۔ مثلاً" ان کی تعلیم میں خانہ داری کا مضمون ضرور ہونا چاہیے اور اسکولوں میں انہیں آٹا گوندھنا' روٹی پکانا' طرح طرح کے سالن تیار کرنا۔ بچوں کی نگہداشت گھر کی صفائی وغیرہ سکھانے کا عملی انتظام ضرور ہو تاکہ شادی کے بعد گھر سنبھال سکیں۔ اس خیال میں نہیں رہنا چاہیے کہ پڑھ لکھ کے گریجویٹ ہوگئے ہیں اور برسر روزگار ہیں تو لڑکیوں کے والدین ان کے گھر کے چکر کاٹنے شروع کردیں گے۔ اب تو ضرورت رشتہ کے اشتہار میں بھی یہ قید لگادی جائے گی کہ لڑکا قبول صورت اور پابند صوم وصلوٰۃ ہونے کے علاوہ گھر داری کا سلیقہ رکھتا ہو۔ سینا پرونا جانتا ہو۔ آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ جہیز کی کوئی قید نہیں۔ جتنا زیادہ لاسکے لے آئے۔ لڑکی کی والدہ جب لڑکے کو دیکھنے آئیں گی۔ تو لڑکے والے اس امر کا اہتمام کریں گے کہ اس وقت لڑکا حیا کی سرخی چہرے پر لیے باورچی خانے میں بیٹھا آلو گوشت پکا رہا ہو اور آٹا گوندھ کے ایک طرف رکھ چھوڑا ہو۔ لڑکے کی والدہ بہانے بہانے اپنی ہونے والی یا نہ ہونے والی سمدھن کو بتائے گی کہ یہ ساری چادریں اور غلاف میرے بیٹے نے کاڑھ رکھے ہیں۔ اپنے کالج میں سلائی کڑھائی میں ہمیشہ اول آتا رہا ہے۔ کھانا پکانے کی تربیت بھی ہم نے اچھی دلائی ہے۔ چھ مہینے تو اس نے شہر کے مشہور مسلم کالی ہوٹل میں خانساماں کا کام کیا ہے اور بیاہ شادیوں میں دیگیں پکانے بھی جاتا رہا ہے۔

ادھر سمدھن اپنی بیٹی کے گن گائیں گی کہ بہت خلیق اور ہنس مکھ ہیں۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اس لیے سہیلیوں کو لیے اکثر باغوں کی سیر کرتی رہتی ہیں۔ تصویریں بھی بناتی ہیں۔ آرٹ کونسل کی نمائش میں پہلا انعام ان ہی کو ملا وہ یوں کہ انہوں نے طوطا بنایا تھا۔ کسی نے اسے گھوڑا بتایا' کسی نے درخت' کسی نے آٹا پیسنے کی چکی۔ صحیح کوئی نہ بتاسکا۔ فلم کوئی نہیں چھوڑی اور مطالعے کا ایسا شوق ہے کہ پاکستان کا کوئی فلمی رسالہ نہیں جو نہ منگاتی ہوں۔ گاتی بھی ہیں۔ ٹکٹ جمع کرنے اور قلمی دوستی کا شوق ہے۔ ہم نے اس بات کی احتیاط رکھی ہے کہ کھانے پکانے اور صفائی دھلائی سے اس کے ان اشغال میں ہرج نہ واقع ہو۔ یوں بھی ان کے ابا پرانی وضع کے ہیں۔ ان امور میں عورتوں کا عمل دخل پسند نہیں کرتے۔ اب میں مطمئن ہوں کہ جیسا بر میں چاہتی تھی۔ ویسا اللہ نے دے دیا۔

☼ ☼ ☼

بہت سے مرد جن کی شروع کی زندگی بے ڈھنگی اور بدنظمی میں گزرتی ہے۔ شادی کے بعد یکسر بدل جاتے ہیں بشرطیکہ بیوی اچھی ملے اور میاں کی ذات میں جو کمی رہ گئی ہے' اسے پوری کردے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر رفیق شیرازی کی مثال لیجیے۔ فلسفے سے ان کو شغف تھا۔ سو ایم اے میں بھی اول رہے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر یونیورسٹی میں پڑھانے بھی لگے۔ لیکن علوم مفیدہ سے یکسر نابلد رہے۔ شادی ہوئی تو ہمیں ان کی آئندہ کی زندگی کے متعلق طرح طرح کے اندیشے تھے۔ لیکن پچھلے دنوں گاندھی گارڈن کے سامنے مل گئے۔ ایک بچہ ان کے کاندھے پر تھا اور دوسرا بچہ گاڑی میں۔ جسے وہ (بوتل سے) دودھ پلا رہے تھے۔ معلوم ہوا بیوی اندر پھولوں کی نمائش دیکھنے گئی ہیں۔

ہم نے کہا کہو کیسی گزر رہی ہے؟ بولے "یار اس عورت' نجمہ نے تو مجھے کندن بنادیا ہے۔ تم جانتے ہو میں کیسا بیکار احدی آدمی تھا۔ سوائے کتابوں کے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ روٹی پکانی تو ایک طرف آٹا گوندھنا تک نہ جانتا تھا۔ کپڑے دھونے اور استری کے فن سے بھی آگاہی نہ تھی اور بچوں کو نہلانے' رات کو اٹھ کر پیشاب کرانے کا سلیقہ بھی کہاں آتا تھا۔ اب ان دو سال میں سب کچھ آگیا ہے۔ چائے بہت عمدہ بناتا ہوں بلکہ نجمہ کو میرے ہاتھ ہی کی پسند ہے۔ برتن بھی اللہ کے فضل سے اچھے دھوتا ہوں۔ پچھلے دنوں اس کام کے لیے نوکر رکھا تھا' لیکن اس نے دو پلیٹیں توڑدیں۔ آخر اسے ہٹا کر پھر مجھے رکھا۔ یعنی پھر یہ کام میرے سپرد کیا۔ پھر قدرداں ایسی ہیں کہ ہر آئے گئے سے تعریف کرتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو خانہ داری کا سلیقہ اتنا اچھا آتا ہے کہ ان کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے۔ خیر یہ ان کی محبت ہے۔ من آنم کہ من دانم۔"

ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ شعر بھی تو کہتے تھے؟ اور غزل میں تو آپ کا اپنا رنگ تھا۔"

بولے "ہاں کہتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ سب تضیع اوقات تھی۔ جتنی دیر میں ایک شعر ہوتا تھا اتنی دیر میں پورا باورچی خانہ دھو ڈالتا ہوں۔"

ہم نے کہا "خیر کوئی رباعی ہی سنائیے کہ وہ بھی آپ کی بہت مرغوب صنف ہے۔"

بولے "رکابی؟" "اچھا یاد دلایا۔ آج بازار سے رکابیاں بھی خرید کے لے جانی ہیں۔ بیگم نے کچھ سہیلیوں کو حلیم کھچڑے کی دعوت دی ہے۔ بھلا بتائیے تو کیا کیا پڑتا ہے حلیم میں؟؟ آج پہلی بار پکاؤں گا یہ ڈش۔"



باتیں یمنیٰ زیدی سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"یمنیٰ زیدی۔"

2 "پیار کا نام؟"
"دوست مجھے یمنیٰ... یم' بابا مجھے یمو کہتے ہیں جبکہ امی یمنیٰ ہی کہتی ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش/ شہر؟"
"30جولائی 1989ء/ کراچی۔"

4 "بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"
"تین بہنیں میرا نمبر تیسرا ہے اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔"

5 "مادری زبان؟"
"اردو لیکن پنجاب میں رہنے کی وجہ سے پنجابی بھی آتی ہے۔"

6 "قد/ ستارہ؟"
"5فٹ4انچ/ لیو۔"

7 "تعلیمی قابلیت؟"
"ماسٹرز کر رہی ہوں انٹریر ڈیزائننگ میں۔"

8 "شادی؟"
"پلان تو یہی ہے کہ اگلے سال ہو جائے گی۔"

9 "کمانے کا عمل کب شروع ہوا؟"
"جب کالج کی طالبہ تھی تو پڑوسی کی بیٹی کو ٹیوشن دیتی تھی اور تین ہزار لیتی تھی۔ تب سے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔"

10 "شاہ خرچ ہیں؟"
"ہاں اس معاملے میں کہ مجھے تحفے تحائف دینے کا بہت شوق ہے اور اپنے چھوٹے بھائی کے لیے خرچ کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

11 "اس فیلڈ میں میرا تجربہ؟"
"ابھی صرف ڈیڑھ سال ہوا ہے اور ابھی تک کا تجربہ بہت اچھا ہے۔"

12 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"آٹھ یا نو بجے۔ دیر تک سونے کا مجھے شوق نہیں ہے ہاں دوپہر کو سونا اچھا لگتا ہے۔"

13 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے تو دل چاہتا ہے کہ صبح کا ناشتا بہت اچھا سا میں خود ہی بناؤں۔"

14 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"کوئی بات بری نہیں لگتی۔ مجھے تو گھر والوں کی ڈانٹ بھی اچھی لگتی ہے۔"

15 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"
"قانون تو کوئی بھی برا نہیں' اب اس پر عمل نہ کرنا برا لگتا ہے۔"

16 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں۔ مجھے اپنی آنکھیں اور اپنی مسکراہٹ بہت اچھی لگتی ہے۔"

17 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"مجھ میں بھوک برداشت کرنے کی صلاحیت ہے مگر امی ہوں تو پھر نخرے دکھاتی ہوں اور امی نہ ہوں تو برداشت کرنی پڑتی ہے۔"

18 "کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟"
"جب کوئی تقریب ہو فیملی میں یا خاندان میں۔"

19 "گرمیاں کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"کام ہو تو کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ مگر گرمیوں میں اگر وقت مل جائے سوئمنگ پول پہ چلی جاتی ہوں۔"

20 "غصہ کب آتا ہے؟"
"جب کسی چیز کا یا کسی شخصیت کا انتظار کرنا پڑے اور جب ٹریفک میں پھنس جاتی ہوں تب۔"

21 "کتنی پنکچول ہیں؟"
"بہت زیادہ' وقت کی بہت زیادہ پابندی کرتی ہوں۔ ہر جگہ وقت پر پہنچ جاتی ہوں مگر جب انتظار کرنا پڑے تو بہت غصہ آتا ہے۔"

22 "اگر غصے کا اظہار نہ کر سکیں تو؟"
"تو پھر رونے بیٹھ جاتی ہوں اور غصہ نکالنے سے بہتر رونا ہے۔"

23 "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"جن میں مینرز ہوتے ہیں' وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

24 "کس شعبے کے لوگ آپ کے آئیڈیل ہیں؟"
"آرمی کے لوگ میرے آئیڈیل ہیں' کیونکہ ان میں رکھ رکھاؤ اور ادب و آداب بہت ہوتا ہے۔"

25 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"



"تو بے بھاؤ کی سنادوں گی۔"

26 "اداکاری کے علاوہ کس فن میں ماہر ہیں؟"
"جوڈو کراٹے میں۔ مارشل آرٹ سیکھا ہوا ہے میں نے مگر کبھی استعمال نہیں کیا۔"

27 "پرائز بانڈ لینے کا شوق ہے؟"
"بہت شوق ہے اور کبھی کبھی نکل بھی آتے ہیں۔"

28 "اللہ سے آپ کا تعلق؟"
"بہت گہرا ہے۔ کیونکہ میں جس چیز کی خواہش کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں وہ مجھے بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔"

29 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"بابا کے غصے سے۔ حالانکہ انہوں نے ہمیں کبھی کچھ نہیں کہا مگر ان کی شخصیت بہت رعب دار ہے۔"

30 "کون سی چیز وقت سے پہلے مل گئی؟"
"شہرت اور پیسہ۔"

31 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"
"سنگل ہونا چاہیے۔"

32 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"عورت۔ مگر سخت دل بھی ہوتی ہیں۔ بس انہیں کنٹرول کرنا بہت اچھے طریقے سے آتا ہے۔"

33 "شاپنگ پہ جاتی ہیں تو آپ کی پہلی خریداری؟"
"شاپنگ کا مجھے بہت شوق ہے اور پہلی خریداری جیولری کی ہوتی ہے۔"

34 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"
قہقہہ....."میرے خیال میں ابھی اس کا جواب نہیں دے سکتی۔"
35 "پیسہ سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہیں؟"
"ابھی تو نہیں کرتی بس کر دیتی ہوں۔"
36 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"میری امی کی نصیحتیں۔"
37 "کون سی بات موڈ پہ اچھا اثر ڈالتی ہے؟"
"اگر سامنے والے کی حسِ مزاح اچھی ہو تو موڈ اچھا ہو جاتا ہے۔"
38 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"اداکاری اور ٹیچنگ۔"
39 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"اپنے۔"
40 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"گھر پہ..... گھر والوں کے ساتھ۔"
41 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"شلوار قمیص۔ ویسے ہر طرح کی ڈریسنگ کرتی ہوں۔"
42 "اپنے بارے میں کوئی ایک جملہ؟"
"ایڈجسٹ کرنے والی۔"
43 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اوپن ایریا میں جہاں میرے پودے وغیرہ رکھے ہیں۔"
44 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"
"ثانیہ سعید۔ سویرا ندیم۔"
45 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"میں بہت سست ہوں۔ اس معاملے میں سب کو شکایت ہے مجھ سے۔"
46 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"ڈانس' ہلہ گلہ اگر گھر میں اکیلی ہوتی ہوں تو۔"
47 "کوئی کردار جو آپ کرکے پچھتائیں؟"
"اب تک تو کوئی نہیں ہے۔"
48 "کوئی کردار جو ہٹ گیا ہو؟"
"خوشی ایک روگ" کا کردار۔"
49 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں جی..... اگر کوئی تنگ بھی کرتا ہے تو بڑی تمیز کے ساتھ بات کرتی ہوں۔"
50 "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"
"بہت اچھی..... گپ شپ لگانے میں مزہ آتا ہے۔"
51 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو کیا کریں گی؟"
"سارے نظام ٹھیک کروں گی۔"
52 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"کوئی اچھی سی ڈائری۔ بھلے میں اس میں کچھ نہ لکھوں۔ اس طرح جو بھی چیز اچھی لگتی ہے' جمع کرلیتی ہوں۔"
53 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کوئی بھی نہیں لیکن وہ نصیحت جس کے بارے میں مجھے سب پتا ہوتا ہے' وہ بری لگتی ہے۔"
54 "کس پہ جان نچھاور کر سکتی ہیں؟"
"اپنی پوری فیملی پہ۔"
55 "اپنی کمائی سے اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"موبائل ہی لیا ہوگا اور تو کچھ نہیں لیا۔"
56 "کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"ڈائننگ ٹیبل۔"
57 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گی؟"
"کچھ لینا نہیں چاہوں گی بلکہ ہر چیز کو ایکسپوز کرنا چاہوں گی۔ مجھے لوگوں کے گھر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"
58 "کردار کا موڈ پر اثر ہوتا ہے؟"
"بہت ہوتا ہے۔ میں تو اسکرپٹ پڑھتے پڑھتے اس میں گم ہو جاتی ہوں۔"
59 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"کچھ خاص نہیں لیکن روزانہ چیک ضرور کرتی ہوں۔"
60 "کوئی دیرینہ خواہش؟"
"اپنا گھر بنانا چاہتی ہوں۔"



61 "ایک کھانا جو بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"
"آلو گوبھی اور آلو بینگن مجھے بہت اچھے لگتے ہیں' اس لیے اچھا پکاتی ہوں۔ بریانی بھی اچھی پکا لیتی ہوں مگر سبزی کا اپنا ہی مزہ ہے۔"
62 "آپ کو کوئی اغوا کرلے تو گھر والوں کا ردعمل؟"
"بہت پریشان ہو جائیں گے۔ خاص طور پر میری امی۔"
63 "آپ کسی کو اغوا کرنا چاہتی ہیں اور تاوان میں کیا وصول کرنا چاہتی ہیں؟"
"بہت ہی مزے کا سوال ہے..... مگر جواب نہیں آرہا۔"
64 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"مجھے کیڑوں سے ڈر نہیں لگتا۔"
65 "خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"بہت بزدل۔"
66 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"جن کے لیے آپ بہت کچھ کریں اور وہ ریٹرن میں آپ کو اچھے الفاظ بھی نہ دیں تو دکھ ہوتا ہے۔"
67 "شادی کی رسومات میں آپ کی پسندیدہ رسم؟"
"مجھے رسموں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔"
68 "اپنی شادی دھوم دھام سے کروائیں گی؟"
"نہیں بہت سادگی سے' مجھے دھوم دھڑکا پسند نہیں۔"
69 "کھانا اور ناشتا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"امی کے ہاتھ کا۔"
70 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"مرزا اسد اللہ خان غالب۔"
71 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
"شروع سے ایک ہی نمبر ہے۔"
72 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"والٹ اور سیل فون۔"
73 "اپنے آپ کو دوسروں سے کتنا مختلف سمجھتی ہو؟"
"ہر کسی کی زندگی دوسروں سے مختلف ہی ہوتی ہے۔"
74 "لوگ آپ سے مل کر کیا کہتے ہیں؟"
"ارے آپ تو بہت سمپل ہیں اور کتنی چھوٹی ہیں۔"
75 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی ہیں؟"
"بالکل..... فوراً "سوری" کرلیتی ہوں۔"
76 "اپنی اچھی اور بری عادت بتائیے؟"
"بری عادت تو یہ ہے کہ غصہ جلدی آجاتا ہے اور اچھی عادت یہ ہے کہ دوسروں کا بہت خیال رکھتی ہوں اور انڈر اسٹینڈنگ ہوں۔"
77 "قلم ہاتھ میں ہو تو کیا لکھتی ہیں؟"
"ڈرائنگ بناتی ہوں اور شاعری بھی کرتی ہوں اور ڈائری بھی لکھتی ہوں۔"
78 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"گالیاں مجھے بہت بری لگتی ہیں۔ میں گالیاں نہیں دیتی لیکن ڈرائیونگ کے دوران لوگ مجبور کر دیتے ہیں گالیاں دینے پر۔"
79 "مارننگ شوز کے لیے آپ کی رائے؟"
"مجھے مارننگ شوز اچھے نہیں لگتے۔ ہلا گلا اچھی بات ہے مگر ہر وقت نہیں۔ کچھ معلوماتی بھی ہونا چاہیے۔"



80 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
"شکر الحمدللہ فوراً" آجاتی ہے۔"
81 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"
"جیولری روزواٹر' چارجر اور ہیئر پن وغیرہ۔"
82 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"پانی۔ دیکھنے میں بھی بہت خوب صورت لگتا ہے اور پینے کا بھی اپنا مزہ ہے اور چاند بہت اچھا لگتا ہے اور آسمان مجھے بہت پسند ہے۔"
83 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"زندگی کبھی بھی بری نہیں لگتی۔ زندگی بہت حسین ہوتی ہے۔"
84 "کون سے تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"
" دونوں عیدیں اور ویلنٹائین ڈے تو بہت ایکسائٹنگ لگتا ہے۔"
85 "زندگی کب بدلی؟"
"اس فیلڈ میں آئی تو زندگی اس لحاظ سے بدلی کہ طبیعت میں تھوڑی میچورٹی آگئی اور لوگوں کے رویے بھی چینج ہوتے ہوئے دیکھے۔"
86 "کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟"
"اگر گہری نیند سے کوئی اٹھادے تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن جب نیند آرہی ہو اور کوئی اٹھادے تب بہت شدید غصہ آتا ہے۔"
87 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"جھوٹ بولنا بہت زیادہ برا لگتا ہے لیکن ضرورت کے تحت کبھی کبھار بول لیتی ہوں۔"
88 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟"
"شام کے وقت اور صبح کے وقت بھی۔"
89 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"کہ امی میرے پاس آکر بیٹھ جائیں۔"
90 "کون سے چینلز شوق سے دیکھتی ہیں؟"
"ڈسکوری اور کوکنگ چینلز شوق سے دیکھتی ہوں۔"
91 "جب موبائل سروس آف ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟"
"بالکل نارمل..... اگر گھر پہ ہوتی ہوں تو پروا نہیں ہوتی لیکن جب گھر سے باہر ہوتی ہوں تو ٹینشن ہوتی ہے۔"
92 "فقیر کو بھیک دیتی ہیں؟"
"ہاں دیتی ضرور ہوں۔ چاہے پانچ روپے ہی کیوں نہ دوں۔"
93 "لائٹ جانے پر بے ساختہ جملہ؟"
"اب لائٹ کا جانا برا نہیں لگتا۔"
94 "چوٹ لگنے پر کس کو آواز دیتی ہیں؟"
"امی کو۔"
95 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"
"کسی کی نہیں۔ مجھے پاکستان بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بہت محب وطن ہوں۔ بس دعا کرتی ہوں کہ ہمارے ملک کے حالات جلدی اچھے ہوجائیں۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار رکھا ہوا ہے کیونکہ میرے زوال میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہی ہوگی۔"





کلموہی کی ماں

غزالہ بٹ سے ملاقات

شاہین رشید

سینئر آرٹسٹوں میں ایک نام غزالہ بٹ کا بھی ہے عرصہ دراز سے اس فیلڈ سے وابستہ ہیں اور بے شمار رول کرچکی ہیں۔ اگر انہیں ورسٹائل فنکارہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہر کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنا ان کے لیے مشکل نہیں ہے۔ آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل "کلموہی" میں دیکھ رہے ہیں، جس میں یہ ماریہ واسطی کی سوتیلی ماں کا کردار کررہی ہیں۔

"کیا حال ہیں جی۔ مصروفیات کیا ہیں؟"

"شکریہ۔ کلموہی میں آپ دیکھ ہی رہی ہیں آج کل بس یہی مصروفیات ہیں۔"

"کلموہی کے علاوہ کیا کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"کلموہی کے علاوہ "ستارہ جہاں کی بیٹیاں" کررہی ہوں۔ ابھی فی الحال تو یہی ہے، کیونکہ میں ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ کرتی ہوں، تاکہ توجہ کے ساتھ کرسکوں۔ "ستارہ جہاں کی بیٹیاں" کی تقریباً سو اقساط ہیں۔

"کلموہی بھی۔" عاطف حسین کی ڈائریکشن اور "ستارہ جہاں کی بیٹیاں" بھی انہی کی۔ بہت دل لگ گیا ہے آپ کا ان کے ساتھ؟"

قہقہہ...... "ہم آرٹسٹوں کا دل تو ہر ڈائریکٹر کے ساتھ ہی لگ جاتا ہے۔ بات انڈر اسٹینڈنگ کی ہوتی ہے۔ ہمیں تو کام کرنا ہوتا ہے مختلف لوگوں کے ساتھ،

کیونکہ ہمارے لیے تو ہر کام نیا ہوتا ہے، نئے لوگ ہوتے ہیں، نیا ماحول ہوتا ہے۔ عاطف کے ساتھ کام کرکے اچھا لگ رہا ہے۔ عاطف بہت اچھا ڈائریکٹر ہے۔ میں تو بہت متاثرہ ہوئی ہوں اس کے کام سے۔"

"کتنے سال ہوگئے اس فیلڈ میں۔"

"1975ء سے اس فیلڈ سے وابستہ ہوں۔ میں نے ریڈیو بھی کیا۔ تھیٹر بھی کیا۔ ٹی وی پہ بھی... اور کام کرتے کرتے یہ وقت آگیا ہے۔ پہلے کام کرنے کا انداز اور تھا اور اب کام کرنے کا انداز کچھ اور ہوگیا ہے۔ اگر ہم پرانے انداز کو لے کر چلیں گے تو ہم پیچھے رہ جائیں گے۔"

"یعنی وہ انداز اچھا نہیں تھا اور آج کل کا انداز اچھا ہے؟"

"نہیں، میرے خیال میں پرانا انداز زیادہ اچھا تھا۔ اس سے سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت سکھانے والے بھی تھے اور سیکھنے والے بھی تھے۔"

"تو پھر آپ کیوں کہہ رہی ہیں کہ اس انداز کو لے کر چلیں گے تو پیچھے رہ جائیں گے۔"

"پیچھے اس لیے رہ جائیں گے کہ اگر میں اپنے کسی ڈائریکٹر سے کہوں کہ پہلے مجھے اسکرپٹ بھجوادیں اور لگاتار تین، چار ریہرسل بھی کروادیں، پھر ہم ریکارڈنگ شروع کریں گے تو میرے خیال میں کوئی مجھے بک نہیں کرے گا۔ کیونکہ اب پہلے والا ٹائم نہیں ہے۔ اب نہ کوئی ریہرسل کرواتا ہے اور نہ ہی کوئی ریہرسل کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اب تو سیٹ پہ بلاتے ہیں اور اسکرپٹ ہاتھ میں دیتے ہیں اور ریکارڈنگ شروع ہوجاتی ہے لیکن چونکہ میں نے کام سیکھا ہوا ہے اور مجھے پرانے طریقے سے کام کرنے کی عادت ہے تو میں اسکرپٹ ضرور مانگتی ہوں اور اپنے کردار کے بارے میں پوچھتی ہوں اور یہ بھی پوچھتی ہوں کہ میرے ساتھ کون کون سے آرٹسٹ کام کررہے ہیں۔ اب تو کہا جاتا ہے کہ اس دن ریکارڈنگ ہے، اتنے بجے پہنچ جائیں اتنے کپڑے لے کر۔"

"آپ تو اپنے تجربے سے کام کررہی ہیں لیکن جو نئے لوگ آئے ہیں اس فیلڈ میں کیا آپ ان کے کام سے مطمئن ہیں؟"

"آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں ماشاءاللہ بہت تیز ہیں اور یہ بڑی آسانی سے سارے کام کرلیتے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں بھی دیکھ دیکھ کر بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ اس لیے یہ بڑی آسانی سے کرلیتے ہیں۔ اب پہلے جیسا ماحول نہیں۔ ہم ہر چیز کا موازنہ کرتے ہیں کہ پہلے ایسا ہوتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ آج کل کے لڑکے، لڑکیوں کو سیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس لیے وہ کسی سے سیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔ لیکن اس کے باوجود میں کہوں گی کہ آج کل کے لڑکے، لڑکیاں بہت اچھا کام کررہے ہیں۔ خواہ وہ ڈائریکٹر ہوں یا ایکٹر...

چھوٹی چھوٹی عمر کے لڑکے ڈائریکٹر بنے ہوئے ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔"

"پہلے زمانے میں لوگ محنت بہت کرتے تھے۔ اب بغیر محنت کے بھی اچھا کام نظر آرہا ہے۔ ڈراما بھی بہت اچھے بن رہے ہیں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ بہت اچھا کام ہورہا ہے اور چونکہ ہم پرانے لوگ ہیں تو اب اور تب کا موازنہ شروع کردیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ریڈیو پہ ہمارے استاد برکت اللہ، فخر عالم نعمانی اور ہمایوں بشیر صاحب ان لوگوں نے ہم پر بہت محنت کی، بہت کچھ سکھایا اور ان ہی کی بدولت مجھے پورے پاکستان کا ایکسیلینسی ایوارڈ (ریڈیو کا) ملا ہوا ہے۔ تھیٹر بہت کیا اور ٹی وی پہ بھی آج تک کررہی ہوں اور جتنا زیادہ کام کررہی ہوں، اتنا ہی زیادہ مشکل لگنے لگا ہے۔ کیونکہ جب کام کا پتا نہ ہو تو وہ کام آسانی سے ہوجاتا ہے، لیکن جس کام کی آپ کو سمجھ ہو اس کو کرنے میں پھر دشواری ہوتی ہے۔ کیونکہ جو ہم کرنا چارہے ہوتے ہیں وہ ہم کر نہیں پاتے۔"

"عاطف حسین کا دوسرا سیریل "ستارہ جہاں کی بیٹیاں" میں آپ کا کیا رول ہے۔

""ستارہ جہاں کی بیٹیاں" میں ستارہ جہاں کا رول کر رہی ہوں۔ لائٹ کامیڈی رول ہے۔ کلموہی سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں میری چار بیٹیاں دکھائی گئی ہیں اور اچھا کردار ہے میرا۔"

"کلموہی میں آپ کو اپنا کردار کیسا لگ رہا ہے؟ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی انسان ہمیشہ ایک موڈ میں نہیں رہ سکتا۔ کبھی نرم، تو کبھی گرم، کبھی پیار، تو کبھی نفرت، مگر کلموہی میں سوائے نفرت کے کچھ نظر نہیں آرہا ہے، ایسا ممکن ہے؟"

"ایسا نہیں ہوتا، ہم فنکاروں کا کام، کام کرنا ہے۔ ہم تھوڑی سی بحث ضرور کرتے ہیں کہ اس طرح نہیں، اس طرح ہونا چاہیے اور یہ چیز پہلے ہم اس سے پہلے اور اس سے بھی پہلے ہو چکی ہے۔ یا سین ریپیٹ ہو رہے ہیں۔ لیکن رائٹر کہتا ہے کہ جی ہماری لائنیں خراب نہ ہوں۔ اس لیے جو لکھا ہوا ہے وہ ہی کریں آپ۔ تو ہم کر دیتے ہیں۔"

"مبالغہ بہت ہے کلموہی میں۔"

"مبالغہ تو ہے مگر میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی، کیونکہ مجھے تو جیسا کہا جاتا ہے میں ویسا ہی کرتی ہوں۔ ویسے حقیقت تو یہی ہے کہ اتنا بھی کوئی ظلم نہیں سہتا، جتنا وہ لڑکی سہ رہی ہے۔ لوگ میرے کردار کو گالیاں دے رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ میں اچھا کر رہی ہوں۔ اداکاری میں حقیقت نظر آرہی ہے۔"

"پہلے آپ لاہور میں رہتی تھیں؟"

"نہیں، میں تو شروع سے ہی اسلام آباد میں ہوں۔ کام کے سلسلے میں کبھی کراچی، کبھی لاہور، کبھی کوئٹہ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اسلام آباد میں پہلے بہت کام ہوتا تھا۔ اب بہت کم کام ہوتا ہے۔ میرے میاں ہاشم بٹ بھی اسی فیلڈ سے ہیں تو جس شہر سے بلاوا آتا ہے وہاں جا کر کام کر لیتی ہوں اور میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں نے پانچوں اسٹیشن سے کام کیا ہے۔"

"آپ نے تمام سینٹرز سے کام کیا، کہاں کام کرنا بہت اچھا لگا؟ کہاں کا ماحول بہت اچھا لگا۔ کس شہر کے ڈائریکٹرز، پروڈیوسرز آپ کو اچھے لگے، کام کے سلسلے میں؟"

"سچ بتاؤں، کوئٹہ اور پشاور میں کام کرتے وقت میں بہت ڈر رہی تھی کہ پتا نہیں وہاں کا ماحول کیسا ہوگا۔ مجھے کام کرنا چاہیے کہ نہیں۔ لیکن جب میں گئی تو ہر شخص بڑھ بڑھ کر سلام کرتا تھا۔ میرے ہاتھ سے بیگ لے لیتا، میڈم، میڈم کر کے بلاتا۔ جتنی عزت مجھے پشاور سے ملی اتنی ہی کوئٹہ، لاہور اور کراچی سے ملی اور جب ہم آرٹسٹ سیٹ پہ اکٹھے ہوتے ہیں تو یہ امتیاز ہی ختم ہو جاتا ہے کہ ہم کس شہر سے آئے ہیں اور کس زبان سے ہمارا تعلق ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم ایک برادری کے لوگ ہیں۔ مجھے تو ہر جگہ کے ڈائریکٹرز، پروڈیوسرز اور فنکار اچھے ہی ملے۔ بس انسان کو خود اچھا ہونا چاہیے۔"

"سب لوگ اچھے ہیں۔ سب محبت سے ملتے ہیں۔ پھر کیوں ہمارے ملک کے حالات خراب ہیں۔ پھر کیوں لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہیں، قصور کس کا ہے؟"

"ہمارے ملک کے جو حالات ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے ملک کے سربراہ ہیں۔ گھر کے ماحول اور ملک کے ماحول اور نظام میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح گھر کو جوڑ کر رکھنا ماں، باپ کا کام ہے، اسی طرح ملک کو جوڑ کر رکھنا حکمرانوں کا کام ہے۔ اگر ملک کے حکمران ہمارے ماں، باپ کی طرح ہو جائیں تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ ملک میں کوئی مسئلہ ہو۔ ہمارے ملک میں بہت نعمتیں دی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ نے۔"

"آپ نے زیادہ تر منفی رول کیے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟"

"میں نے پی ٹی وی سے جو کردار کیے ہیں وہ تو زیادہ تر پوزیٹیو ہی تھے۔ پہلے کراچی اور دیگر سینٹرز کے لوکل سلوٹ ہوتے تھے۔ ان کے تحت میں نے کافی ڈرامے کیے اور زیادہ تر پوزیٹو رول ہی کیے ہیں۔ میرے لیے تو کہا جاتا ہے کہ تمہیں چادر دیں تو تم مظلوم بن جاتی ہو اور سر سے دوپٹا ہٹا دو تو چالاک بن جاتی ہو۔ مطلب آرٹسٹ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے دونوں طرح کے کردار کیے ہیں۔"

"آپ کی زندگی کا کوئی یادگار ڈرامہ، کوئی یادگار کردار، جو بھول نہ پائی ہوں آپ؟"

"میں نے طارق معراج صاحب کا سیریل "آتش" کیا تھا، جو کہ پی ٹی وی سے آن ایئر ہوا تھا۔ اس میں، میں نے طوائف کا رول کیا تھا۔ یہ سیریل بے انتہا مقبول ہوا تھا میں جس دکان پہ جاتی تھی شاپنگ کرنے وہ مجھے چیزیں گفٹ کرتے تھے کہ آپ نے اتنا اچھا رول کیا یہ ہماری طرف سے آپ کو ایوارڈ ہے۔ بہت مشکل رول تھا۔ لیکن بہت دل لگا کر اور ڈوب کر کیا مجھے اپنے آپ کو گلیمرس بنانے کا شوق نہیں ہے۔ اگر کوئی کردار میک اپ کے بغیر ہے تو میں ہرگز میک اپ نہیں کرتی۔ مجھے نیچرل ہو کر کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"کسی کردار کے لیے حسرت ہے؟"

"حسرت اور خواہش تو بہت ہے۔ بڑھاپا آگیا کام کرتے کرتے مگر کام کی پیاس ہی نہیں کم ہو رہی۔ میرے لیے ہر کام نیا ہوتا ہے۔ میں نے جب بھی کوئی کام کیا، کبھی یہ سوچ کر نہیں کیا کہ مجھے تو آتا ہے۔ میں اسی طرح گھر میں ریہرسل کرتی ہوں، اسی طرح اسکرپٹ یاد کرتی ہوں، جس طرح پہلے کرتی تھی۔ کیونکہ مجھے عادت ہے اس چیز کی کہ میں کردار کو سمجھ کر کام کروں۔"

"جوانی سے بڑھاپے تک کے سفر میں — کبھی خیال آیا کہ مجھے بڑھاپے کے کردار نہیں کرنے چاہئیں، کیونکہ آرٹسٹ اپنے آپ کو بوڑھا ہونے نہیں دیتے؟"

"میں نے تو جوانی میں بھی ماں کے رول کیے ہیں۔ نانی اور دادی والے کردار بھی کیے ہیں۔ لڑکیوں والے کردار مجھے ویسے بھی کبھی پسند نہیں آئے۔ میں ان ایزی فیل کرتی ہوں، بلکہ کرتی تھی۔ کریکٹر ایکٹر میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے کرنے کے لیے۔ ڈمی چہرے والے رول مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ میں جو کردار کروں اس میں میری آنکھیں بھی بولیں۔ میرے ہاتھ بھی بولیں۔ میرا چہرہ بھی بولے۔ جیسا کلموہی میں ہو رہا ہے۔ بھرپور ایکسپریشن والا کردار ہے میرا۔"

"چلیں جی، اب آپ فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں۔"

"میں اکیس اکتوبر کو پیدا ہوئی پنڈی میں، اسلام آباد میں شادی ہوئی، میرے تین بچے ہیں، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بیٹے کی شادی ہوگئی ہے، دو پوتے اور ایک پوتی ہے میری۔ دونوں بیٹیوں کی بھی شادی کر دی ہے، ایک بیٹی کے ماشاء اللہ دو بیٹے ہیں۔ دوسری بیٹی کی شادی کو چھ ماہ ہوئے ہیں۔ وہ مکہ میں رہتی ہے۔ ہم میاں، بیوی کراچی میں رہتے ہیں زیادہ تر لیکن میں اسلام آباد میں اپنے بیٹے کے پاس رہتی ہوں اکثر اوقات۔ اپنی چھوٹی سی پیاری سی فیملی میں بہت خوش رہتی ہوں۔"

"مزاج کی کیسی رہیں آپ۔ نرم یا گرم، غصہ ینگ ایج میں زیادہ تھا یا اب زیادہ ہے؟"

"میں ہمیشہ سے ایک جیسے مزاج کی رہی ہوں۔ ابھی بھی جب بھی اپنے ساتھیوں سے یا سینئرز لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ آپ تو ویسی ہیں جیسی ایک زمانے سے آپ کو دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ عادتاً بھی ویسی ہی ہوں۔ میں بہت مہمان نواز ہوں اور میں بہت اچھا کھانا بھی پکا لیتی ہوں اور میں نے صرف اداکاری ہی نہیں کی، بلکہ گھر کو بھی سنبھالا ہے۔ سسرال سے بھی اچھے تعلقات رہے ہیں۔ بچوں کی تربیت بھی بہت اچھے انداز میں کی ہے۔ بہن، بھائی، ماں، باپ سب کے ساتھ بہت اچھی نبھائی ہے۔ سب رشتے ساتھ لے کر چلتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف نہ ہو، کیونکہ میں لبرا ہوں اور لبرا بہت امن پسند ہوتے ہیں۔"

"آج کل فیس بک کا زمانہ ہے۔ کمپیوٹر کا زمانہ

ہے۔ آپ ان چیزوں کو استعمال کرتی ہیں، شوق ہے آپ کو؟"

"اب میں نے کچھ سیکھا ہے اپنے بچوں سے اور میری بیٹی جب سے شادی ہو کے مکہ گئی ہے۔ بھائی کو کہہ کر گئی ہے کہ مما کو سب کچھ سکھادیں، تاکہ مما مجھ سے بات کیا کریں۔ اب میں نے اسکائپ سیکھ لیا ہے۔ بچوں نے میری "آئی ڈی" بھی بنادی ہے تو بس آج کل بچوں سے یہی کچھ سیکھ رہی ہوں۔"

"مزا آرہا ہے؟"

"ہاں بہت مزا آرہا ہے۔ کیونکہ اب تو بہت اچھا ٹائم پاس ہوجاتا ہے۔ پہلے تو ہمارے زمانے میں موبائل فون بھی نہیں ہوتے تھے۔

"گھرداری ابھی بھی آپ ہی کرتی ہیں؟"

"اب تو زیادہ تر کام یا کوکنگ بہو کرتی ہے مگر میں بھی کرلیتی ہوں۔ مجھے کھانا پکانے کا بہت شوق ہے اور بقول میرے میاں کے کہ میں کھانا بہت اچھا پکاتی ہوں۔"

"آپ کے بچے اس فیلڈ میں نہیں آئے کیوں؟"

"بچوں کو شوق ہی نہیں ہوا۔ سب اپنی پڑھائیوں میں ہی لگے رہے اور میرا خود بھی دل نہیں چاہا کہ میرے بچے اس فیلڈ میں آئیں۔ چونکہ بہت محنت ہے اور رجحان بھی نہیں ہے ان میں اور اب تو ویسے بھی سب کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ سب اپنے گھروں میں خوش ہیں۔"

"پہلی محبت، پہلا ڈرامہ اور ہر پہلا کام انسان کو یاد رہتا ہے۔ آپ کو اپنا پہلا پہلا کیا کام یاد ہے؟"

"پہلی محبت تو اپنے میاں سے ہی کی اور پہلا ڈرامہ غفران امتیازی کے ساتھ کیا تھا، جو پی ٹی وی اے کے لیے تھا "پلیٹ فارم" اور پھر تو چل سو چل والی بات تھی۔ کرتے ہی چلے گئے اور آج تک کر رہے ہیں۔"

"آمد کیسے ہوئی تھی، کون لے کر آیا تھا آپ کو؟"

"ریڈیو پہ کام کرتی تھی۔ ساتھ ساتھ پڑھتی بھی تھی۔ ریڈیو سے پی ٹی وی آئی اور ٹی وی سے تھیٹر۔ اور اب تو یاد ہی نہیں کہ کیا کیا کر چکی ہوں۔"

"ایوارڈز کتنے ملے؟"

"پی ٹی وی کے تو چار، پانچ ایوارڈ ہیں۔ ریڈیو سے البتہ ایک ہی ملا ہے۔"

"آپ کو ہر جگہ ریکارڈنگ کرنے کا اتفاق ہوا چھوٹے بڑے گھر، کہیں غربت، کہیں امارت، کیا احساسات ہوتے ہیں اس وقت؟"

"بہت عجیب سا لگتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ کہیں بہت غربت ہے تو کہیں بہت امارت ہے۔ ہم ایسے گھروں میں بھی گئے ہیں جہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہوتی اور ایسے گھروں میں بھی گئے ہیں جہاں لاتعداد کمرے ہوتے ہیں۔ "کلموہی" ہم نے کارساز کے ایک گھر میں کیا ہے جو شاید پیر پگارا کے رشتے داروں کا گھر تھا۔ اس میں باون کمرے تھے۔ بڑے گھر کو دیکھ کر لالچ تو آیا ہی نہیں۔ آخرت میں حساب سے بھی تو ڈر لگتا ہے۔ البتہ غربت والے گھروں میں جاکر سوچ ضرور آتی ہے کہ یہ بھی اللہ کی دین ہے۔ یہ بھی اللہ کی ہی مخلوق ہے۔ کسی کو دے کر آزماتا ہے کسی سے لے کر آزماتا ہے۔"

"آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"میں نئے لڑکے لڑکیوں سے کہنا چاہوں گی کہ جو بھی کام کریں، بہت محنت اور لگن کے ساتھ کریں۔ اپنے کام کو ٹائم دیں اور سیریس ہو کے کام کریں اور کوئی ایک ٹارگٹ بنالیں کہ ہم نے یہ کام کرنا ہے۔ ضرور کامیابی ہوگی لیکن اگر آپ چاروں طرف ہاتھ ماریں گے تو پھر کسی کام میں بھی پراپر طریقے سے کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے غزالہ بٹ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔



میری خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

غزالہ کنول۔ گوجرنوالہ

میرا نام غزالہ کنول ہے۔ تعلق گوجرانوالہ کے تاریخی شہر سے ہے۔ تعلیمی قابلیت یہ کہ میں نے گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ سے ایم اے سیاسیات میں کیا ہے اور ایم اے اردو لٹریچر بھی ہوں۔ اور ہسٹری سے خصوصی لگاؤ ہے۔

مشاغل میں کتابیں پڑھنا اور کوکنگ کرنا شامل ہے جبکہ آج کل ایک اچھی انسان بننا میرا اہم مشغلہ ہے کہ اچھا انسان بننا بلاشبہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ جو چاہا تھا کہ بن جاؤں بن نہ سکی بقول میکاولی۔

"تقدیر ایک ایسے بپھرے ہوئے دریا کی مانند ہے جو انسان کے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔" مگر جو آج ہوں اس سے بھی الحمد اللہ بہت مطمئن ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے لیے بہتر راستے متعین کرتا ہے۔

2 ہر انسان ہی خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی کوئی ایک خامی انسان کی تمام خوبیوں پر حاوی ہوجاتی ہے۔ خوبیاں مجھ میں بھی یقیناً" بہت تھیں مگر میں شاید اپنی صلاحیتوں کو صحیح بروئے کار نہ لاسکی۔ وجہ وہی ازلی لاپرواہی۔ لاپرواہی میری سب سے بڑی خامی ہے۔ بی اے میں اسی خامی کو دیکھتے ہوئے "میڈم خالدہ گلزار" نے مجھ سے کہا تھا۔

"غزالہ اگر آپ گھر والوں کے لیے لاڈلے ہو تو ضروری نہیں کہ باہر والوں کے لیے بھی لاڈلے ہو۔"

اس وقت یہ بات میں نے ہنس کے ٹال دی مگر بعد میں زندگی کے ہر موڑ پر مجھے احساس ہوا کہ میڈم نے کس قدر درست کہا تھا۔ جذباتی انداز بھی میری بہت بڑی خامی تھی اب اس پر کافی بلکہ بہت قابو پاچکی ہوں۔ بقول شاعر۔

جن سفینوں نے کبھی توڑا تھا موجوں کا غرور
اس جگہ ڈوبے جہاں دریا میں طغیانی نہ تھی

خوبیوں کو دیکھوں تو صاف گو ہوں، مخلص ہوں اپنے ہر رشتے کے ساتھ، نہ کسی کی زندگی میں مداخلت کرتی ہوں اور کوئی میری زندگی میں مداخلت کرے۔ مجھے یہ بھی پسند نہیں۔ وعدہ کرلوں تو جان بھی جائے پورا کرتی ہوں۔ اللہ اور تقدیر پر ایمان ہے پختہ۔

میرے ایک ٹیچر سر اشفاق نے مجھے ایک بار کہا تھا۔ "زندگی کے بارے میں سنجیدہ رویہ اختیار کریں" اور اب تو زندگی اور مزاج میں زبردست ٹھہراؤ آچکا ہے۔ وقت بھی انسان کو کیا سے کیا بنادیتا ہے۔

3 جہاں تک بات ہے "خواتین" کی تو۔

میرے لب اس کے تقدس میں ملتے ہی نہیں
اسے کہو میری آنکھوں میں اظہار محبت دیکھے

آنکھ کھولی تو گھر میں خواتین اور شعاع کو پایا۔ مطالعے کا شوق ورثے میں ملا۔ میری امی اور نانی "شعاع" پڑھا کرتی تھیں۔ میری تائی اماں جو کہ میری خالہ بھی تھیں "خواتین" پڑھا کرتی تھیں پھر یہ آپس میں ڈائجسٹ بدل کر پڑھا کرتی تھیں۔ میں نے ہوش سنبھالا تقریباً" بارہ سال کی عمر میں تو میں بھی شعاع اور خواتین پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ تب ذہن لفظوں کے گہرے مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا مگر کچھ تھا جو اٹریکٹ کرتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں ہی میں نے "ماہا ملک" کا مکمل ناول "پلک پر اترے عذاب لکھوں" پڑھا۔ جس میں ہیروئن کا نام "سوہنی" تھا اس کا اینڈ آج بھی ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

پھر قسط وار ناول شاید "ہما کوکب بخاری" کا تھا۔ "بیتے پل کا سایہ" جس میں آسیہ کا کردار آج تک یاد ہے۔ اور نمرہ احمد کا "قراقرم کا تاج محل" اس کا اینڈ بھی زبردست تھا۔

"کوہ پیمائی بھی کوئی چھوڑنے والی چیز ہے"۔

یہ جب بھی پڑھوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زبردست۔ چاہے وہ عنیزہ سید کی اسرار میں ڈوبی تحریر ہو، چاہے ثمرہ بخاری کی پنجاب کی خوشبو سے مہکتی تحریر ہو، چاہے نگہت عبداللہ کے قلم کی روانی ہو، چاہے کنیز نبوی کی روایتوں اور جذبوں سے گندھی تحریر ہو، چاہے نمرہ احمد کی معلوماتی تحریر ہو یا سائرہ رضا کی اپنے قلم پر خوبصورت گرفت، ہر رنگ میں مجھے خواتین اور شعاع پسند ہے۔

4 خصوصی طور پر تو سالگرہ کبھی منائی نہیں۔ فرینڈز اگر سالگرہ وش کرتی تھیں اور تحفے بھی دیتی تھیں تو وہ وقت اچھا لگتا تھا۔ ابو بھی گھر میں کچھ نہ کچھ لے آتے ہیں۔ ہاں اک احساس زیاں ضرور ہوتا ہے۔ کہ اتنا وقت گزر گیا اور ہم نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ پھر ساتھ ہی نئے پلان بناتی ہوں کہ اس سال خود میں یہ تبدیلی لاؤں گی۔

5 شاعری انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ بہت سے شعراء کو پڑھا۔ فیض، احمد فراز، پروین شاکر، وصی شاہ، مرزا غالب کی شاعری کا ہلکا پھلکا انداز، ناصر کاظمی کی شاعری میں غم، رات اور تنہائی کا ذکر آج بھی اداس کر دیتا ہے۔

میں ہوں، رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

(ناصر کاظمی)

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں میری عمر بھر کا ریاض تھا
میرے درد کی تھی داستاں، جسے تم ہنسی میں اڑا گئے
میری عمر سے نہ سمٹ سکے، میرے دل میں اتنے سوال تھے
تیرے پاس جتنے جواب تھے، تیری اک نگاہ میں آگئے

(امجد اسلام امجد)

6 یوں تو پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی کتابوں کو پڑھا، اشفاق احمد کی "زاویہ" "منچلے کا سودا" بانو قدسیہ کی "راجہ گدھ" "سعادت حسن منٹو کے افسانے" "امرتا پریتم کے افسانے"۔ اس کے علاوہ ادب کے بے تاج بادشاہ "خواتین" اور "شعاع" میں چھپنے والے تمام ناول اور افسانے، پسندیدہ اقتباسات بہت سے ہیں۔ صوفیہ بشیر کے ناول "توبہ"۔ نمرہ احمد کے ناول "مصحف" اور "قراقرم کا تاج محل" سے اسائرہ رضا، رخسانہ نگار، ثمرہ بخاری، عنیزہ سید، نگہت عبداللہ، صائمہ اکرم اور کنیز نبوی ان سب کے بہت سے اقتباسات پسند ہیں۔ یہاں "عمیرہ احمد" کے "ایمان، امید اور محبت" سے یہ اقتباس دیکھیں۔

"محبت تاریک جنگل کی طرح ہوتی ہے ایک دفعہ اس کے اندر چلے جاؤ تو یہ باہر آنے نہیں دیتی، باہر آ بھی جاؤ تو آنکھیں جنگل کی تاریکی کی اس قدر عادی ہو جاتی ہیں کہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتیں وہ بھی نہیں جو بالکل صاف، روشن اور واضح ہوتا ہے۔"



عفت سحر طاہر



امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز، زارا اور ایزد۔ صالحہ، امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھیں مگر ان سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہیں۔ صالحہ مر چکی ہیں۔ ابیہا ان کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ، ابیہا کو امتیاز احمد کے سپرد کر جاتی ہیں۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا رازدار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد، ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب، معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

رباب، ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً" رباب کو کالج پک کرنے آتا ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں امتیاز احمد کو فون کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اٹینڈ کر لیتا ہے۔ ابیہا اپنی اس حرکت پر سخت پشیمان ہوتی ہے۔ معیز رباب میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

صالحہ ایک شوخ الھڑ سی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند ہے مگر اس کے گھر کا ماحول روایتی ہے۔ اس کی دادی اور تائی کو اس کا امتیاز احمد سے بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔ امتیاز احمد بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر وہ ان کی مصلحت پسندی اور نرم طبیعت کو بزدلی سمجھتی ہے۔ نتیجتاً" وہ امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان



ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی سے ہوتی ہے۔ مراد صدیقی اسے اپنے آئیڈیل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ صالحہ کی ضد پر شازیہ اس کی ماں سے مراد کا ذکر کرتی ہے۔ وہ غصہ میں صالحہ کو تھپڑ مار دیتی ہیں۔

امتیاز احمد اپنے فلیٹ پر ابیہا کو بلواتے ہیں، مگر ابیہا وہاں معیز احمد کو دیکھ کو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

معیز نے ابیہا کو صرف از خود طلاق کا مطالبہ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہاں بلایا ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ قطعاً" غلط نہ تھا مگر بات پوری ہونے سے قبل ہی امتیاز احمد ڈرائیور کی اطلاع پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ معیز بہت شرمندہ ہوتا ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو لے کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

ابیہا کالج میں رباب اور اس کی سہیلیوں کی باتیں سن لیتی ہے، جو محض تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کر کے، ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرتی ہیں۔ عموماً" یہ ٹارگٹ رباب کو اس کی خوب صورتی کی وجہ سے دیا جاتا تھا، جسے وہ بڑی کامیابی سے جیتا کرتی تھی۔

صالحہ کی ہٹ دھرمی سے گھبرا کر اس کے والدین امتیاز احمد سے اس کی تاریخ طے کر دیتے ہیں۔ مگر وہ امتیاز احمد کو مراد کے بارے میں بتا کر ان سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ امتیاز احمد، دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیتے ہیں مگر شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھانے لگتا ہے۔

ابیہا، معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتی ہے۔

—۵—

پانچویں قسط

معیز اس کا چہرہ دیکھ کر شاکڈ تھا۔

وہ **ابیہا** مراد تھی۔

اس کی گاڑی سے ٹکرانے کے بعد ہوش و حواس سے عاری وہ سرما کی سرد بارش میں بھیگتی سڑک پر بے یارو مددگار پڑی تھی۔ جانے اس پر کیا افتاد آن پڑی تھی کہ وہ اتنی سردی، بلکہ برستی بارش میں یوں سڑکوں پہ بھاگتی پھر رہی تھی۔

"اچھا موقع ہے اس فتنے سے نجات حاصل کرنے کا۔"

معیز کے ذہن میں سفاک سی سوچ لہرائی۔ اس نے سڑک کے دونوں طرف نگاہ دوڑائی۔ ٹریفک کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔

وہ فی الفور اٹھ کھڑا ہو۔ بارش تیزی سے اسے بھگوتی ہاتھوں اور چہرے کو سُن کر رہی تھی۔

"مرنے دو اسے یہیں۔"

وہ شاید انسان نہیں رہا تھا۔ اس کے ذہن پر شیطان کا غلبہ آیا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی کی طرف قدم بڑھائے تو اس کے ضمیر نے چیخ چیخ کر اسے یاد دلایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ملوث ہوا ہے۔ اسے دفعتاً" یاد آیا کہ سامنے گرا لمحہ بہ لمحہ سرد پڑتا وجود اسی کی گاڑی سے ٹکرایا ہے۔

اسے جھرجھری سی آئی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ پرانا **معیز احمد** بن گیا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے گاڑی کا ہیٹر آن کرنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ زمین پر کیچڑ میں لتھڑا پرس کچھ دور پڑا تھا مگر عجلت میں وہ دیکھ نہ سکا۔ کان میں ہینڈ فری لگاتے ہوئے اس نے موبائل سے عون کا نمبر ملایا۔

"ہیلو۔" اس کی مصروف سی آواز آئی۔

"کیا کر رہے ہو اس وقت؟" معیز نے سیدھے سبھاؤ پوچھا۔

"ریسٹورنٹ میں ہوں یار! موسم کی وجہ سے چائے کافی پینے والوں کا رش پڑا ہوا ہے۔ تم بھی یہیں آجاؤ۔" وہ یقیناً" مصروف تھا اور عجلت میں بھی۔

وہ سارا کام عملے پر چھوڑ کر خود محض ڈمی بن کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہونے کا قائل نہیں تھا۔ اگر کسٹمر زیادہ ہوتے تو وہ خود بھی ویٹر کے امور سرانجام دے لیتا تھا یا پھر آرڈرز وغیرہ نوٹ کرنے میں مدد کر دیتا اور ایسے موسم میں تو واقعی لوگ بھاگ کر نزدیکی ریسٹورنٹس ہی کا رخ کرتے تھے۔

"کسٹمرز کو چھوڑو یار! مجھے تمہاری ہیلپ چاہیے۔ فوراً" نکلو ریسٹورنٹ سے۔" معیز نے تیز لہجے میں کہا۔

"او یار... میرے والد صاحب کو جانتا نہیں تو۔ ریسٹورنٹ سے نکلا تو گھر سے نکال دیں گے۔"

وہ چلتے پھرتے اس کی کال اٹینڈ کر رہا تھا۔

"سیریسلی میری بات سنو عون! میری گاڑی سے ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ کوئی لڑکی ہے اور میں اسے لے کر کسی اسپتال کی طرف جا رہا ہوں۔"

معیز نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ دوسری طرف اسے یقیناً" کرنٹ لگا تھا کیوں اور کیسے کے چکر میں پڑے بغیر وہ تیزی سے بولا۔

"کون سے اسپتال جا رہے ہو۔ اپنی لوکیشن بتاؤ۔ میں فوراً" نکل رہا ہوں۔"

معیز نے اسے قریب ترین اسپتال کا نام بتا دیا۔

"ڈونٹ وری! میں جلد از جلد پہنچ رہا ہوں۔"
عون نے کہا تو رابطہ منقطع کر کے وہ لب بھینچے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔
وہ شعوری طور پر کوشش کر رہا تھا کہ پچھلی نشست پر لیٹی ایبہا مراد کے بارے میں نہ سوچے۔
اسپتال کے کھلے گیٹ سے وہ گاڑی اندر لے آیا۔

☼ ☼ ☼

نرس نے فوری ٹریٹمنٹ کے بعد آکر معیز کو اطلاع دی۔
"آپ گھر سے مریضہ کے کپڑے لے آئیں۔ فی الحال تو انہیں گاؤن پہنا دیا گیا ہے۔"
"جی..." معیز نے بڑی فرماں برداری سے کہا مگر نرس کے جانے کے بعد اس کا سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔
یہ مصیبت اس نے خود مول... بلکہ مفت لی تھی۔
اسی اثنا میں وہ عون کو کوریڈور میں داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا۔
"کیا ہوا... زیادہ بڑا مسئلہ تو نہیں؟" عون بھی پریشان تھا۔
"ابھی تو ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں۔ فی الحال تو فوری طور پر لڑکی کے لیے کپڑوں کا بندوبست کرنا ہے۔"
معیز نے تیز لہجے میں کہا تو وہ بدکا۔
"ہیں... کیا مطلب؟"
"او یار... بارش میں روڈ پہ گری تھی وہ۔ سارے کپڑے گیلے ہو گئے تھے اور ظاہر ہے گندے بھی ہوں گے۔"
معیز جزبز ہوا۔
"تو اب کپڑے کہاں سے آئیں گے؟" عون نے ہونق پن سے پوچھا۔ پھر ساتھ ہی مشورہ بھی دے ڈالا۔
"آنٹی یا پھر زارا کو فون کرو۔"
"نہیں یار!" معیز جھنجلایا پھر اسے گھورتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔
"کیا ہے؟"
"اپنا موبائل دو ذرا۔"
"اس کا کیا کرو گے؟" موبائل نکال کر معیز کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ حیرت سے استفسار کرنے لگا۔ معیز موبائل کال لاگ چیک کرنے لگا۔
"بھابھی کا نمبر..."
"کس کی بھابھی کا نمبر...؟" عون کی حیرت بے پناہ۔
"اپنی..." وہ مصروف انداز میں بولا۔
"مگر تمہاری بھابھی کا نمبر میرے موبائل میں..." عون تحیر سے پوچھنے لگا تھا کہ پھر رک گیا۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد اس نے بڑی بے یقینی سے پوچھا۔
"ثانی کا نمبر ڈھونڈ رہے ہو؟"
"ہاں... یہ رہا۔" معیز نے مطمئن انداز میں کہتے ہوئے کال کا بٹن دبایا۔
"اس سے کیا کہو گے؟ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق؟" عون کو بے چینی ہوئی مگر معیز نے جواب دیے بغیر بات شروع کر دی۔ دوسری طرف یقیناً" ثانیہ ہی تھی۔ معیز نے اسپیکر آن کر دیا۔
"السلام علیکم... ثانیہ بات کر رہی ہیں؟"

"جی... لیکن آپ کون ہیں؟ یہ نمبر تو عون کا ہے؟" ثانیہ کو یقیناً" حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔
"جی بالکل! یہ عون ہی کا نمبر ہے بلکہ یہ موبائل بھی اسی کا ہے۔ میں اس کا بیسٹ فرینڈ معیز احمد بات کر رہا ہوں۔"
معیز نے اطمینان سے اپنا تعارف کرایا۔ ادھر عون اسے کھا جانے والے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اسے یقیناً" معیز کی اس حرکت کا ماخذ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
"جی... تو میں کیا کروں؟" وہ فوراً" بے مروت ہونے لگی۔
بھلا عون عباس سے ایسے کون سے خوشگوار تعلقات تھے کہ وہ اس کے دوست سے بھی خوش اخلاقی برتتی۔
معیز نے فوراً" اس کے بدلتے لب و لہجے کو محسوس کیا۔ تب ہی بڑی مسکینی طاری کرتے ہوئے بولا۔
"اس وقت آپ ہی اس کا ساتھ دے سکتی ہیں پلیز! اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"
"واٹ..." اسے یقیناً" جھٹکا لگا تھا۔
"اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" لمحہ بھر میں ہی اس کی تمام تر بے نیازی اور اکھڑپن رخصت ہو گیا۔ بے تابی سے پوچھا تو عون کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل گئی۔
"تمہیں زیادہ تو نہیں لگی مگر..."
معیز نے مختصر لفظوں میں اسے سارا معاملہ اس طرح بتایا کہ اپنا سارا ملبہ عون پر ڈال دیا۔ عون نے اسے گھورا۔
"آپ اس وقت چونکہ قریب ترین ہیں۔ اس لیے اس مشکل وقت میں اس کی آپ ہی مدد کر سکتی ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے اپنا ایک عدد سوٹ لے آئیں پلیز۔"
"آپ مجھے اسپتال کا نام بتائیں پلیز میں آتی ہوں۔" وہ اب عجلت میں تھی۔
"جی نوٹ کر لیں... اور ہاں۔ آپ سے میری ریکویسٹ ہے کہ کسی اور کو فی الحال اس بات کا پتا نہ چلنے دیجیے گا۔" اسپتال کا نام و مقام بتا کر معیز نے اسے پابند کیا۔
"اوکے..." وہ متفق ہو گئی۔
"اوکے... اللہ حافظ..."
معیز نے موبائل کان سے ہٹایا تو عون کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
"دیکھا۔ اسے کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔" معیز آج بہت عرصے بعد پرانے موڈ میں لوٹا تھا۔ جہاں وہ ایک زندہ دل شخص تھا۔
"اور اب بھی تم کہو گے کہ مجھے اس لڑکی کو انا دکھانی چاہیے جو ناراضی کے باوجود میرے ایکسیڈنٹ کا سن کر اڑتے ہوئے آنے کو تیار ہے۔" عون نے اسے جتایا۔
"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ابھی آئے گی تو تیرے ساتھ اس کا سلوک بھی دیکھ لیں گے۔" معیز مسکرایا۔ پھر دفعتاً" سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔
"ایک اور بہت امپورٹنٹ بات یار! میں نے یہاں اسپتال میں کسی کو نہیں بتایا کہ وہ لڑکی میری گاڑی سے ٹکرائی ہے۔ بس یہی کہا کہ میری کزن ہے اور چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گئی ہے۔"
"مگر کزن کیوں بتایا؟"
"اب کسی لڑکی کو ساتھ لانے کا ریزن تو دینا ہی تھا نا۔" معیز در حقیقت اس وقت الجھا ہوا اور ذہنی پراگندگی کا شکار تھا اس لیے جو بھی ذہن میں آیا وہی کہہ گیا تھا۔ عون نے سر ہلا دیا۔

ثانیہ جلدی ہی اسپتال پہنچ گئی۔
"وہ آرہی ہے......"
عون نے زیرِ لب اسے اطلاع دی اور بینچ سے ٹیک لگا کر نڈھال سا انداز اپنا لیا۔
معیز نے دیکھا۔ سی گرین ٹراؤزر پر لانگ سویٹر اور گرم شال اوڑھے وہ بہت جاذبِ نظر لڑکی تھی۔
ان کے قریب آتے وہ یقیناً" بینچ پہ آنکھیں موندے ٹیک لگائے بیٹھے عون کو دیکھ چکی تھی۔ اس لیے معیز کے آگے بڑھ کے سلام کرنے پر اس نے سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی ایک شاپنگ بیگ بھی اس کی طرف بڑھایا۔
"تھینک یو۔ میں یہ اسٹاف کو دے کر آتا ہوں۔ آپ بیٹھیں پلیز۔"
معیز نے ممنون ہوتے ہوئے شاپر تھام کر ثانیہ سے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
وہ چند لمحے کھڑی عون کو تیز نظروں سے گھورتی رہی۔ کوئی ایک چوٹ دکھائی نہ دیتی تھی اور نہ ہی کوئی زخم۔ اس کی نظروں کی کاٹ ہی سے کسمسا کر عون نے مندی آنکھیں کھولیں اور مسکین انداز میں بولا۔
"کم از کم حال ہی پوچھ لو۔"
"حال تو اس بے چاری کا پوچھنا ہو گا جو ڈاکٹرز کے رحم و کرم پہ پڑی ہے اندر۔" ثانیہ نے طنز کیا۔ اس کا اشارہ ایبہا کی طرف تھا۔
"آئی سوئیر! اس ایکسیڈنٹ میں میری کوئی غلطی نہیں۔" وہ بے چارگی سے بولا۔
معیز جھوٹ بول کے اسے پھنسا چکا تھا ورنہ وہ صاف بتا دیتا کہ اس لڑکی کے قتل سے معیز احمد بال بال بچا تھا نہ کہ عون عباس..... مگر کچی یاری سب پہ بھاری۔
"بہرحال میرے ایکسیڈنٹ کا سن کر پریشان ہونے کا شکریہ۔"
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر جتانے والی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ثانیہ نے دایاں ابرو خفیف سا اٹھا کر جیسے اس کی خوش فہمی پر تحیر کا اظہار کیا پھر گویا اس کی تصحیح کرتے ہوئے بولی۔
"مائنڈ یو مسٹر عون عباس! مجھے اس لڑکی کی فکر تھی' جو اندر ڈاکٹرز کی کسٹڈی میں پڑی ہے۔"
اس کا انداز بھی جتانے والا تھا۔ قریب آتے معیز کے ہونٹوں پر محظوظ ہونے والی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے تسلی دینے والے انداز میں عون کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
"اچھا اب ایسا ہے کہ وہ لڑکی ہوش میں آچکی ہے۔ خطرے سے باہر ہے۔ بس ماتھے پہ چوٹ تھی جس پہ بینڈیج ہو چکی ہے۔"
وہ انہیں بتا رہا تھا۔ پھر ثانیہ سے مخاطب ہوا۔
"اور آپ کا بہت شکریہ بھابھی! اگر آپ اس وقت ہماری مدد نہ کرتیں تو بہت مشکل ہو جاتی۔"
اس کے جذبات اپنی جگہ مگر بھابھی کا لقب سن کر ثانیہ کا چہرہ لحہ بھر کو لال پڑا تھا۔ وہیں عون نے بھی بتیسی چمکائی۔ مگر اگلے ہی لمحے ثانیہ نے سنجیدگی سے تصحیح کی۔
"ثانیہ..... آپ مجھے ثانیہ کہہ سکتے ہیں۔"
عون کے دانت اندر جاتے ٹائم نہیں لگا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر معیز نے بمشکل ہنسی روکی پھر معذرت خواہانہ بولا۔
"اوہ آئم سوری۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔" وہ عون کی طرف پلٹا۔
"اچھا عون۔ میں اب چلتا ہوں۔"

"کک کہاں.....؟" وہ گڑبڑایا۔

"بھئی اب ثانیہ آچکی ہیں تم دونوں مل کے معاملہ سنبھال سکتے ہو۔ بلکہ اب تو اس لڑکی کو صرف اس کے گھر تک ڈراپ ہی کرنا ہے۔"

وہ اطمینان سے بولا تو عون بے اطمینان ہونے لگا۔ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے معیز اس کے شانے پہ بازو پھیلائے کوریڈور کی طرف چل پڑا۔

"میں ذرا اس لڑکی سے مل لوں۔" انہوں نے ثانیہ کی آواز سنی تھی۔

"شیور۔ یہ رائٹ ٹرن پہ روم نمبر فورٹی ہے۔" معیز نے چہرہ موڑتے ہوئے اسے بتایا تو وہ ادھر چل دی۔ عون تلملا کر پیچھے ہٹا۔

"یہ کیا ذلیل حرکت ہے۔ تو اپنی بلا میرے سر کیوں ڈال رہا ہے؟"

"بس۔ ہو گئی دوستی پوری؟" معیز نے طنز کیا تو وہ خفیف سا ہو کر بولا۔

"نہیں یار! مگر میں اس لڑکی سے کیا کہوں گا.....اور اگر ڈاکٹر نے....."

"کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ ڈاکٹر کو میں مطمئن کر چکا ہوں اور لڑکی جانتی ہے کہ اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے یہ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ سو اب بس اس لڑکی کو کہیں بھی ڈراپ کر دینا۔ اینڈ دیٹس آل۔ وہ نہیں جانتی کہ کس کی گاڑی سے ٹکرائی ہے۔ نہ میں کمرے میں گیا۔" معیز سنجیدہ تھا۔

"اوکے....." عون نے گہری سانس بھری۔ "حالانکہ میں جانتا ہوں' درپردہ بات کچھ اور ہی ہے جو تو مجھے بتانا نہیں چاہ رہا۔ ورنہ مجھ پہ ڈالے بغیر بھی معاملہ سلجھ سکتا۔"

معیز نے اسے ہلکا سا گھور کے دیکھا۔ اندر ہی اندر وہ اس کی چہرہ شناسی کا قائل بھی ہو گیا تھا۔

"شرم کر۔ ایک تو بھابھی کے ساتھ تیری ملاقات کی سبیل نکالی' اوپر سے تو....."

"چل ٹھیک ہے۔" عون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ معیز کے نکلتے ہی وہ دل میں خوش کن بلکہ خوش فہم خیالات لیے روم نمبر فورٹی کی طرف بڑھ گیا۔



"ایک رات کے پچاس ہزار دے گا اور سوچو اگر تین سے چار راتیں گزار لو گی تو لاکھوں میں کھیلنے لگیں گے ہم۔"

وہ اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

صالحہ کھڑے کھڑے مر گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں ٹوٹتے یقین کی کرچیاں تھیں۔ تحیر و بے یقینی تھی۔ چہرے کی رنگت سپید تو ہونٹ بے رنگ۔ کپکپاتا وجود۔

"یا اللہ....." اس کا دل تڑپ کر کرلایا۔

زمین پھٹ کیوں نہ گئی۔ آسمان سر پہ کیوں نہ آن گرا۔

خبیث سی مسکراہٹ کے ساتھ مراد نے اسے آنے والے بدقماش شخص کے حوالے کرنے کے لیے اپنی گرفت سے آزاد کیا تو وہ کٹے شہتیر کی طرح زمین پہ منہ کے بل آن گری۔

لمحہ بھر کو تو مراد اور وہ شخص بھی ہکا بکا رہ گئے۔

"صالحہ.....!" مراد تیزی سے آگے بڑھا اور نیچے بیٹھ کر صالحہ کا وجود سیدھا کیا۔ منہ کے بل گرنے کی وجہ سے اس کی ناک سے خون جاری تھا۔

"او نو....." وہ حواس میں نہ تھی۔ مراد نے جلدی سے اسے بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے چیخ کر اس آدمی سے کہا۔

"گاڑی اسٹارٹ کرو۔ اسپتال لے کے جانا پڑے گا۔" وہ دونوں باہر کی طرف دوڑے۔



صالحہ ہوش میں آگئی مگر اسے جیسے چپ لگ گئی تھی۔ ٹکر ٹکر سب کو دیکھتی۔ مراد کو دیکھ کر گویا ٹوٹ کر ہوش میں آئی کہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ گلے میں خراشیں ڈال لیں۔ اسٹاف نرس نے مراد کو کمرے سے باہر نکال دیا اور ڈاکٹر کو بلا لائی۔ مسکن انجکشن کے بعد وہ کچھ پرسکون ہوئی اور پھر نیند کی وادی میں اتر گئی۔

مراد ساری ہمدردی بھول کر باہر کھڑا اسے گندی گالیوں سے نواز رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"تم شوہر ہو مریضہ کے؟"

اکھڑ لہجے میں ڈاکٹر نے عینک کے اوپر سے جھانکتے ہوئے استفسار کیا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"جی....."

"خیال رکھا کرو اس کا۔ خون کی کمی ہے اور خوراک کی بھی۔ باپ بننے والے ہو تم۔ اسے ذہنی سکون دو مگر تمہاری تو وہ شکل نہیں دیکھنا چاہ رہی۔" دوائیوں کا لمبا سا پرچہ تیار کرتے ہوئے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی ڈاکٹر نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

مراد فرماں برداری سے سرہلاتا سنتا رہا۔ مگر گھر آکے اس نے صالحہ کو دھنک کے رکھ دیا۔ وہ دکھ سے شل ہوتے دماغ کے ساتھ پٹتی رہی۔

"سالی! بے عزتی کرتی ہے مجھے۔"

وہ اس کی ماں بہن ایک کرتا کف اڑاتا اپنی عزت کو لے کر فکر مند تھا۔ اپنی بیوی کو دوسروں کے آگے پیش کرنے والا عزت دار.....

"شادی سے پہلے بھی تو یارانوں کو چسکا تھا تجھے۔ منگیتر کے ہوتے مجھ سے یاری لگائی۔ اب میرے یار کو خوش کرنے کی باری آئی تو تو پاک باز بن رہی ہے۔"

قیامت آگئی تھی۔ خوفناک گڑگڑاہٹ صالحہ کی سماعتیں پھاڑ رہی تھی۔ پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑ رہے تھے۔ مگر نہیں..... صالحہ کو یک لخت حقیقت کا خوفناک ادراک ہوا۔ یہ جیتے جی بھوگنے والا عذاب تھا۔ جو مرتے دم تک اسے سہنا تھا۔

وہ اپنے عشق سے مرتد ہوئی تھی..... سو واجب القتل تھی۔

ایک جگہ سر جھکانے والوں کو جگہ جگہ سجدے نہیں کرنا پڑتے۔ صالحہ بے وقوف تھی۔ جانتی نہیں تھی کہ یار منانا آسان ہوتا ہے مگر اس نے بتوں کو یار بنایا تھا..... اور بت تو نری مٹی ہوا کرتے ہیں۔ مراد صدیقی بھی مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا۔

یہ وہ دور تھا جب اسے ٹوٹ کر امتیاز احمد یاد آتا تھا۔ اس کی پریگننسی کا سن کر شاید مراد کو اس پر ترس آگیا' اس لیے اس کی جان چھوڑ دی۔

وہ جوئے اور شراب میں غرق تھا۔ مال اسباب تو پہلے ہی لٹا چکا تھا۔ اب شان دار سا گھر بھی بیچ ڈالا اور صالحہ اور دو ماہ کی ننھی ایمہا کو لیے کرائے کے دو کمرے کے گھر میں آپڑا۔

"مر جاؤں گی مگر عزت بیچنے کا کام نہیں کروں گی۔ یہ تمہارے خاندان کا رواج ہو گا۔" وہ نفرت سے تھوک کر

بولی۔

بے شک اسے اپنی تعریفوں سے بھرے رنگ برنگے الفاظ اچھے لگتے تھے۔ امتیاز احمد کی شرافت سے چڑ اور مراد صدیقی کی بے باکی پسند تھی مگر وہ اس حد تک بد کردار نہ تھی اور نہ ہی بے راہ روی پہ اتر کر اس نے شادی سے پہلے مراد صدیقی کے ساتھ غلط تعلقات استوار کیے تھے، جو وہ اتنے آرام سے اس کی بات مان لیتی۔ مگر وہ باورچی خانے میں گیا اور تیز دھار چھری لاکر سوئی ہوئی چھ ماہ کی ایبہا کی گردن پر رکھ دی۔

"تیری تو ماں بھی کرے گی یہ کام....." صالحہ کی آنکھیں ابل پڑیں۔ جیسے کسی نے ہاتھ ڈال کے کلیجہ باہر نکال لیا ہو۔

"مراد..... کیا کررہے ہو۔ بچی کو چھری لگ جائے گی۔" وہ گھگھیا کر بولی۔

"ذبح کرڈالوں گا قسم سے! اگر تو آج رات ڈیرے پہ نہ گئی تو۔"

وہ بے رحمی سے بولا اور جیسی وحشیانہ کیفیت میں وہ تھا، صالحہ کو یقین تھا کہ وہ ایبہا کو ذبح کرہی ڈالے گا۔

اس نے بلکتے ہوئے اپنی بچی کو بچالیا اور خود ذبح ہوگئی لیکن دوسرا دن اس کے لیے سکون کا پیغام لایا۔

جوئے کے اڈے پر لڑائی کے دوران ایک دو بندے مرگئے۔ مراد صدیقی کو بھی پولیس پکڑ کے لے گئی۔ جانے کیا کیس بنا مگر وہ گیارہ سالوں کے لیے جیل ضرور چلا گیا۔

صالحہ جیسے پھر سے جی اٹھی۔

اس روز وہ یوں نہائی جیسے آج ہی پیدا ہوئی ہو۔ کلمے پڑھ پڑھ کے رگڑ رگڑ کے جسم صاف کیا اور سجدے میں گری تو دھاڑیں مار مار کے روئی۔

پنجگانہ نماز شروع کی تو رفتہ رفتہ دل کو ملنے والے سکون نے خدا کی بارگاہ میں معافی ملنے کی آس کو مضبوط کر دیا۔

ایبہا اسکول تو پہلے ہی جارہی تھی۔ گھر کا خرچا پانی چلانے کے لیے صالحہ نے ایک فیکٹری میں ملازمت کرلی۔ جس سے اچھی گزر بسر ہونے لگی۔

وہاں فیکٹری میں اس کی کئی عورتوں سے اچھی دعا سلام ہوگئی۔ اس کی سب سے اچھی سہیلی زرینہ بنی مگر کچھ عرصے کے بعد ہی اسے اچھی نوکری مل گئی تو وہ وہاں سے چلی گئی۔

"وہاں کا ماحول دیکھ کے تمہیں بھی بلالوں گی۔ نئی فیکٹری ہے۔ انہیں کافی ورکروں کی ضرورت ہے۔"

زرینہ نے اپنا کہا دو ماہ کے اندر ہی سچ کر دکھایا اور صالحہ کو لے کر اپنی نئی فیکٹری پہنچ گئی۔

"ابھی مینیجر صاحب آئیں گے تو تمہاری ملاقات کراؤں گی۔ وہی نوکری پکی کریں گے۔ میں نے ان سے بات کرلی ہے۔ انہیں محنتی اور ایمان دار بندے چاہییں بس۔ تنخواہ بھی پہلی نوکری سے دوگنی ہے۔"

زرینہ خوش تھی۔ مگر اس روز مینیجر آیا ہی نہیں۔

"چلو صاحب سے بات کرلیتے ہیں۔ وہ بھی بڑے ہی خدا ترس آدمی ہیں۔" زرینہ پُر اعتماد تھی۔ صالحہ کو اس نوکری کی سخت ضرورت تھی۔

صاحب کے پی اے نے بتایا کہ صاحب کے پاس کوئی ملنے والا آیا بیٹھا ہے۔ وہ دونوں وہیں بیٹھ کے انتظار کرنے لگیں مگر جب گلاس وال کا پردہ ہوا سے لہرا کر پرے ہٹا تو صالحہ کی اٹھی نظروں پر قیامت بیت گئی۔

وہاں اندر شیشے کی دیوار کے پار کوئی اور نہیں..... امتیاز احمد بیٹھا تھا۔

اس کا "امیت جی۔"

"کیا نام ہے صاحب کا؟"

اس نے وحشت زدہ انداز میں زرینہ کا ہاتھ دبوچا۔

"امتیاز صاحب ہیں۔ بڑے نیک اور باکردار۔ خدا ترس انسان ہیں۔"

وہ رطب اللسان تھی۔

مگر صالحہ تو وہاں سے ایسے بھاگی جیسے بھوت پیچھے لگ گئے ہوں۔ زرینہ انگشت بدنداں اس کے پاگل پن کو دیکھتی رہ گئی۔

کئی آوازیں بھی دیں مگر وہ تو مانو پنجرے سے نکلا پنچھی بن گئی تھی۔

شام کو زرینہ اس کے گھر آئی تو سخت ناراض تھی مگر صالحہ کو بخار میں سلگتے اور ایبہا کو روتے پاکر اس کی ساری ناراضی اڑن چھو ہوگئی۔

"ہاہ۔ میں بھی کہوں وہاں سے بھاگی کیوں۔ اتنی طبیعت خراب تھی تو پہلے کہتی، کسی اور دن چلی چلتی۔"

صالحہ کو کسی پل چین نہ تھا۔ سر کو پٹختی۔ روتی کرلاتی..... اس کے بین نہ سمجھ میں آنے والے تھے۔

زرینہ نے اسے ڈاکٹر سے دوا لاکے دی۔ گھر سے سالن روٹی لاکے ایبہا کو کھلایا اور صالحہ کو زبردستی دلیے کے دو چار چمچے کھلا کے دوا دے دی۔

ایبہا ماں سے لپٹ کے لیٹ گئی تھی۔

"میں کل چکر لگاؤں گی فیکٹری جانے سے پہلے۔" زرینہ اسے اچھی طرح دروازہ بند کرنے کا کہہ کر جاچکی تھی۔

صبح فیکٹری جانے سے آدھا گھنٹہ پہلے وہ ان کے ہاں آئی تو صالحہ کی طبیعت بہتر تھی۔ اگرچہ وہ گم صم سی تھی اور بُھس سی بیٹھی تھی۔

زرینہ نے ہی ناشتا بنا کے دونوں ماں بیٹی کو دیا۔

"طبیعت ٹھیک ہے تو چلے گی فیکٹری.....؟" زرینہ نے پوچھا۔

صالحہ کا دل بلک اٹھا۔ وہ تو اڑ کے جانا چاہتی تھی امتیاز احمد کے پاس۔

وہ جو عزت اور غیرت والا تھا۔

وہ جو باکردار اور روشن پیشانی والا تھا۔

مگر یہ داغ داغ اور بدبودار وجود لے کر وہ اس کے پاس جاسکتی تھی بھلا؟

وہ تعفن کے مارے منہ نہ پھیر لیتا اس سے؟

"مجھے اپنی فیکٹری کا کارڈ دے دو۔ جب میری مرضی ہوگی تو چکر لگالوں گی۔" صالحہ نے بمشکل کہا۔

"ابھی تو میرے پاس نہیں ہے۔ آج مینیجر سے لے لوں گی۔" زرینہ جلدی میں تھی۔ اس کی فیکٹری کا ٹائم ہوگیا تھا اور جب اگلے روز زرینہ نے اسے امتیاز احمد کے نام کا وزیٹنگ کارڈ لاکے دیا تو وہ مٹھی میں جیسے کوئی ہیرا دبوچ بیٹھی۔

زرینہ کے جانے کے بعد اس نے ان چمکتے حروف کو چوم لیا۔ آنکھوں سے لگایا اور بے طرح روئی۔

"میں نے تمہیں نہیں کھویا امتیاز احمد! حق کی راہ ہی کھودی تھی۔" اور پھر اس نے وہ وزیٹنگ کارڈ اپنے صندوق میں کپڑوں کی تہوں کے نیچے بچھے اخبار کے نیچے رکھ دیا۔

وہ اپنی زندگی میں کھلنے والے تازہ ہوا کے اس روزن کو بند نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

عون کمرے میں دستک دے کر داخل ہوا تو ثانیہ اس لڑکی سے باتیں کررہی تھی۔

عون کو دیکھ کر وہ لڑکی جھجک کر خاموش ہو گئی۔

"یہ......" ثانیہ نے تعارف کرانے کو جیسے موزوں الفاظ ڈھونڈے۔ عون کے کان کھڑے ہو گئے مگر لمحہ بھر سوچنے کے بعد وہ اطمینان سے بولی۔

"یہ وہ موصوف ہیں جن کی گاڑی نے تمہیں ٹکر ماری ہے۔" عون تلملا اٹھا۔

"مائنڈ یو۔ میں نے نہیں ماری۔ یہ خود میری گاڑی کے آگے آئی تھیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔" ثانیہ نے کندھے اچکائے۔

"نن، نہیں......" ایبہا کی زبان لڑکھڑائی۔ "غلطی میری ہی ہے۔ ایک تو موسم خراب تھا۔ مجھے ہاسٹل سے نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ موٹر سائیکل پہ کوئی بدتمیز سے لڑکے تھے...... میں بھاگی تو بے دھیانی میں روڈ پہ آنکلی۔"

"اب اگر تم بہتر محسوس کر رہی ہو تو ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔"

ثانیہ نے دوستانہ انداز میں کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حالانکہ ابھی بھی اس کا دماغ سن کیفیت میں تھا۔ سر کی چوٹ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"تم کیسے آئی ہو......؟"

عون نے ثانیہ سے پوچھا تو وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "ٹیکسی سے آئی تھی۔"

"اوکے تو پھر انہیں ساتھ لے کے باہر چلو اور گاڑی میں بیٹھو۔"

تمام چارجز معیز ادا کر گیا تھا۔ ثانیہ یوں تو کبھی عون کو اتنی لفٹ نہ کرواتی مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ ایبہا کو اس کے گھر پہنچانا تھا۔ اکیلے عون کے ساتھ شاید وہ نہ جاتی۔

وہ خاموشی سے ایبہا کے ساتھ گاڑی تک چلی آئی۔

"تم نے ماموں کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ کیا ہے؟" وہ اسے گھور کر پوچھ رہی تھی۔

"کہاں۔ ابھی لے کے آیا ہوں ریسٹورنٹ سے" وہ بے اختیار بولا پھر جلدی سے تصحیح کی۔ "بس آتے آتے ہی ان سے ٹکر ہو گئی۔"

"اگر اپنی آنکھوں سے صحیح کام لو تو تم سے اتنی غلطیاں نہ ہوں۔"

ثانیہ نے طنزاً "کیا کیا نہ جتا دیا تھا۔ عون نے بیک ویو مرر اس پر سیٹ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اب تو صحیح سے کام لیتا ہوں مگر لوگ پہلے کی خطائیں بھولنے کو تیار ہی نہیں۔"

"ہنہ......" وہ سر جھٹک کر ایبہا سے ایڈریس پوچھنے لگی۔

"گرلز ہاسٹل میں رہتی ہوں میں۔"

اس نے ایڈریس بتا کر سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ دماغ اس قدر شل ہو رہا تھا کہ کسی ایک سوچ پر مرتکز ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ سو آنکھیں بند کیے دماغ کو سکون دینے کی سعی کرنے لگی۔

ایبہا کو ہاسٹل ڈراپ کرنے کے بعد عون ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ثانیہ کا انتظار کر رہا تھا، جو ایبہا کو اندر چھوڑنے گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ کا ڈیرا تھا۔

معیز کی مہربانی سے آج وہ وقت آیا تھا، جس کے بارے میں وہ صرف خوابوں اور خیالوں ہی میں سوچا کرتا تھا۔

ثانیہ ہاسٹل کے گیٹ سے باہر آئی تو وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

مگر وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے سڑک پر نظریں دوڑانے لگی۔ عون نے کھڑکی سے منہ باہر نکالا۔

"آؤ نا۔ کیا دیکھ رہی ہو؟"

"ٹیکسی......" نہایت اطمینان سے کہا گیا۔

عون کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"ٹیکسی کیوں...... گاڑی میں بیٹھو۔"

"میں ٹیکسی ہی میں آئی تھی۔ تمہارے ساتھ آنا تو مجبوری تھی۔"

اس کا انداز صفاچٹ تھا۔ وہ منتیں کروانے کے موڈ میں تھی اور عون جی جان سے منتیں کرنے کے موڈ میں۔

"کم آن ثانی...... یار! اب غصہ جانے بھی دو۔"

"کیسا غصہ......؟ مجھے تو کوئی غصہ نہیں ہے۔" وہ نارمل انداز میں بولی۔

"تو پھر ناراض کیوں ہو مجھ سے؟" عون نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ ہر انسان کو اپنی مرضی سے زندگی جینے کا حق حاصل ہے۔ تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو میں اپنے۔"

اس نے شانے اچکائے۔ عون نے نظر بھر کے اسے دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ مگر اس کا پُراعتماد انداز اور ذات کا تفاخر اسے بہت جاذبِ نظر بناتا تھا۔

وہ بولتی تو عون کی نگاہ اس کے لبوں سے ہٹتی نہ تھی۔ اب بھی یہی ہوا۔ وہ بے خود سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے جمود سے وہ جز بز ہوئی۔

"مجھے گھورنا بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔"

عون نے ونڈ اسکرین کے پار نظر جمائی اور ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا۔

ایک سیکنڈ، دو، تین، چار، پانچ۔

وہ تیزی سے کھڑکی پہ جھکی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے"

"جب تک تم گاڑی میں نہیں بیٹھوگی میں یہ بدتمیزی کرتا رہوں گا۔"

وہ اطمینان سے بولا مگر ہارن پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ وہ اس کی اس حرکت پر پاؤں پٹختی آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"میں صرف ماموں جان کی گاڑی کے خیال سے بیٹھ رہی ہوں۔" عون کی مسکراہٹ پر اس نے چڑ کر جتانے والے انداز میں کہا تو اس نے برجستہ جواب دیا۔

"کبھی ماموں کے خیال سے ان کے بیٹے پر بھی نظرِ کرم کر دیا کرو۔" اس کے چہرے کی رنگت بدلی۔

"گاڑی چلاؤ، ورنہ اب کی بار اتری تو کبھی نہیں بیٹھوں گی۔" ڈپٹ کر کہا اور ساتھ ہی دھمکی میں دے دی۔ عون نے شرافت سے گاڑی چلا دی۔

موسم بے حد سرد مگر خوب صورت تھا اور عون کے دل کا موسم تو باہر کے موسم سے بھی زیادہ حسین ہو رہا تھا۔

"آئم سوری ثانیہ! میں جانتا ہوں میں نے جو کچھ کیا اس سے تمہارا دل دکھا ہوگا۔ مگر اب میں ہی اپنے کہے کا مداوا کرنا چاہتا ہوں تو تم چانس ہی نہیں دے رہیں۔" عون نے مسکینی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"تم بار بار مجھ سے معذرت مت کرو عون!" وہ بے حد سنجیدہ تھی "مجھے تم سے معذرتیں کروانے کا شوق نہیں ہے۔ مگر معاف کرنا! مجھے اب تمہارے لفظوں پر اعتبار نہیں رہا۔"

"کیا مطلب...... میں سچ میں شرمندہ ہوں۔" عون نے اپنے لفظوں پر زور دیا۔

"تم نے کہلوایا تھا کہ تم مجھ جیسی پینڈو اور فرش کی لپائی کرنے والی گنوار لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔" ثانیہ نے اسے یاد دلایا۔

"وہ بھی تمہارے الفاظ تھے اور یہ معذرت بھی۔ اب میں کسے سچ مانوں؟"

وہ قطعیت سے پوچھ رہی تھی۔ عون لاجواب ہونے لگا۔
"جھوٹ نہیں بولوں گا ثانی! میرا خواب تھا کہ میری بیوی پڑھی لکھی اور ذہین ہو۔ تمہارا فرسٹ امپریشن ایسا پڑا کہ میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ مگر جب مجھے پتا چلا کہ تمہاری اصلیت کچھ اور ہے تو....."
عون نے بھی سنجیدہ انداز اپنایا مگر ثانیہ نے بیچ ہی میں اس کی بات کاٹ دی۔
"مگر میں کیسے تم پر اعتبار کروں؟ ظاہر پہ مرمٹنے والے مرد کبھی بھی میرا آئیڈیل نہیں رہے۔" اس کا انداز کڑوا تھا۔
"تم بھی تو مجھے ظاہری طور پر ہی دیکھ رہی ہو۔" وہ ناراض ہوا۔
"بہر حال۔ ابھی میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتی۔" وہ آرام سے بولی۔
بڑی پھپھو کا گھر آگیا تھا۔ آج کل ثانیہ وہیں رہ رہی تھی۔
"مگر تم لندن نہیں جاؤ گی۔"
وہ اترنے لگی تھی، جب عون نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔ وہ گاڑی سے اُتر کر شیشے میں جھکی۔
"کیوں.....؟"
"اکیلی کیا کرو گی جاکر۔ تھوڑا ویٹ کرلو تو ہنی مون پہ لے جاؤں گا۔"
عون کی زبان پھسلی تو ثانیہ کے چہرے پر غصے اور حیا کے دلکش رنگ نظر آئے۔
"بد تمیز..." وہ دانت کچکچاتی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ عون سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔
"ثانیہ بی بی... تمہیں بھی اپنے عشق میں مبتلا نہ کیا تو عون عباس نام نہیں۔"
خود کلامی کرتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو اس کا ذہن کہیں اور ہی اڑانیں بھر رہا تھا۔



"یا اللہ..."
حنا اس کے ماتھے کی بینڈیج دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔ پکڑ کر اسے بستر پر لٹایا۔
"کیا... کیوں... کیسے؟"
ایمہا نے اس کے تمام سوالوں کا تفصیلی جواب دیا تھا۔
"مگر تمہیں مصیبت کیا پڑی تھی اکیلے نکلنے کی، وہ بھی اتنے خراب موسم میں۔" حنا نے چائے کا پانی رکھتے ہوئے اسے گھورا۔
"بینک جانا تھا۔ پرسوں فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ بس وہاں سے نکلی تو موٹر سائیکل پہ دو لڑکے پیچھے پڑ گئے۔"
وہ کہتے کہتے چپ سی ہو گئی۔ پھر ایک دم سے اٹھ بیٹھی اور متوحش انداز میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی۔
"پرس... میرا پرس کہاں ہے؟"
"کون سا پرس... ابھی تو تم خالی ہاتھ آئی ہو۔" حنا اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔
ایمہا اب اٹھ کر بستر کی چادر جھاڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔ حنا نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اسے بستر پر بٹھایا تو وہ سر ہاتھوں میں تھام کے رو دی۔
"پتا نہیں میرا پرس کہاں گم ہو گیا... ہاسٹل کے ڈیوز اور فیس... میں نے سارے پیسے نکلوا لیے تھے۔" حنا نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"بیگ لے کے جاتیں۔ اس میں پرس رکھتیں۔"

"تمہیں پتا تو ہے، یہاں سے بینک کتنا نزدیک ہے۔ مجھے تو ہم بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔ جب میں گاڑی سے ٹکرائی تو پرس میرے پاس ہی تھا۔ اس کے بعد.... میں ہوش میں آئی تو اسپتال میں تھی۔"

اس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ لاسٹ سمسٹر کی فیس اور ہاسٹل کے ڈیوز ادا کرنے بہت ضروری تھے اور آج تو وہ بینک سے اس ماہ کی ساری رقم نکلوا لائی تھی۔

"رو مت بیا! کچھ سوچتے ہیں۔" حنا نے اسے تسلی دی، پھر بولی۔

"کوئی دھوکے باز ہی ہوں گے جن کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا۔ انہوں نے ہی تمہارا پرس اڑایا ہوگا۔"

"ایسے لگ تو نہیں رہے تھے وہ۔" وہ بے بسی سے بولی پھر سہمے ہوئے انداز میں پوچھنے لگی۔

"حنا! اب کیا ہوگا۔ سارے پیسے چلے گئے۔"

"تو گھر سے اور منگوالو۔ بلکہ اپنے پاپا کو اپنے ایکسیڈنٹ کے متعلق انفارم کروگی تو وہ فوراً" ہی پیسے بھجوادیں گے۔"

حنا نے چٹکی بجائی اور جا کے چائے بنانے لگی۔

ابیہا پر تو جیسے چھوٹی موٹی سے قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ اس دن والے واقعہ کے بعد وہ تہیہ کر چکی تھی کہ اب خود سے کبھی امتیاز احمد سے رابطہ نہ کرے گی مگر قسمت اسے پھر اسی موڑ پہ لے آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ صالحہ ہی جانتی تھی، کیسے اس نے اپنے روتے کرلاتے دل کو سنبھالا تھا۔

اس کا جی چاہتا امتیاز احمد کے سامنے بھکارن بن کے کھڑی ہو جائے اور اس کا ردعمل دیکھے۔

اسی سوچ کے تحت وہ کئی بار اس کی فیکٹری گئی۔ شہر کے آخری کونے تک جانے میں اس کے سینکڑوں روپے خرچ ہوتے، کبھی وہ آدھا راستہ پیدل طے کرتی اور آدھا رکشے پر، مگر امتیاز احمد پر نگاہ پڑتے ہی وہ چادر سے منہ ڈھانپ لیتی۔

وہ ویسا ہی پر تمکنت اور وجیہہ تھا۔ چہرے پر عجیب سا حزن اور گہری سنجیدگی کی چھاپ۔

زرینہ نے کہا تھا۔ صاحب بہت باکردار ہیں۔

صالحہ جانتی تھی وہ واقعی باکردار ہے۔

اور یہ اس کے کردار کی حیا ہی تھی، جو صالحہ کو اس کے سامنے آنے سے روکتی تھی۔

کیا بتاؤں گی اسے۔ یہ بدن کی عمارت کیسے کھنڈر بن گئی؟ مر نہ جاؤں گی، مراد صدیقی کی بدکرداری کی داستان سناتے ہوئے۔

وہ کیا سوچے گا.... اسے کتنا دکھ ہوگا یہ جان کر کہ ترازو کے دوسرے پلڑے میں اس کے مقابل جو شخص کبھی صالحہ کو وزنی لگا تھا۔ وہ کردار کا کتنا ہلکا نکلا۔

وہ پوچھے گا.... "صالحہ.... تم مجھے اس مرد کے مقابلے میں دھتکار کر چلی گئی تھیں؟" تو کیا جواب ہوگا میرے پاس؟

وہ کوڑھ زدہ فقیرنی کی طرح فٹ پاتھ پہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ہانپتی رہتی۔ مگر امتیاز احمد کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ وہ دن رات میں ایک بار لازمی امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ نکال کے دیکھتی۔

اس پر چھپا امتیاز احمد کا نام اور فون نمبر زا سے حفظ ہو چکے تھے مگر وہ پھر بھی روزانہ وہ کارڈ نکال کے دیکھتی پڑھتی، چومتی اور آنکھوں سے لگاتی۔

یہ وہ نعمت تھی جو اس نے خود ٹھکرا دی تھی اور نعمتوں کو ٹھکرانے والے خود بہت ٹھکرائے جاتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر جانے کون کون سے روگ لگا بیٹھی۔ دل کے آس پاس اٹھنے والا ہلکا ہلکا درد کبھی کبھی اسے خوف زدہ کر دیتا تھا مگر اس کے پاس ٹیسٹ کرانے کے لیے رقم نہ تھی۔ سو زندگی کی گاڑی بس چلتی رہی۔

ہاں.... مگر اس میں امتیاز احمد نامی ایک درز پیدا ہو گئی تھی۔ جہاں سے آنے والی ہوا بہت سبک اور ترو تازہ تھی۔

☼ ☼ ☼

ابیہا کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

وارڈن نے ہاسٹل کی فیس جمع کروانے کے لیے تو اسے ایک ہفتے کی مہلت دے دی تھی مگر کالج کی فیس جمع کرانا تو لازمی تھا۔ ورنہ اسے ایگزیمز میں بیٹھنے کی اجازت نہ ملتی۔

"آئم سوری بیا! تمہیں تو پتا ہے، میں اپنی پاکٹ منی کیسے اڑاتی ہوں اور ممی، پاپا یہاں ہیں نہیں۔ بھائی سے بھی کوئی رابطہ نہیں۔ ورنہ میں ہی کچھ کر دیتی۔" حنا شرمندہ تھی۔ اگر وہ حواس میں ہوتی تو اس کے لنگڑے لولے جھوٹ پکڑ لیتی مگر اس وقت تو اسے صرف کالج فیس کی فکر تھی۔

"صرف دو دن ہیں حنا.... مجھے ہر حال میں ایگزیمز میں بیٹھنا ہے۔"

وہ بھنچے لہجے میں بولی۔

"تم چاہو تو میں اپنے انکل سے مدد مانگ سکتی ہوں۔ میرے چچا.... تم گئی تو تھیں ان کے ہاں میرے ساتھ۔" حنا نے آفر کی۔

"اگر تم خود ان سے بات کرو تو وہ فوراً" ہی تمہاری مدد کر دیں گے۔"

ابیہا کو عجیب سے ماحول والا وہ گھر اور حنا کے چچا یاد آئے تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں.... میں گھر فون کر کے دیکھتی ہوں۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔

حنا کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر پہنچا تو سفینہ کو روتے ہوئے پایا۔ ابزا سی کو کال کر رہا تھا۔

"ابو کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

امتیاز احمد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے فوری طور پر انہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور شہر کے بہترین اسپتال میں لے آئے۔

امتیاز احمد کو آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا۔ سفینہ اور زارا کو وہ ساتھ نہیں لائے تھے مگر سفینہ موبائل فون پر مسلسل ابزد سے رابطے میں تھیں۔

"آپ گھر پہ ہی رہیں اور دعا کریں۔ یہاں آئیں گی تو ہم بھی ڈسٹرب ہوں گے۔" معیز نے انہیں سختی سے روکا تھا۔

فوری ٹریٹمنٹ سے امتیاز احمد کی حالت کچھ سنبھلی مگر ابھی بھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہ تھی۔

دونوں بھائی جیسے ادھ موئے ہو گئے تھے۔

باپ کی اہمیت تو اپنی جگہ مسلم تھی مگر آج جب امتیاز احمد ہاتھوں سے جاتے محسوس ہوئے تو پتا چلا کہ وہ تو دل تھے۔ دل کی دھڑکن تھے۔ ان کی سانس تھے۔ وہ تو ان کی پوری زندگی تھے۔ اور زندگی دور جانے لگے تو کیسا محسوس ہوتا ہے.... وہ دونوں بھی اسی کیفیت میں تھے۔

پچھلے چھ گھنٹوں سے ایک پاؤں پہ کھڑے باپ کی ایک نظر کے متلاشی۔۔۔ خدا جانے کیا ہونے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

امتیاز احمد کا نمبر ڈائل کر کر کے ایبہا کی انگلی تھک گئی۔ مگر شاید وہ آفس سے نکل چکے تھے۔
اس نے اپنے موبائل سے ان کا موبائل نمبر ملایا۔ اس سے پہلے بھی وہ ان کا موبائل نمبر ٹرائی کرتی رہی تھی۔ مگر مسلسل بیل جانے کے باوجود انہوں نے کال اٹینڈ نہ کی تھی۔
ایبہا کا دل جیسے بند ہونے کو تھا۔
اس سال امتحان میں نہ بیٹھنا۔ مطلب ایک سال اور۔۔۔ جبکہ اسے جلد سے جلد تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا تھا۔
اس کے آنسو بہہ نکلے۔
اسی وقت کسی نے کال اٹینڈ کرلی۔
"ہیلو۔۔۔" کسی عورت کی آواز پر گھبرا کر ایبہا نے لائن کاٹ دی۔ شاید سفینہ یا زارا میں سے کسی نے کال ریسیو کی تھی۔
"یا اللہ۔۔۔ رحم کردے۔" وہ بے بس تھی۔
خدا کو پکار سکتی تھی۔ سو پکارے گئی۔

☼ ☼ ☼

اٹھارہ گھنٹوں کے بعد امتیاز احمد کو کمرے میں شفٹ کردیا گیا۔ اس دوران ان کی ہارٹ سرجری بھی کی گئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اب ان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ سفینہ اور زارا اسپتال آچکی تھیں۔ رو رو کر ان کا برا حال تھا۔
"اب وہ بہتر ہیں ماما پلیز۔۔۔ ایسی حالت لے کر ان کے سامنے مت جایئے گا۔ زارا تم بھی خود کو سنبھالو۔" معیز نے انہیں تنبیہہ کی تھی۔
معیز کچھ ضروری چیزیں لینے گھر آیا تو ساتھ ہی شاور لے کر کپڑے بھی تبدیل کرلیے۔ واپس جا کر وہ ایزد کو گھر بھیجنے والا تھا۔
وہ وارڈروب سے امتیاز احمد کے کپڑے نکال رہا تھا۔ جب سائیڈ ٹیبل پہ پڑا ان کا موبائل بجنے لگا۔
معیز نے چونک کر دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر موبائل اٹھالیا۔
ایبہا کی کال تھی۔
اس نے لب بھینچے۔۔۔ اور کال ریسیو کرلی۔
"ہیلو۔۔۔"
"ہیلو۔۔۔ میں ایبہا۔۔۔ میں کب سے آپ کو فون ملا رہی ہوں۔ مگر آپ کال اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کل میں بینک سے سارے پیسے لے آئی تھی۔ ہاسٹل کے ڈیوز بھی اور کالج فیس بھی۔ راستے میں میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ میرا پرس وہیں گر گیا۔ سارے پیسے گم ہوگئے۔ اب میں کیا کروں۔"
بے ربط انداز میں وہ تیز تیز سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ شاید لائن کٹ جانے کا ڈر ہو۔
پھر وہ رونے لگی۔
معیز کے وجود میں جیسے کوئی شرارہ سا لپکا۔

"کاش کہ کبھی تم بھی ہماری زندگی میں سے ایسے ہی گم ہوجاؤ۔"
وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا، تو ایبہا سن ہوگئی۔ معیز نے موبائل سوئچ آف کر کے وہیں ڈال دیا اور چیزیں سمیٹ کر نوکروں کو ہدایات جاری کرتا گھر سے نکل آیا۔
اس کا ذہن منتشر تھا۔ ابھی تک گھر والوں کے علاوہ کسی کو بھی امتیاز احمد کی خرابی طبع کی اطلاع نہ دی گئی تھی۔ کچھ خیال آنے پر معیز نے آفس فون کر کے امتیاز احمد کے پی اے کو ان کی طبیعت کی معمولی خرابی کا بتایا اور مینجر کو بھی اور اگلے ایک ہفتے تک کی تمام میٹنگز کینسل کروادیں۔
گاڑی اسپتال کی طرف تیزی سے رواں تھی۔

☼ ☼ ☼

صالحہ نے بہت مرتبہ اپنے والدین کے پاس لوٹنے کا سوچا۔ لیکن اگر بات صرف مراد صدیقی کی بے وفائی کی ہوتی تو جا کر ماں، باپ سے دکھڑا رو لیتی۔ ناک رگڑ کے معافی مانگ لیتی۔
اب یہ سب کچھ وہ اپنے ماں باپ کو کس منہ سے بتاتی؟ انہوں نے تو اسے بیاہتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ انہیں مرا ہوا سمجھ لے۔
مراد صدیقی کو جیل گئے سات سال ہونے کو تھے۔ ایبہا دسویں کا امتحان دے چکی تھی اور صالحہ اپنے اندر جانے کون کون سی بیماریاں لیے بستر پہ آن پڑی۔
ایبہا کی تو جان پہ بن آئی۔ ایک ماں ہی کا سہارا تھا۔ وہ بھی ہاتھوں سے جاتا دکھائی پڑتا تھا۔
ماں نے اسے اپنی ساری کہانی سنائی تھی۔ اسے ماں کی بے وقوفی پر افسوس ہوا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا مراد صدیقی اس کا باپ تھا اور یہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ صالحہ بمشکل گھر کی دال روٹی چلا رہی تھی۔ مگر اب جب بستر پہ پڑی تو جان کے لالے پڑ گئے۔
اس پر مستزاد مراد صدیقی کی واپسی۔
ایبہا چھت پر کپڑے اتارنے گئی تھی۔ دروازہ مسلسل دھڑ دھڑائے جانے پر صالحہ نے بدقت تمام اٹھ کر دروازہ کھولا۔۔۔ تو لگا جہنم کا دروازہ کھول دیا ہو۔
اس کے بدن کی جان ٹوٹنے لگی۔
"ارے واہ۔۔۔ میری بلبل۔۔۔ خوشی سے سکتہ ہوگیا نا۔ کہاں تو گیارہ سال اور کہاں سات سال ہی میں واپسی۔" وہ چہکتا ہوا اندر داخل ہوا۔
اسی وقت ایبہا چھت سے کپڑوں کا ڈھیر لیے نیچے آئی اور کپڑے چارپائی پہ رکھ دیے۔
مراد کو دیکھ کر اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
"آہا۔۔۔ یہ میری دولت ہے۔ میری کل کائنات۔" ایبہا کا بازو دبوچ کر اسے سامنے کیے دیکھتا، چمکتی آنکھوں والا یہ کوئی باپ نہیں، بلکہ گندی نظروں والا شیطان تھا۔
صالحہ کے کمزور وجود میں جیسے بجلی سی دوڑ اٹھی۔ اس نے لپک کر ایبہا کا بازو چھڑایا۔
"جاؤ۔۔۔ جا کے باپ کے لیے پانی لے کے آؤ۔"
ایبہا خوف زدہ ہرنی کی طرح وہاں سے بھاگی۔
"ٹھیک سے دیکھنے تو دیتی۔ بالکل تیری طرح قیامت نکلی ہے یہ بھی۔"
وہ کہہ رہا تھا۔ صالحہ کا دل جیسے کسی نے کچل ڈالا ہو۔ اس کا جی چاہا مراد صدیقی کے منہ پر تھوک دے۔ جوانی

بیٹی پر شفقت کے بجائے شیطانیت بھری نظر ڈال رہا تھا۔
"تجھے کیا ہو گیا ہے الو کی پٹھی؟"
صالحہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ راہ بھٹکنے کی کیسی کڑی سزا پائی تھی اس نے۔
مراد کو افسوس ہوا۔ کمائی کا بڑا ذریعہ ہاتھوں سے نکل گیا۔
اس کے ابھی بھی وہی رنگ ڈھنگ تھے۔ آتے ہی شراب اور جوا شروع۔
صالحہ مرنے کو تھی۔ مگر پوری جان لڑا کے چوکنی ہو کر بیٹی کی حفاظت کرتی۔
مراد کو دوسرے کمرے میں سلا کر خود ساتھ والے کمرے میں ابیہا کے ساتھ کنڈی لگا کے ایک ہی بستر پر سوتی اسے مراد پر اعتبار نہ تھا۔ وہ غلاظت کے کسی بھی گڑھے میں گر سکتا تھا اور پھر وہ وقت بھی آگیا جس سے صالحہ ڈرتی تھی۔
مراد کا کسی سے جھگڑا ہوا اور وہ جھگڑا گھر تک آپہنچا۔
"دس لاکھ جوئے میں ہارا ہے یہ اور اب جیب سے پھوٹی کوڑی نہیں نکال رہا۔" کف اڑاتا شخص اور ساتھ میں مراد کو قابو کیے اس شخص کے حواری بھی تھے۔
مراد کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔
"صبر کرو جبار بھائی۔ ایک ایک پائی چکا دوں گا۔"
"ارے تیری تو.... بکواس کرتا ہے سالے حرامی۔" اتنی گندی گالیاں.... صالحہ ڈوب مرنے کو تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ کہاں چھپتی اور کہاں ہیرے جیسی بیٹی کو چھپاتی۔
"میں آج پیسہ لے کے ہی جاؤں گا۔ چاہے مکان بیچ.... چاہے اپنی عزت...."
وہ شخص لال آنکھیں لیے غرایا تھا۔ ایک ہاتھ کھینچ کے مارا۔ مراد بلبلانے لگا۔
"خدا کی قسم مکان کرائے کا ہے۔"
"کچھ بھی کر.... مگر مجھے میری رقم آج ہی چاہیے۔" اس شخص کا ارادہ اٹل تھا۔
"بب.... بندی چلے گی؟" مراد کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔
"کون.... یہ؟" اس شخص نے آنکھ سے نحیف و نزار صالحہ کی طرف اشارہ کیا تو انداز میں حقارت تھی۔
"نہیں.... میری بٹی ہے۔ قیامت ہے قیامت۔" وہ پر جوش سا بولا تو صالحہ کے کمزور وجود میں جیسے بجلی سی بھر گئی۔ اچھل کر مراد پر جھپٹی اور ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچ لیا۔
"بے غیرت.... خبردار جو اپنی گندی زبان سے میری بٹی کا نام لیا ہو تو۔"
مراد نے وہیں سب کے بیچ صالحہ کو ٹھڈوں اور تھپڑوں پر رکھ لیا۔
ابیہا چیختی ہوئی دوسرے کمرے سے نکل آئی۔ جبار بھائی نے پسندیدہ نظروں سے مکھن ملائی جیسی اس نوخیز کلی کو دیکھا تھا۔
وہ ماں کو بانہوں میں چھپا کے بیٹھ گئی۔
"چل بھئی مراد.... سودا منظور ہے مجھے۔ بندی بنا کے لے جاؤں گا۔ دس لاکھ کے بدلے اسے۔"
اس کی نظریں ابیہا سے گویا چپک ہی گئی تھیں۔ مرتی ہوئی صالحہ تڑپ اٹھی۔
"مم.... میں دوں گی دس لاکھ.... مجھے بس دو دن کی مہلت دے دو۔ میں دس لاکھ دوں گی۔"
"ہوں...." جبار بھائی کے لیے یہ آفر بھی پر کشش تھی۔
"مگر تیسرے دن تیری اس مکھن ملائی کو اٹھا کے لے جاؤں گا میں۔"

وہ خبیث ہنسی کے ساتھ بولا۔ صالحہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے آنسو بہاتی رہی۔
مگر بہر حال وہ اسے دو دن کی مہلت دے گیا تھا۔ مراد صدیقی متحیر تھا۔
"کہاں دبا کے رکھا ہے خزانہ۔ کیا میرے پیچھے بھی دھندہ کرتی رہی ہے؟"
"میں امتیاز احمد کو بلاؤں گی۔" وہ ایک نئی ہمت کے ساتھ اٹھی۔
"امتیاز احمد کون؟" وہ بھول چکا تھا۔
صالحہ کے دل میں ٹیس اٹھی۔
"جب آئے گا تو دیکھ لینا۔ وہ پیسہ دے گا۔ مگر اس کے بعد تیرا نہ تو مجھ سے کوئی تعلق ہو گا اور نہ میری بیٹی سے۔" وہ کر ختگی سے بولی۔
"ہاں تو ٹھیک ہے۔ پانچ لاکھ مجھے بھی نکلوا دے۔ پھر میری شکل بھی نہیں دیکھے گی تو۔"
وہ واقعی بے غیرت تھا' شیطان تھا۔
صالحہ نے لرزتے کپکپاتے ہاتھوں سے امتیاز احمد کا نمبر ملایا۔ جواب تک اس کے دل پر نقش ہو چکا تھا۔
"ہیلو...." یہ امتیاز احمد کا لہجہ تھا۔ اس کے امیت جی کی آواز تھی۔ صالحہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔
وہ پریشان ہو گیا۔
"کون بات کر رہا ہے' ہیلو۔"
"میں.... صالحہ (بدکار)" وہ بولی تو دل کرلایا۔ دوسری طرف امتیاز کو جیسے چپ لگ گئی۔
وہ یقیناً "شاکڈ" تھا۔
"مجھے تمہاری ضرورت ہے امتیاز احمد۔ تم آج ابھی اسی وقت میرے گھر آجاؤ۔"
وہ رو رہی تھی' بلک رہی تھی۔
امتیاز تو ویسے ہی اس کے لیے موم تھا۔ کیوں نہ پگھلتا۔ اگلے دو گھنٹوں میں وہ اس کے مقابل تھا۔ صالحہ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت و بے یقینی سے پھٹ گئیں۔
"اچھا.... تو پرانے منگیتر کو بلایا ہے تو نے۔" مراد صدیقی ہنستا ہوا چھت سے نیچے اترا تھا۔ مگر وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہی کہاں تھے۔
"صالحہ.... یہ تم ہو؟" وہ بے یقین تھا۔
وہ سونے چاندی جیسی لڑکی اور کہاں یہ بدرنگا پنجر۔
"مجھے صالحہ مت کہو امتیاز احمد۔ صالحہ تو کب کی مر چکی۔ تم سے جدا ہوتے ہی مر گئی وہ تو۔" صالحہ بلک کے روئی تھی۔
امتیاز احمد کو بہت کچھ ان دیکھا اور ان سنا بھی سمجھ میں آگیا تھا۔
باقی صالحہ نے اسے بتا دیا۔ ہاتھ جوڑے۔
"میری بیٹی جوئے پہ لگ رہی ہے امتیاز۔ میں تو نہ بچ سکی۔ مگر اسے بچا لو۔"
"میں دوں گا پندرہ لاکھ۔" امتیاز نے مزید کچھ نہ سنا تھا۔ "تم لوگ میرے ساتھ چلو گی۔"
"ارے ایسے کیسے۔ نامحرم کے ہاتھ اپنی بیٹی سونپ دوں میں۔ یوں نہیں بھیجوں گا میں اسے۔"
مراد بہت غیرت مند باپ بن کے چیخا۔ مستقل کمائی کا ذریعہ جو ہاتھ سے نکل رہا تھا۔
"امتیاز احمد.... نکاح کر لو میری بیٹی سے۔" صالحہ کی سانسیں تنگ پڑ رہی تھیں۔
امتیاز احمد ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' وہ رو پڑا۔

”ہاں... نکاح کر کے لے جاؤں گا۔“

وہ سرگوشی میں بولا تو صالحہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ صالحہ نے تفاخرانہ نظروں سے مراد کو دیکھا۔

امتیاز احمد موبائل لیے اپنے بیٹے کو فوری طور پر پندرہ لاکھ روپیہ لے کر وہاں پہنچنے کا کہہ رہے تھے۔

اسی شام پندرہ لاکھ کی ادائیگی ہوئی۔ نکاح کی سنت ادا کی گئی اور امتیاز احمد اپنے ساتھ ابیہا کو لے کر سیدھے ہوٹل میں گئے۔ دو دن اسے وہاں رکھا اور اس کا ایڈمیشن کالج میں کروا دیا۔ رہائش کے لیے گرلز ہاسٹل تھا۔

اور تب سے اب تک یہ سلسلہ جاری و ساری تھا۔ دو دن بعد ہی انہیں صالحہ کے مرنے کی خبر مل گئی۔ ابیہا کے لیے واپسی کا آخری در بھی بند ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

امتیاز احمد کی حالت پہلے سے اب کافی بہتر تھی۔ مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں معیز کے دل کو عجیب سا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

ابھی سفینہ اور زارا آنے والی تھیں اور وہ امتیاز احمد کے پاس اکیلا تھا۔

”بزنس بہت ڈاؤن جا رہا ہے۔ آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ ویسے آرام کرنے کا یہ طریقہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہے۔“

وہ انہیں بہلا رہا تھا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں معیز۔ اب تم کاروبار سنبھال لو۔ مجھے لگتا ہے میرے مستقل آرام کے دن آگئے ہیں۔“

وہ عجیب سے لہجے میں کہتے معیز کے دل کو خدشات سے بوجھل کر گئے۔

”ہرگز نہیں۔ آپ جلدی سے ٹھیک ہوں اور اپنے مسئلوں سے خود نپٹیں۔ میں یہ دردِ سر نہیں لینے والا۔“

معیز نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے گویا ڈپٹ کر کہا۔

”معیز...“ وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگے تو ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ معیز بھونچکا رہ گیا۔

اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے ان پر جھکا ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ صدمے کی کیفیت میں گھر گیا تھا۔

”ابو... بی بریو... اب بالکل ٹھیک ہیں آپ۔“

”معیز... میرا وجدان کہتا ہے کہ میرے پاس بہت وقت نہیں ہے۔“

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگے تھے کہ معیز جذباتی ہو کر انہیں ٹوک گیا۔

”خدا آپ کو صحت تندرستی دے ابو۔“

”مجھے کہنے دو معیز۔ میری سانسیں تنگ پڑ رہی ہیں۔ مگر ابیہا کا خیال مجھے سونے نہیں دیتا۔“

وہ شدید دکھ کے حصار میں تھے۔

اپنے ہاتھ کی گرفت میں معیز نے ان کا ہاتھ لرزتا محسوس کیا۔

”میں نے وصیت میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں معیز... وکیل سے ملو گے تو وہ تمہیں سمجھا دے گا۔ مگر تم سے میں ایک وعدہ چاہتا ہوں معیز۔“

ان کے لب و لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اندر داخل ہوتی سفینہ ادھر ہی ٹھٹک گئیں۔

”میں چاہتا ہوں کہ ابیہا در در کی ٹھوکریں نہ کھائے۔ وہ صالحہ کی نشانی ہے معیز... کیا تم میری آخری خواہش سمجھ کر اسے میرے گھر میں مقام نہیں دلاؤ گے۔“

وہ بڑی آس سے پوچھ رہے تھے۔ معیز کا دل جیسے کوئی شکنجے میں جکڑنے لگا۔ انہیں بہلانا چاہا۔

”آپ ٹھیک ہو جائیں ابو۔ پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔“

”نہیں... معیز! وہ صالحہ کے مرنے کے بعد بالکل اکیلی ہو گئی ہے اور وہ اکیلی اس دنیا میں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی، تب ہی تو صالحہ نے مجبور ہو کر اسے میرے نکاح میں دینے جیسا بے جوڑ فیصلہ کیا تھا۔ میں اس نکاح کو نبھانا چاہتا ہوں معیز۔ اگر میری زندگی میں ابیہا رخصت ہو کر اس گھر میں آجائے صالحہ کی تصویر مجھے اپنے آس پاس چلتی نظر آئے... تو شاید آخری سانسیں آسان ہو جائیں۔“

معیز گنگ سا سن رہا تھا۔

اور ادھ کھلے دروازے کے باہر کھڑی سفینہ آج برسوں کے بعد ہوا میں معلق تھیں۔

ان کی رنگت سفید پڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابیہا کا ذہن بالکل سن تھا۔ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا ہوئے اور نہ ہی ایگزیمز کی فیس جمع ہو سکی۔ وہ دو دن تڑپتی رہی۔ مگر کوئی سبیل نہ بنی۔

حنا نے اس کی مجبوری دیکھی۔ مگر وہ بے چاری خود بہت مجبور تھی۔ سو وہ منہ زبانی ہی بس ہمدردی کرتی رہی۔

امتیاز احمد کے آفس کا فون پی اے نے اٹینڈ کیا اور ان کی بیماری کی خبر سنا دی۔ موبائل ان کا آف تھا اور ان کے علاوہ وہ کسی اور کو جانتی نہ تھی شہر میں۔

وہ بالکل لٹی پٹی بیٹھی تھی۔

فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ گزر چکی تھی اور آج ہاسٹل میں اس کا آخری دن تھا۔

وہ رو رو کر تھک چکی تھی اور اب جبکہ ہر آس، ہر امید ختم ہو چکی تھی تو وہ شل ہوتے دماغ کے ساتھ ٹھس سی بیٹھی تھی۔

حنا نے گہری سانس بھر کے اٹھتے ہوئے ابیہا کے کپڑے نکال کے بیگ میں رکھنے شروع کیے۔ اپنے کپڑے وہ پہلے ہی پیک کر چکی تھی۔

”بس... اب تم میرے ساتھ میرے گھر چل رہی ہو۔“ اس نے فارغ ہو کر ابیہا کے پاس بیٹھتے ہوئے اطمینان سے کہا تو وہ خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”بھول جاؤ سب رشتوں کو ابیہا۔ یہ سب دنیا دکھاوا ہے۔ تم دیکھنا میں کیسے اپنی دوستی نبھاتی ہوں۔“

حنا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ تھی۔

اگر ابیہا حواس میں ہوتی تو کم از کم حنا پر اعتبار کر کے ہاسٹل سے نہ نکلتی۔

وہ دونوں ٹیکسی سے اتر کے حنا کی شاندار سی کوٹھی کے اندر داخل ہوئیں، تو اندر سے نکلتا شخص ان دونوں کو دیکھ کے ٹھٹکا۔

”سیفی...“ حنا زور سے چلائی۔

ابیہا نے بے ساختہ ان کی طرف دیکھا۔ حنا بھاگ کے سیفی سے لپٹ گئی تھی۔ ابیہا کو دفعتاً احساس ہوا کہ اس نے حنا کے ساتھ آکر اچھا نہیں کیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



بشریٰ احمد

ہے تعلق ادھورا ادھورا سا

ناولٹ

"مجھے سعد بھائی سے یہ امید نہیں تھی۔" مہرین نے گزشتہ پندرہ منٹ میں چوتھی بار یہ فقرہ بولا تو سب نے ہی اسے گھورا تھا۔

"تمہاری کوئی امید پوری ہوتی ہی کب ہے۔" عفیرہ بری طرح چڑ گئی۔

"لیکن اب ہو گا کیا۔" ثناء حالات سے بہت جلد مایوس ہوتی تھی۔

"ہو گا یہ کہ کچھ نہیں ہو گا۔" فارینہ جو نہایت سکون سے کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھی، کتاب بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

"ہاں تم تو ہو ہی عظیم خاتون، تمہیں اتنی چھوٹی موٹی باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔" عفیرہ سے اس کی

بے نیازی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"اسے فرق پڑے نہ پڑے، ہمیں تو پڑتا ہے نا۔ ہمارے خاندان میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ کسی نے بغیر وجہ کے ایسی حرکت کی ہو۔"

"کیا مطلب ہے یار... کیسی حرکت کردی اس بے چارے نے۔ شادی سے انکار ہی کیا ہے نا۔" فارینہ بھی جھنجلا ہی گئی

"فاری! تم کیا چیز ہو۔ تمہیں بالکل کوئی دکھ نہیں ہے۔ اپنی ریجیکشن کا۔" مہرین اسے حیرت سے دیکھ کر رہ گئی۔

"دکھ کیوں ہوتا؟ نہ اس نے مجھ سے کبھی کوئی کمٹمنٹ کی تھی اور نہ میں اس کی محبت میں گرفتار تھی اور ریجیکشن کی بھی خوب کہی۔ بڑوں نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔ جس پر اس نے سہولت سے معذرت کرلی۔"

"یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟" عفیرہ نے ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے نکتہ نکالا۔

"اس کی مرضی ہے بھئی۔" فارینہ نے کندھے اچکائے۔

"کیا سعد بھائی کسی اور کو پسند کرتے ہیں؟" ثناء نے اندازہ لگانا چاہا۔ "تم بتاؤ فاری! تم لوگ تو یونیورسٹی میں بھی ساتھ تھے۔"

"مجھے کیا پتا بھئی، میں کوئی اس کی جاسوسی کرتی تھی کیا۔"

"اوہو... بھئی کامن سینس کی بات ہے یہ ذہن میں لاؤ کہ وہ زیادہ وقت کس کے ساتھ گزارتا تھا یا پھر کس کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔" عفیرہ نے اسے عقل دینا چاہی۔

"وقت تو وہ زیادہ تر زین مجتبیٰ کے ساتھ گزارتا تھا اور آگے پیچھے وہ سر سلطان کے پھرتا تھا۔ اب یہ فیصلہ تم خود کرو کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو پسند کرتا تھا اور کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔" فارینہ اس موضوع سے اکتا کر کمرے سے ہی نکل گئی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آفس میں کسی کو پسند کرتا ہو۔" عفیرہ نے فارینہ کی بات کا نوٹس لیے بغیر سوچ بچار جاری رکھی۔

"ہونے کو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم کیا کرسکتے ہیں بھلا۔"

"ہم کمپرومائز کرسکتے ہیں۔" ماہین ـــ تھی تو فارینہ کی بہن مگر صلح جوئی کی طرف مائل ہوئی۔

"تم ہی کرتی پھرو کمپرومائز، میں تو کھوج لگا کر رہوں گی کہ وہ کس کو پسند کرتا ہے۔ آخر ہمارے خاندان کی عزت کا معاملہ ہے اور تم لوگ دیکھنا اسے فاری سے ہی شادی کرنا پڑے گی۔" عفیرہ کے لہجہ میں عزم تھا۔



ایک ہاؤس میں آباد چاروں بھائی اولاد کے جوان ہونے تک بھی ایک فیملی کی حیثیت سے رہائش پذیر تھے۔ اگر اس خاندان میں حسن سلوک اور اتفاق پایا جاتا تھا تو اس کی سب سے بڑی وجہ جملہ خواتین میں روا داری کا موجود ہونا تھا۔ سب سے بڑے عتیق احمد تھے۔ ان کے دو بیٹے عباد اور سعد، جبکہ بیٹی ثناء تھی۔

اس کے بعد انیس احمد تھے۔ ان کی تین بیٹیاں فارینہ، ماہین اور مہرین تھیں۔ تیسرے نمبر پر عظیم تھے۔ جن کے بچوں کے نام صارم، عادل اور عفیرہ تھے۔ چوتھے نمبر پر عبیدالرحمٰن المعروف ابی چاچو تھے جو اپنے سب سے بڑے بھتیجے عبادالرحمٰن سے چند ہی برس بڑے تھے۔ لیکن مزاج میں حد درجہ سنجیدگی کے باعث نئی نسل کے ساتھ فاصلہ روا رکھے ہوئے تھے۔ ان کی شادی شدہ زندگی کی ناکامی کی بڑی وجہ بھی ان کا مزاج تھا۔

یوں یہ چار بھائی اپنی والدہ کے ساتھ ایک ہاؤس میں رہائش پذیر تھے۔

فارینہ سے شادی کا انکار تو سعد ابراہیم نے کردیا تھا۔ لیکن اسے اس حد تک اپنے سوشل بائیکاٹ کی

امید نہ تھی۔ چوتھا دن تھا۔ گھر کی جملہ خواتین کو اس سے مخاطب ہوئے ـــ امی، دادی دونوں چچی اس سے ناراض تھیں۔ ابو سے اس کا انکار فی الحال چھپا لیا گیا تھا۔ ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اسے گھر سے نکال باہر کرتے۔ صارم اور عادل بھی اس صورت حال سے پریشان تھے۔ عباد بھائی کو تو کسی سے کوئی غرض تھی نہیں۔ ہاں گھر کا وہ واحد فرد جو اس سچویشن کو صحیح معنوں میں انجوائے کررہا تھا تو وہ تھیں عباد بھائی کی اہلیہ، جنہیں فی الوقت اس بھرے پرے گھر کی واحد بہو ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ لیکن انہیں نہ جانے کیوں ہر کسی سے پرخاش ہی رہتی تھی اور شاید ان ہی کی وجہ سے عباد بھائی بھی گھر سے لاپروا ہو گئے تھے۔

سو شازمہ بھابھی بھی بڑی مہربان ہو رہی تھیں آج کل سعد ابراہیم پر۔

"سعد! ناشتا بنادوں؟" یہ آفر انہوں نے آج تک کسی کو نہ کی تھی۔

"نہیں بھابھی! ابھی ثنا آرہی ہے۔ وہ بنادے گی۔" سعد نے بہن کا نام لیتے ہوئے سہولت سے انکار کیا۔

"جیسے تمہارے مرضی۔" وہ اپنی اور عباد بھائی کی ناشتا کی ٹرے سیٹ کرکے کندھے اچکاتی کچن سے نکل گئیں۔

"کہاں رہ گئی تھیں تم۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" قدموں کی آواز سن کر وہ جھنجلاتا ہوا پلٹا تھا۔ لیکن فارینہ کو دیکھ کر چپ سا ہو گیا۔ گزشتہ چار دنوں میں اس نے کئی بار خود کو فارینہ کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ لیکن وہ دکھائی ہی نہیں دی اور آج جب وہ نظر آئی تو وہ گڑبڑا گیا۔

"سوری سعد! میری آنکھ دیر سے کھلی۔ حالانکہ مجھے معلوم بھی تھا کہ ثناء کو بخار ہے۔ پھر بھی میں الارم لگانا بھول گئی۔ تم جلدی سے بتاؤ کیا لوگے ناشتے میں۔" وہ بہت نارمل انداز میں اس سے بات کرتے ہوئے فریج میں سے سامان نکال رہی تھی۔

"بس چائے بنادو۔" سعد کو اسے دیکھ کر تسلی سی ہوئی تھی کہ وہ کم از کم باقی گھر والوں کی طرح جذباتی ہو کر ری ایکٹ نہیں کررہی تھی۔

"تم چلو... میں لاتی ہوں۔" سعد خاموشی سے پلٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ چائے کے ساتھ سلائس اور ہاف فرائی انڈے پر مشتمل ناشتے کی ٹرے اٹھائے لاؤنج میں چلی آئی۔

"ثناء کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟" اس نے یوں ہی بات برائے بات دریافت کیا۔

"ہاں... کافی تیز بخار تھا رات کو۔ اب میں اس کے پاس جارہی ہوں۔ رات بھی کچھ کھائے پیے بغیر ہی سو گئی تھی۔ تمہیں کچھ اور چاہیے تو نہیں۔"

"نہیں اگر کچھ چاہیے ہوگا تو خود لے لیں گے۔" عفیرہ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی تھی۔

"بری بات۔" فارینہ نے خاموش نگاہوں سے اسے تنبیہہ کی۔ جسے اس نے قطعاً" نظرانداز کردیا۔

"عظیم خاتون! اگر آپ کو خدمت خلق کا اتنا ہی شوق ہے تو میرا بھی ناشتا بنادیں۔ آج کالج وین نہیں آئے گی اور لوکل بسوں کا تو حال تمہیں معلوم ہے نا۔ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔" عفیرہ نے لمبی تقریر کرڈالی۔ وہ پرائیویٹ کالج میں پڑھا رہی تھی۔

"تم جلدی سے ناشتا کرلو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔" سعد نے خلاف توقع اسے آفر کی۔

"جی نہیں شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔" کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کبھی مفت کی سواری ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ لیکن اس وقت بات اصول کی تھی اور اصولوں پر



سمجھوتا وہ کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ سو فارینہ کے پیچھے ہی کمرے سے نکل آئی۔ لیکن سعد بڑے سکون سے ناشتا ختم کرکے اس کا انتظار کرتا رہا۔ جانتا تھا کہ وہ جو اتنی دیر سے ناشتا کررہی ہے۔ دو منٹ میں سلائس ختم کرکے ٹھنڈی چائے انڈیل لے گی اور ہوا بھی یوں ہی۔ وہ جوں ہی ناشتا کرکے بیگ لے کر آئی سعد چابیاں اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔

"سعد کے ساتھ جارہی ہو؟" عین اسی لمحہ ابی چچا لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔

"جی... اس کی وین نہیں آئے گی آج۔"

"لیکن میں بس سے چلی جاؤں گی، تم لیٹ ہوجاؤ گے خوامخواہ۔" اس نے سعد کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں، نہیں... سعد ہی چھوڑ دے گا۔ اکیلے بس میں جانا مناسب نہیں۔"

ابی چچا حتمی رائے دے کر وہیں لاؤنج میں اخبار لے کر بیٹھ گئے۔ اسے بھی سعد کے پیچھے نکلتے ہی بنی۔

"ہاں تو بتاؤ، کیا مسئلہ ہوگیا ہے تم سب لوگوں کے ساتھ۔" سعد نے گاڑی مین روڈ پر لاتے ہی اس سے دریافت کیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں کس نے کہا کہ ہمارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟"

"پھر اس طرح ری ایکٹ کیوں کررہے ہو؟" سعد نے سوچا تھا کہ جھنجلائے گا بالکل نہیں، لیکن اس کے اس طرح انجان بننے پر چڑ ہی گیا۔

"ہم نے تم سے پوچھا کہ تم نے فاری کو **ریجیکٹ** کیوں کیا۔ نہیں نا۔ تو بس پھر تم بھی کچھ نہ پوچھو۔" **عفیرہ** نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تم پوچھو، میں نے منع تو نہیں کیا اور ایک بات بتاؤں مجھے بھی فاری بہت عزیز ہے۔ جس طرح تم سب لوگوں کو ہے۔ میں اس کو بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا ساتھ اسے شاید مکمل خوشی نہ دے سکے۔"

"اسی لیے تم نے اسے **ریجیکٹ** کردیا۔" **عفیرہ** نے طنز کیا۔

"میں نے اسے **ریجیکٹ** نہیں کیا ہے۔" سعد نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"اوہ ہاں... اسے **ریجیکشن** نہیں کہتے، تم نے تو گڈول کے تحت ایسا کیا ہے۔" **عفیرہ** نے یوں گردن ہلائی جیسے پوری بات اب اس کی سمجھ میں آئی ہو۔

"ویسے سعد! ایک بات تو تم نے خود ہی بتادی۔ ایک میں پوچھ لیتی ہوں۔ تم کسی کو پسند کرتے ہو نا؟ کوئی کلاس فیلو، کوئی کولیگ۔" **عفیرہ** نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔ نہ کوئی کلاس فیلو... نہ کوئی کولیگ اور نہ کسی کو پسند کرنے کا میرا دور، دور تک کوئی ارادہ ہے۔ میں شادی گھر والوں کی مرضی سے ہی کروں گا۔"

"ہاں جیسے اب کررہے ہو۔" **عفیرہ** نے بڑبڑاتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ سعد نے بھی سر جھٹک کر توجہ سامنے کی طرف مبذول کرلی کہ وہ بھی کس کے سامنے وضاحتیں پیش کرنے بیٹھ گیا۔ جو عام حالات میں کسی کی نہیں سنتی کجا کہ غصہ میں کسی کی سمجھے گی۔

☼ ☼ ☼

"محترم یوں تقریر کررہے تھے کہ جیسے فاری کا اس سے بڑھ کر کوئی اور خیر خواہ نہیں۔" **عفیرہ** کچن کی سلیب پر چڑھی سیب کو دانتوں سے کتر رہی تھی۔ ماہین برتن دھو رہی تھی۔

"مجھے شک ہے، وہ کسی کو پسند کرتے ہیں۔" ماہین نے خدشہ ظاہر کیا۔

"تمہیں شک ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے، تم دیکھنا تو میں حقیقت معلوم کرکے ہی رہوں گی۔"

"کیسی حقیقت...؟" شازمہ بھابھی نے کچن میں قدم رکھا۔ "توبہ ہے بھابھی کے کان کتنے تیز ہیں۔"

"یہی کہ آپ اتنے مزے دار کھانے کیسے بناتی ہیں۔" **عفیرہ** کے اطمینان میں ذرا بھر بھی فرق نہیں آیا۔

"دراصل ہماری امی بہت اچھا پکاتی تھیں۔ خاندان بھر میں ان کے ہاتھ کا ذائقہ مشہور تھا تو ظاہر ہے ہم بہنوں نے بھی ان سے ہی سیکھا ہے۔"

شازمہ بھابھی تعریف سے پل بھر میں خوش ہوجاتی تھیں۔ ماہین نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی۔ کیونکہ شازمہ بھابھی کی اچھی کوکنگ سے کبھی کبھار وہ لوگ مستفید ہو ہی جایا کرتے تھے۔ بہرحال اس وقت وہ **عفیرہ** سے محو گفتگو ہوچکی تھیں۔ ماہین برتن دھو کر فارغ تھی سو ہاتھ صاف کرتے ہوئے باہر چلی آئی۔ فارینہ برآمدے میں ہی نیم دراز کتاب تھامے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ماہین اس کے قریب چلی آئی۔

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔" فاری اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"فاری تم واقعی اتنی مطمئن ہو یا محض سب کو نارمل کرنے کے لیے یوں پوز کرتی ہو۔" ماہین نے جانچتی نظر اس پر ڈالی۔

"کیوں بھئی میں کیوں پوز کروں گی۔" فارینہ سنجیدہ ہوئی۔

"تم سعد بھائی کو پسند نہیں کرتیں فاری؟"

"ہم سب کزنز ہیں ماہی... سعد ہو یا صارم یا عباد بھائی میں کسی کو ناپسند نہیں کرتی۔"

"اوہو... میں اس لحاظ سے نہیں پوچھ رہی۔" وہ جھنجلائی۔ "ہمارے گھر میں تو کافی عرصے سے یہ بات ڈسکس ہورہی تھی نا کہ تمہاری شادی سعد بھائی سے ہوگی۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کے انکار سے تمہیں کوئی فرق ہی نا پڑا ہو؟"

"معلوم نہیں، لیکن میرے دل میں کبھی اس کے لیے کوئی خاص جذبات نہیں جاگے اور اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا، وگرنہ واقعی میں دکھی ہوتی۔ لیکن ایک اور اہم بات بھی ہے کہ اس نے مجھ سے شادی کے لیے معذرت ضرور کی ہے، لیکن میری ذات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تم لوگ خوامخواہ جذباتی ہورہے ہو۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دادی اور تائی جان کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اس کی پسند معلوم کرکے سیدھی طرح اس کا رشتہ لے کر جائیں۔ آخر یہ اس کا حق ہے۔"

"کوئی نہیں... ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" **عفیرہ** بھی وہیں چلی آئی تھی۔

"تم انسانی حقوق کی علمبردار کب سے بنی ہو۔" فارینہ مسکرائی۔

"کیا ہورہا ہے لڑکیو!" عظیم چچا کی آواز بالکل ان کے عقب سے ابھری تھی۔

"کچھ نہیں عظیم چچا۔ ویسے ہی دھوپ سینک رہے تھے۔" ماہین نے گڑبڑا کر کہا تو عظیم چچا کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ **عفیرہ** نے ماہین کو گھور کر دیکھا۔ برآمدے میں ان کی کرسیوں پر سے گزر کر دھوپ کب کی رخصت ہوچکی تھی۔

"اچھا... ایسا کرو، سعد یا صارم کو میرے کمرے میں بھیجو، مجھے کچھ کام ہے۔"

"آپ چلیں ابو! میں بھیجتی ہوں۔" **عفیرہ** یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

دروازہ دو مرتبہ کھٹکھٹانے کے بعد بھی کوئی آواز نہیں آئی تو اس نے دروازے کی جھری بنا کر اندر جھانکا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ اطمینان سے اندر آگئی۔ واش روم کا دروازہ بند تھا اور پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک سرسری نگاہ چاروں طرف ڈالنے کے بعد اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھالیا۔

"چلو فی الحال یہ ہی سہی۔" وہ فوراً کمرے سے نکل آئی۔

"صارم! تمہیں ابو بلا رہے ہیں۔ تمہیں یا سعد کو؟" صارم کے کمرے میں جھانکتے ہوئے اس نے اطلاع دی اور پھر بغیر رکے سیڑھیاں اتر گئی۔

"آؤ میرے ساتھ..." اس نے ثناء کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کمرے میں کھینچا۔

"میں بولتی جاؤں گی اور تم سارے نمبرز جلدی جلدی نوٹ کرلو۔ جو **مسڈ** کال ہوں یا ریسیوڈ بلکہ

ڈائیلڈ بھی دیکھ لینا۔"

دس، بارہ نمبر ہی سے بار بار کال آئی ہوتی تھی۔ مہرین نے جلدی جلدی لسٹ بنائی۔ عفیرہ بھاگ کر موبائل لاؤنج میں رکھ آئی۔ آخر بندہ کبھی کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول بھی تو جاتا ہے۔ مطمئن ہو کر وہ کمرے میں آگئی۔

چار مسڈ کالز زین مجتبیٰ کی تھیں۔ دو عتیق چچا کی۔ ایک، دو نمبرز اس کے آفس کولیگز کے تھے۔ یہی حال ریسیوڈ اور ڈائیلڈ کالز کا تھا۔

"بس جناب! اس قصے میں تو کسی لڑکی کا دور، دور تک کوئی ذکر نہیں ہے۔" ثناء کو تسلی ہوئی تھی اپنے بھائی کے کردار سے متعلق۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ یہ ضروری ہے وہ لڑکی کے اصل نام سے ہی نمبر محفوظ کرے۔ آخر اتنا ذہین ہے۔" عفیرہ نے لاشعوری طور پر اس کی ذہانت کا اعتراف کیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ حسنہ کو حسن کے نام سے اور کوثر کو قیصر کے نام سے بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔"

"توبہ کرو عفیرہ! تم تو پاکستانی پولیس کی طرح عقل سے ماورا باتیں کر رہی ہو۔ حسن اور قیصر دونوں سعد کے یونیورسٹی کے فرینڈز ہیں، کتنی بار گھر آ چکے ہیں۔ تم فضول کی اپنی یہ جاسوسی مہم چھوڑو اور کمپرومائز کر لو۔" ثناء نے اسے ٹھیک ٹھاک سنائیں۔ لیکن وہ بغیر بدمزہ ہوئے کچھ سوچتی اور مسکراتی رہی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے ثناء کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔

☼ ☼ ☼

"سعد! آج تمہاری دادی نے تمہارا فائنل جواب مانگا ہے۔" امی چائے دینے اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ وہ لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ امی کی بات پر ایک گہرا سانس لے کر ان کی جانب متوجہ ہوا۔

"مام ڈیر... میرا جواب وہی ہے جو میں دے چکا ہوں۔" وہ کبھی لاڈ میں ہوتا تو امی کو مام یا ماما ہی کہتا تھا۔ امی نہال ہو جاتی تھیں، لیکن اس وقت سپاٹ چہرہ لیے اسے دیکھتی رہیں۔

"کتنا فخر تھا مجھے اور تمہارے ابو کو کہ ہماری اولاد ہمارا کہا نہیں ٹال سکتی۔ لیکن پہلے عباد اور اب تم..." انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

"امی پلیز... مجھے عباد بھائی سے مت ملائیں۔"

"ہاں اس سے ملا بھی نہیں سکتے۔ اس نے شادی تو کم از کم ہماری مرضی سے ہی کی تھی نا۔ آگے اس کے نصیب۔" امی نے پر تاسف انداز میں اسے گویا عباد بھائی سے بھی ایک درجہ نیچے لا کھڑا کیا۔ وہ لب بھینچے لیپ ٹاپ کی اسکرین دیکھے گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بتا دیتی ہوں تمہاری دادی کو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دادی کو اسی جواب کی توقع تھی۔ جتنا عزیز تھا انہیں اپنا یہ پوتا وہ اتنا ہی دکھ دے رہا تھا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا صبیحہ کہ وہ نہیں مانے گا۔" انہوں نے امی کے مایوس چہرے کو دیکھ کر خود ہی اندازہ لگا لیا۔

"میری تو خواہش تھی کہ صارم اور ثناء کے ساتھ ہی ان دونوں کو بھی نپٹا دیتے۔ انہوں نے تو چلے جانا ہے۔ ہمارے گھر میں تو رونق انہی کے دم سے ہوتی تھی۔ لیکن بہرحال جو اللہ کی مرضی۔"

دادی نے امی کو تسلی دی۔ صارم کمپنی کی طرف سے دبئی ٹرانسفر ہو کر جا رہا تھا۔ قیام چونکہ طویل تھا۔ سو فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ ثناء اور اس کی منگنی دو سال پہلے ہوئی تھی اور اب دو ماہ بعد شادی کا ارادہ تھا۔ سعد اور فارینہ کے متعلق بھی دادی نے بیٹوں اور بہوؤں کی رضامندی سے فیصلہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے باقی سب تو بخوشی راضی تھے۔ سوائے اس کے جس کے نام کے ساتھ فارینہ کا نام جوڑا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بوریت ہے یار... دو ماہ بعد گھر میں شادی ہے

اور ہم لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہیں۔"

فارینہ زیادہ دیر تک گھر بھر پر چھائی جمود کی یہ فضا برداشت نہ کر سکی۔ وہ تھی بھی بہت حساس ہر کسی کو خوش دیکھنے والی۔

"ہاں واقعی... ہمیں ثناء کی خاطر حالات بہتر بنانے ہوں گے۔ ورنہ وہ کیا سوچے گی کہ ہم اس کے بھائی کی وجہ سے اس کی خوشیوں کا بھی خیال نہیں رکھ رہے۔" ماہین نے بھی تائید کی۔

"چلو... شاپنگ پر چلتے ہیں۔" مہرین نے فٹ پروگرام بنایا۔ اسے شاپنگ کا جنون تھا۔

"ایسے نہیں... ہر کام طریقے سے ہوتا ہے۔" فارینہ اٹھی اور صبیحہ تائی کو بلانے چل پڑی۔

"تم امی اور دادی وغیرہ کو بلاؤ۔ بھئی ہمارا لاؤنج اس وقت آباد ہوتا تھا۔" اس نے ماہین اور مہرین کو کہا اور واقعی کچھ ہی دیر میں سب لوگ لاؤنج میں جمع تھے۔ ماہین کاپی پنسل لیے چچی کے برابر آ بیٹھی۔ جہیز کی لسٹ بنانے لگی۔ مہمانوں کے نام فائنل ہو رہے تھے۔ دور نزدیک کے مہمان کہاں ٹھہرائیں جائیں گے۔ ہر مسئلہ توجہ طلب تھا۔

"خیریت ہے؟" شازمہ بھابھی نیچے اتر کر آئی تھیں ——— حیران رہ گئیں۔

"جی ہاں بھابھی! آپ بھی آئیں۔ ثناء کی شادی کے پروگرام بن رہے ہیں۔" فارینہ نے خوش دلی سے انہیں مخاطب کیا۔

"اوہ اچھا..." انہوں نے معنی خیز ہنکارا بھرا۔

"کیا لڑکی ہے یہ... جیسے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔ سعد آسانی سے نظر انداز کیے جانے کے قابل تو نہیں ہے۔ امی کتنی بار کہہ چکی ہیں نازش کے لیے۔ خیر یہ معاملہ ختم ہوتا ہے تو بات چلاؤں گی۔" وہ بے دھیانی میں فارینہ پر ہی نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ جسے اس نے بھی نوٹ کر لیا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں بھابھی؟" فارینہ نے ہنس کر پوچھا۔

"آں... ہاں... کچھ نہیں۔" وہ چونکیں۔ "بس یہی سوچ رہی تھی کہ سعد نے آخر کیا سوچ کر تم سے شادی کا انکار کیا ہے۔

تم اس سے کم تو نہیں ہو۔" فارینہ کے مسکراتے لب یک دم سکڑے تھے۔ یہی بات عفیرہ بھی کہتی تھی۔ لیکن اس کے لہجے میں فارینہ کے لیے محبت اور خلوص ہوتا تھا، جبکہ شازمہ بھابھی کے لیے محض ایک چٹخارے دار موضوع تھا۔

"ارے چھوڑیں اس بات کو۔ یہ بتائیں کہ آپ کیسے کپڑے بنوائیں گی شادی کے لیے۔" ماہین فوراً بہن کی مدد کے لیے آئی۔ فارینہ نے تشکر آمیز انداز میں اسے دیکھا تھا۔ بھابھی کا من پسند موضوع انہیں مل چکا تھا۔ وہ ماہین کے ساتھ نئے فیشن اور رنگوں کے جدید امتزاج ڈسکس کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

شکر ہے یہ مسئلہ تو حل ہوا۔ گھر والوں کی نئی مصروفیت نے سعد ابراہیم کو خاصا مطمئن کر دیا تھا۔ اگرچہ ابو اس ساری صورت حال سے بے خبر تھے۔ ان سے یہ ہی کہا گیا تھا کہ سعد فی الحال شادی پر راضی نہیں۔ فارینہ کے ساتھ پر راضی نہیں یہ بات بوجوہ چھپا لی گئی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا۔ سعد ابراہیم خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا خود کو۔ یہ بات اس کے مزاج سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔ گھر والوں کا تابعدار تو وہ پہلے بھی تھا۔ لیکن اب تو تابعداری کا کچھ اور ہی عالم تھا۔ زیادہ تر ذمہ داریاں اسی کے سر تھیں جنہیں وہ بطریق احسن پوری کر رہا تھا۔ سب ہی اس سے مطمئن تھے سوائے عفیرہ کے۔ "گھر کے جملہ بزرگان کی گڈ بکس سے نکل گئے تھے تا اسی لیے خوشی خوشی سب کام کر رہے ہیں، تاکہ دوبارہ سے وہی پہلے والا سعد بن جائیں۔"

"وہ کسی کی گڈ بک سے نہیں نکلا تھا۔ ایک معمولی سی بات کو تم نے پتا نہیں کیوں سر پر سوار کر رکھا ہے۔" فارینہ نے اسے ڈپٹا۔

"اور جہاں تک کام کرنے کی بات ہے تو اس کی

بہن کی شادی ہے۔ اس میں وہ کام نہیں کرے گا تو کیا محلے والے آکر کریں گے۔" ماہین نے بھی اس کی عقل پر ماتم کیا۔

"کل وہ فون پر بات کر رہا تھا۔" عفیرہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

"تو کیا پہلی بار کر رہے تھے؟" ثناء نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

"کسی کو تسلیاں دے رہا تھا۔ تم فکر نہ کرو۔ ایک مرحلہ تو سر ہو گیا۔ آگے بھی ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تو یار! اس میں کیا قابل اعتراض بات ہے؟"

"اس میں تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ بس آخری فقرہ مشکوک تھا۔"

"کیوں آئی لو یو کہہ دیا تھا انہوں نے؟" مہرین کی آنکھوں میں چمک آئی۔

"جی نہیں۔" عفیرہ کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"کہہ رہا تھا مجھ پر یقین کرو نہ کرو اپنی محبت پر تو یقین ہے نا۔" عفیرہ نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

"عفیرہ! بہت بری بات ہے۔ تم اس کی جاسوسی کرتی پھر رہی ہو۔" فارینہ کو یہی بات قابل اعتراض لگی تھی۔

"ڈوب مرو تم۔ تمہاری خاطر میں سب کچھ کر رہی ہوں اور تم ہو کہ......" عفیرہ نے شدت جذبات میں بات ادھوری چھوڑی۔

"کون کس کی خاطر کیا کر رہا ہے۔" صارم اور سعد اکٹھے ہی لاؤنج میں آئے تھے۔ ثناء نے رخ تھوڑا سا پھیر لیا۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتی تھی کہ صارم سے کم سے کم سامنا ہو۔

"ثناء! تم واپس پہلی پوزیشن میں آجاؤ۔ صارم تمہیں آئینے میں زیادہ واضح دیکھ رہا ہے۔" عفیرہ نے اس کی توجہ دیوار گیر آئینے کی طرف دلوائی۔

واقعی ذرا سا رخ پھیرنے پر وہ پوری کی پوری صارم کے سامنے تھی۔ ثناء اپنے بڑے بھائی کے سامنے اس پچویشن پر جھینپ گئی۔ جبکہ "بڑے بھائی" نے یوں پوز کیا تھا۔ جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

"دادی کہاں ہیں؟" کافی دیر کے مراقبہ کے بعد اس نے یہ سوال کیا تھا۔

"امی کے ساتھ اظہار انکل کے ہاں گئی ہیں۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا نا۔" ثناء نے اپنی امی کے کزن کا نام لیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ ثناء! ایک کپ چائے تو بھجوا دو میرے کمرے میں یار۔" وہ تھکا تھکا سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ثناء کی شادی میں اب کچھ دن ہی رہ گئے ہیں۔ اس لیے یہ اب کوئی کام نہیں کرتی۔" ثناء اٹھنے ہی لگی تھی کہ عفیرہ بول پڑی۔

"نہیں بھائی! میں بنا دیتی ہوں۔" ثناء کو اچھا نہیں لگا تھا اس کا کہا ٹالنا۔

"نہیں واقعی تم رہنے دو ۔ عفیرہ بنا دے گی۔ عفیرہ چائے کمرے میں ہی دے دینا۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ عفیرہ تپ کر رہ گئی۔

"ہونہہ...... خدمتیں کروانے کو رہ گئیں گھر کی لڑکیاں۔ شادی کریں گے باہر کی کسی طرح دار حسینہ سے۔" عفیرہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانتی تھی کہ اگر وہ نہ اٹھی تو ثناء سے رہا نہیں جائے گا اور ثناء کو واقعی آج کل وہ کچن میں گھسنے نہیں دے رہی تھیں۔

"کیسے کیسے خیالات آتے ہیں عفیرہ کے ذہن میں۔" اس کے اٹھنے کے بعد وہ دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔

"طرح دار حسینہ کی بھی خوب کہی ہمارے گھر کے لڑکوں کا مختصر سا حلقہ احباب ہے۔ اس میں کہاں گنجائش ہے کسی طرح دار حسینہ کی۔"

یہ ان سب کا مشترکہ خیال تھا جو ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد غلط ثابت ہو گیا۔

سعد نے امی کو لے کر جیولر کے ہاں جانا تھا۔ ان سب نے بھی اپنی ناختم ہونے والی شاپنگ کرنی تھی۔ سو سب ہی ساتھ ہو لیں۔ امی کو جیولر کے ہاں ڈراپ کر کے وہ انہیں مین مارکیٹ لے آیا۔ "آدھے گھنٹہ کے اندر اندر شاپنگ مکمل ہو جانی چاہیے۔" وہ انہیں

ڈیڈ لائن دے رہا تھا۔ جب دو اجنبی صورتیں ان کے قریب چلی آئیں۔

"ہیلو سعد......" خوش شکل اور خوش لباس خاتون جو عمر میں ذرا بڑی تھیں قریب آکر بڑے پرجوش انداز میں مخاطب ہوئیں۔

"السلام علیکم بھابھی!" سعد نے بھی ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے خوش دلی سے سلام کیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے مسکراتی نگاہ لڑکیوں پر ڈالی، جو یک ٹک ساتھ خاموش کھڑی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کے انداز میں نسبتاً" لاتعلقی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی پہلا لفظ جو ان کے ذہن کی اسکرین پر نمودار ہوا تھا وہ طرح دار حسینہ کا تھا۔

"ڈیوٹی پر ہوں جناب!" سعد کی خوش مزاجی عروج پر تھی۔

"اچھی ڈیوٹی ہے۔" بھابھی کھلکھلائیں۔

"تعارف نہیں کرواؤ گے؟" ان کی پرشوق نظریں لڑکیوں کے چہروں پر تھیں۔

"بالکل...... یہ عاطف بھائی کی مسز ہیں۔ زین کی بھابھی اور یہ ان کی سسٹر خزیمہ ہیں۔

اور بھابھی! یہ ثناء ہے، یہ ماہین، مہرین اور عفیرہ، فارینہ کو امی کے ساتھ جیولر کے ہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔" فارینہ کا ذکر نہ جانے اس نے کیوں کیا تھا۔

"اچھا جی...... اپنی شاپنگ انجوائے کریں۔ پھر ملاقات ہو گی ان شاء اللہ۔"

"سعد! تم ان لوگوں کو لے کر کبھی گھر آؤ نا۔" انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے دعوت دی۔

"نام تو خوب صورت ہے۔" عفیرہ زیر لب بڑبڑائی۔

"چوائس اچھی ہے سعد کی۔" عفیرہ نے گھر جاتے ہی اعلان کیا تھا۔

"تم اتنی دور کی کوڑی کیوں لاتی ہو ہمیشہ؟" فارینہ نے سر پکڑا۔

"اور تم ہمیشہ اتنی خوش گمانیوں میں کیوں رہتی ہو۔" عفیرہ نے سینڈل اتار کر پاؤں دباتے ہوئے جواباً" استفسار کیا۔

"ویسے مجھے لگ رہا ہے اس بار عفیرہ سچ ہی کہہ رہی ہے۔" ثناء کی آواز پست تھی۔

"لو جی...... یک نہ شد دو شد۔" ماہین نے ہنسی اڑائی۔

"نہیں ماہی! کل سعد بھائی امی سے خوب بحث کر رہے تھے کہ زین بھائی کی فیملی کو شادی میں انوائیٹ کرنا چاہیے۔"

"ہائیں......" وہ سب سیدھی ہوئیں۔ "یہ تو ناممکن سی بات ہے۔"

"ہاں اور وہ کہہ رہے تھے کہ میں عبید چچا سے خود بات کروں گا۔"

"پھر تو معاملہ گڑبڑ تھا۔ اگر وہ اس حد تک اسٹینڈ لینے کی سوچ رہا تھا۔ دونوں گھرانوں میں اگرچہ قریب کی رشتہ داری تھی۔ لیکن تعلقات میں بڑی گہری دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ آنا جانا کئی سالوں سے بند تھا۔ عزیز رشتہ داروں کے گھر کسی تقریب میں ملاقات ہو بھی جاتی تو سلام دعا سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی۔ عاطف بھائی کی شادی دو، تین سال پہلے ہی ہوئی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ ان کی مسز سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

قصوروار پتا نہیں کون تھا۔ دراصل عبید چچا کی شادی زین کی پھوپھو کے ساتھ ہوئی تھی۔ سعد کے دادا اور زین کی دادی فرسٹ کزنز تھے۔ عائشہ کے ساتھ شادی اگرچہ بڑوں کی رضامندی سے طے پائی تھی۔ لیکن عبید چچا نے ٹوٹ کر ان سے محبت کی تھی۔ لیکن عائشہ چچی کے مزاج میں عجیب ٹھہراؤ سا تھا۔ وہ اپنی چچا کی محبتوں کی شدتوں کو محسوس تو کرتی تھیں۔ لیکن جواباً" ان کے انداز میں وہ گرم جوشی اور والہانہ پن محسوس نہیں ہوتا تھا۔ تین سال تک وہ عبید الرحمان کے گھر میں رہیں۔ اللہ کی مرضی کہ اولاد بھی نہ ہوئی۔ وگرنہ شاید حالات اس نہج تک نہ پہنچتے۔

عائشہ چچی دراصل اپنے خالہ زاد کزن سے محبت کرتی تھیں۔ اگرچہ شادی کے بعد وہ اس خیال کو دل

سے نکال چکی تھیں۔ لیکن لاشعوری طور پر عبید چچا کو دل میں وہ مقام نہ دے پائیں جس کے وہ حق دار تھے۔ ان کی طبیعت میں جو جمود شادی کے بعد آگیا تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ پھر پتا نہیں کیسے ابی چچا کو ان کی زندگی کے اس عشق گمشدہ سے آگاہی ہوگئی جو وہ ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں دفن کرچکی تھیں۔ غصہ تو عبید چچا کا خاندان بھر میں مشہور تھا۔ اس معاملے پر بھی کمپرومائز نہ کرپائے۔ انہوں نے عائشہ چچی کو گھر سے تو بے دخل کردیا تھا، لیکن دل سے نہ نکال پائے۔

دوسری طرف عائشہ چچی کی والدہ نے بھی صلح جوئی کا رستہ نہ اپنایا۔ یوں مصالحتی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ عبید چچا نے والدین کے ہزار چاہنے کے باوجود بھی دوسری شادی نہ کی اور یوں دو زندگیوں کی جدائی دو خاندانوں میں نا ختم ہونے والی خلش چھوڑ گئی اور اب انہونی ہونے کو جارہی تھی۔ جو سعد ان لوگوں کو شادی میں انوائیٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ سعد کی زین سے دوستی کی تو سب کو خبر تھی۔ لیکن اس کے گھر اس حد تک آنا جانا ہوچکا ہوگا یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ باقی گھر والوں کی تو اس سارے قصہ سے کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی۔ لیکن دادی کے دل کا ملال اس ذکر سے اور بڑھ جاتا کہ ان کے بیٹے کی ویران زندگی پوری کی پوری ان کی آنکھوں میں گھوم جاتی۔

"پیاری دادی جان! اب جبکہ ذکیہ دادی کو اس دنیا سے گزرے کئی سال ہوگئے ہیں تو اب یہ عداوت آپ کے دل میں کیونکر ہے۔" وہ دادی کو پکڑے بیٹھا تھا۔

"میرے دل میں کیسی عداوت... بس میرا جی نہیں مانتا۔" دادی کا ایک ہی جواب۔

"عائشہ چچی کا گناہ اتنا بڑا بھی نہیں تھا۔ اپنے حصہ کی سزا تو وہ کاٹ ہی چکیں۔ محبت ہی کی تھی نا انہوں نے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد انہوں نے پوری کوشش کی تھی اس گھر میں سیٹ ہونے کی۔ عبید چچا کو بھی اپنے دل میں گنجائش پیدا کرنی چاہیے تھی۔ محبت قربانی مانگتی ہے۔" شدت جذبات میں وہ کچھ زیادہ ہی اونچا بول رہا تھا۔

عبید چچا نہ جانے کیا کرنے آئے تھے۔ دروازے کی چوکھٹ تھامے ایک ایک لفظ سنا تھا انہوں نے اور پھر خاموشی سے پلٹ گئے۔

دادی سر جھکائے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتی رہیں۔ وہ دن یادداشت میں تازہ ہوگئے تھے۔ جب ابی چچا ساری دنیا سے چھپ کر راتوں کو بے آواز آنسوؤں سے روتے تھے اور وہ ان کے کمرے کے باہر ٹہلتے ہوئے ان کے آنسوؤں کو اپنے دل پر گرتا محسوس کرتی تھیں۔

"تم عبید سے خود بات کرلو۔" وہ یہی کہہ سکیں سعد سے۔

"میں یہ بھی کرلوں گا۔" اس کے لہجہ میں عزم تھا۔ عبید چچا کو قائل کرنا مشکل کام تھا اور اسی مشکل کام کو آسان بنانے کے لیے وہ مناسب الفاظ ترتیب دے رہا تھا کہ عبید چچا نے خود ہی دادی کو کہہ دیا کہ سعد جس کسی کو شادی میں بلانا چاہ رہا ہے بلالے۔ آپ منع مت کیجئے گا۔ ان کے اس واضح بیان کے بعد دادی کے پاس کسی پس و پیش کا جواز نہ تھا۔ عبید چچا نے اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کیونکر کرلیا۔ یہ سب کے لیے حیران کن تھا۔ سوائے عفیرہ کے جس نے عبید چچا جو کے کمرے میں جاکر چپکے سے سعد کی فارینہ سے شادی کے انکار کی اصل وجہ بتائی تھی۔ اس کا تو خیال تھا کہ عبید چچا دو منٹ میں سعد کے دماغ سے عشق کا بھوت اتار پھینکیں گے۔ لیکن انہوں نے تو ان لوگوں کو انوائیٹ ہی کرنے پر رضامندی ظاہر کردی تھی۔

عفیرہ تو اپنا اندازہ درست ہونے پر بہت پرجوش ہورہی تھی۔

"حیرت ہے... سعد ایسا تو نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں ایک سے ایک لڑکی تھی۔ لیکن سعد نے کبھی کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔" اس کی شرافت کی سب سے بڑی گواہ خود فارینہ تھی۔

"یہ دل کے معاملے ہیں، جس سے کیمسٹری مل جائے بندہ اسی کا ہوجاتا ہے۔" ماہین نے یہ فقرہ کل ہی پڑھا تھا۔ وہ اکثر پڑھے ہوئے اقوال بڑے ذوق و شوق سے گفتگو میں استعمال کرتی تھی۔

"اور ویسے بھی زین کے ساتھ اس کی دوستی تو دس، بارہ سال پرانی ہے۔ پھر عباد بھائی کی شادی میں اسے انہیں انوائیٹ کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔"

عفیرہ نے فارینہ کے لیے سوچ کا ایک در وا کیا تھا اور واقعی پھر فارینہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ بات جو صحیح تھی۔



مایوں کی رسم میں زین کے گھر سے سب ہی آئے تھے۔ سوائے عائشہ چچی کے۔ فنکشن چونکہ گھر پر ہی ارینج کیا گیا تھا۔ ریسپشن پر فارینہ، عفیرہ اور ماہین تھیں۔ مہرین نے اندر روتی دھوتی ثناء کو سنبھال رکھا تھا۔ جو آج کل دن میں چار مرتبہ یہ سیشن ضرور پورا کرتی تھی۔

"وہ دیکھو آگئے وہ لوگ" عفیرہ نے فارینہ کو پوری طاقت سے کہنی ماری۔ زین کے ساتھ عاطف بھائی کی مسز، زین کی دونوں چھوٹی بہنیں اور خزیمہ بھی تھی۔

"وہ ہے خزیمہ گرین سوٹ والی۔" اس نے فارینہ کو جلدی سے بتایا۔

"لڑکی تو اچھی ہے۔" فارینہ نے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ سعد نے بھی ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا، اسی لیے تیزی سے آگے بڑھا تھا۔

"دیکھو سعد کی پھرتیاں۔" عفیرہ بڑبڑائی۔

سعد مہمانوں کو لے کر ان ہی کے پاس چلا آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" عاطف بھائی کی مسز خاصی خوش اخلاقی سے ان لوگوں سے ملیں۔

"آج ہم اسپیشلی آپ سے ملنے آئے ہیں۔" انہوں نے فارینہ سے ملتے ہوئے کہا تو فارینہ کے ساتھ زین اور سعد بھی گڑبڑا گئے۔

"باقی لوگوں سے تو یہ مارکیٹ میں ملی تھیں نا۔ تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔" سعد نے فوراً وضاحت کی۔ فارینہ نے بھی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔

"بڑا ذکر سنا تھا آپ کا۔" زین کی بہن بھی فارینہ سے مخاطب ہوئی۔

"اچھا کیسا ذکر؟" عفیرہ نے انجان بنتے ہوئے ابرو چڑھائے۔

"بھئی، فاری کا اکیڈمک ریکارڈ اتنا زبردست تھا تو ہم اس سے امپریس ہوکر ہر وقت اسی کی باتیں کرتے تھے نا۔"

سعد نے ہی وضاحت کی۔ ساتھ ہی زین کو گھورنے کی بھی کوشش کی جو پوری توجہ سے جوتے کی نوک سے قالین کے بیل بوٹوں کو کرید رہا تھا۔ جیسے یہی کرنے یہاں آیا ہو۔

"فاری! تم ان لوگوں کو کمپنی دو۔ ہم ذرا لائٹنگ چیک کروا رہے ہیں۔" ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہوا سعد زین کا ہاتھ پکڑ کر باہر چل دیا۔

دادی تو سرسری سا ان سے مل کر ایک طرف ہوگئیں۔ امی اور چچی نے البتہ دیر تک ان کو کمپنی دی۔ آخر گھر آئے مہمان تھے اور یہی تہذیب کا تقاضا تھا۔ بہرحال دادی کا اتنا مل لینا بھی بڑی بات تھی۔ عبید چچا پوری تقریب میں ذرا سی دیر کو نظر آئے۔ جب وہ فوٹو سیشن کے لیے ثناء اور صارم کے ساتھ آکر بیٹھے تھے۔

ثناء کی رو رو کر آنکھیں اور ناک سرخ ہوچکی تھیں۔ پھر بھی زرد سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ صارم بھی ڈیسنٹ سا کچھ جھینپا جھینپا سا تھا۔

"تم اتنا کیوں رو رہی ہو۔ ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں ہی جانا ہے نا۔" عفیرہ نے قریب آکر اسے تسلی دی۔

"بلکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ یہاں ہم پانچ لوگ ایک کمرے میں رہتے تھے۔ وہاں تم اکیلی مزے کرنا۔ اپنی مرضی سے سونا جاگنا۔ تمہیں جلدی نیند آتی ہے نا، ہم لائٹ آف نہیں کرتے۔ تمہیں صاف کمرہ پسند ہے، ہم ہر وقت بکھیر کر رکھتے ہیں اور تو اور اپنی مرضی سے جب چاہے سیٹنگ بھی بدل سکتی ہو۔"

وہ صوفہ کی ہتھی پر چڑھی ثناء کے کان میں گھسی

ہوئی تھی۔ صارم اپنی اکلوتی بہن کی بے موقع تقریر پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"کہیں تمہارا ارادہ صارم کو بھی کمرے سے نکلوانے کا تو نہیں ہے۔" سعد بھی پیچھے ہی کھڑا تھا۔

"اف توبہ! ایک تو یہ ہر موقع پر دخل اندازی کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔" عفیرہ بے مزہ ہو کر وہاں سے اٹھ دی۔ ساری تقریب میں وہ سعد اور خزیمہ کو نظروں میں فوکس کیے رہی' لیکن کمال ہے بھئی بڑے پکے لوگ تھے۔ ایک بار بھی وہ ان کی چوری نہیں پکڑ سکی۔

شادی والے دن سب لڑکیوں کو عبید چچا کی جانب سے سخت وارننگ دی گئی تھی۔

"چاہے سارا دن تیاریاں کرتے رہو' لیکن سات بجے سے پہلے گاڑیوں میں بیٹھ جانا ہے۔" وہ لڑکیوں کی طول پکڑتی تیاریوں اور اس کے نتیجے میں پھیلی افراتفری سے بہت چڑتے تھے۔ یہ ان کی دی گئی وارننگ کا اثر تھا یا اتفاق کہ تمام لوگ وقت مقررہ پر تیار ہو چکے تھے۔ فارینہ ثناء کے ساتھ پارلر گئی ہوئی تھی۔

دادی کے ساتھ عفیرہ' مہرین' ماہین' سعد کی گاڑی میں تھیں۔

"مجھے تو زین بھائی کی پوری فیملی میں خزیمہ سب سے اچھی لگی ہے۔" عفیرہ نے نہ جانے کس بات کے جواب میں کہا تھا۔ سعد نے چونک کر بیک ویو مرر میں سے اسے دیکھا۔ وہ خزیمہ پر اس کی خاص نظر عنایت تمام فنکشنز میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ چونکہ میڈیکل کی تعلیم کے سلسلے میں اپنی بہن کے گھر رہائش پذیر تھی۔ سو تمام تقریبات میں اسے بھی مدعو کیا گیا تھا۔

"ہاں ماشاء اللہ پیاری بچی ہے۔" دادی نے بھی سادگی سے تعریف کی۔ "ڈاکٹر ہے' لیکن نخرہ نام کو نہیں۔"

"میں تو کہتی ہوں دادی کہ اپنے کسی پوتے کے لیے رشتہ مانگ لیں۔ ڈاکٹر بہو ہو گی تو بہت فائدہ ہو گا۔ امی' تائی اماں اور آپ کے ہر ماہ اتنے چکر لگتے ہیں ڈاکٹروں کے' گھر میں ڈاکٹر لے آئیں' بچت ہی بچت ہو گی۔" مفت مشورہ عفیرہ کی جانب سے آیا تھا۔

"تم خاموش نہیں رہ سکتیں۔" ماہین نے اسے ڈپٹا۔ دادی نے بھی سنی ان سنی کر دی' لیکن عفیرہ خوش تھی کہ سعد کے سامنے ہی اس نے دادی کو خزیمہ نامی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

"آخر دادی کو بھی تو پتا چلے کہ یہاں ہمارے گھر میں کون سی گیم چل رہی ہے۔" اس نے ماہین کے کان میں سرگوشی کی۔ ماہین نے گاڑی سے اترتے کے ساتھ ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"چار دن سے گھر میں آئی نازش تو تمہیں نظر ہی نہیں آ رہی' جو کسی نہ کسی بہانے سعد یا عادل کے گلے کا ہار بننے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔"

"اس کی تو نیچر ہی ایسی ہے۔ عادل تو میرا بھائی ہے۔ کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور سعد کی خیر ہے' وہ تو خود کسی کو نظروں میں بسائے ہوئے ہے۔" اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"چلو ذرا میسج تو کرو۔ ثناء اور فاری کب تک آ رہے ہیں۔" ماہین نے مہرین سے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں ثناء بھی آ گئی۔ ڈیپ ریڈ اور بوٹل گرین شرارے میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

"ہائیں! یہ میری بھابھی ہے۔" عفیرہ نے غش کھانے کی ایکٹنگ کی۔

"اچھا تم لوگ ثناء کے پاس رکو۔ میں سعد یا عادل کو دیکھتی ہوں۔ فوٹو گرافر نہیں آیا۔" فارینہ کو ہر چیز کی فکر رہتی تھی۔ وہ ایسی ہی ذمہ دار قسم کی لڑکی تھی۔

"السلام علیکم!" وہ تیزی میں گزر رہی تھی۔ جب زین نے اچانک کسی کونے سے نکل کر اسے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں زین بھائی۔" فارینہ نے رک کر خوش دلی سے جواب دیا۔ ایک عرصہ تک وہ سعد اور زین کی کلاس فیلو رہی تھی۔ سو اچھی سلام دعا تھی۔

"وہ میں سعد کو دیکھ رہی تھی۔ فوٹو گرافر کا پوچھنا تھا۔" فارینہ نے نظریں چاروں جانب دوڑائیں۔

"وہ ایکچوئیلی سعد کو شازمہ بھابھی نے نازش کے ساتھ گھر بھیجا ہے۔ ان کا جوتا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تبدیل کرنے گئی ہیں۔"

"اف یہ شازمہ بھابھی کے پرانے حربے۔" وہ جی بھر کر بے مزہ ہوئی۔

"اچھا... میں عادل کو دیکھتی ہوں۔"

"ایکسکیوزمی فارینہ۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" زین کچھ متذبذب سا تھا۔

"جی؟" فارینہ نے استعجاب سے اسے دیکھا۔

"آپ کو معلوم ہے' سعد نے آپ کے ساتھ شادی سے انکار کیوں کیا تھا؟" وہ تمہید باندھ رہا تھا۔

"اف خدایا۔ میری شکل پر کیا ہے جو ہر شخص مجھ سے ایک اسی موضوع پر بات کرتا ہے۔" فارینہ نے گہری سانس لی۔

"جی اندازہ تو ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ چڑ ہی تو گئی۔ اسی لیے صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"آپ اپنی رائے تو دے سکتی ہیں۔" زین کھل سا گیا۔

"دیکھیں میری رائے کوئی مانگے گا تو ضرور دوں گی۔ لیکن یہ فیصلے بڑوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ بہر حال ہوپ فار دا بیسٹ۔" وہ کہہ کر رکی نہیں اور زین اس واضح جواب پر جیسے کھل ہی گیا۔

"کیا ہوا؟ کیوں مسکرائے جا رہا ہے؟" سعد انتہائی چڑا ہوا واپس آیا تھا۔

"یار! میں نے فارینہ سے بات کی ہے۔ اسے کچھ کچھ... اندازہ ہو چکا ہے۔ لیکن اسے غصہ نہیں آیا۔"

"دماغ صحیح ہے۔ اسے کیسے اندازہ ہو سکتا ہے؟" سعد نے گھورا۔

"یقین کر... اس نے خود کہا ہے کہ یہ فیصلہ بڑے کریں گے۔ مجھے لگا ہے کم از کم وہ انکار نہیں کرے گی۔"

"یونیورسٹی کے چار سالوں میں تو اس سے بات کر نہیں سکا اور اب پانچ منٹ میں راضی کر لیا۔"

"ہاں' یہ تو واقعی حیرت انگیز بات ہے۔" زین خجل سا ہوا۔

"اچھا چل نکاح ہونے والا ہے۔ میں پہلے ہی ایک ڈرامہ بھگتا کر آ رہا ہوں۔" اس کا اشارہ نازش کی طرف تھا۔ اسی لیے اتنا بیزار تھا۔

"عفیرہ کی باتیں ہم مانیں نا مانیں ہوتی صحیح ہیں۔" فارینہ کے ذہن میں مسلسل زین کے الفاظ کی بازگشت ہو رہی تھی۔

نکاح اور رخصتی میں زیادہ وقت نہ لگا۔ مہمانوں کو رخصت کر کے ثناء کو سجی ہوئی گاڑی میں گھر لایا گیا۔ عفیرہ اس کی اکلوتی نند تھی' لیکن فاری' مہرین اور ماہین نے بھی اس کا استقبال کیا۔

"رخصت ہو کر اپنے ہی گھر واپس آنا کتنا خوب صورت لگتا ہے۔" عفیرہ نے با آواز بلند اظہار رشک کیا۔ "نہ ماں' باپ سے دوری' نہ بہن' بھائیوں سے جدائی۔ شادی ہو تو ایسی۔"

رات گئے رسموں سے فراغت پا کر وہ چاروں اپنے مشترکہ کمرے میں آئی تھیں۔ فارینہ چاہ رہی تھی کہ ان لوگوں سے زین کی بات ڈسکس کرے۔ پھر چپ ہو گئی۔ "عفیرہ نے نئے سرے سے سعد کے خلاف محاذ بنا لینا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"امی! چائے ملے گی۔" سعد نے صبح سویرے کچن میں جھانکا تھا۔

"ہاں ٹھہرو' بناتی ہوں۔" وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔

"میں بنا دیتی ہوں تائی اماں۔" عفیرہ برتن دھوتے ہوئے بولی۔

"ثناء کے جانے سے مشکل ہو گئی ہے نا آپ کو۔" سعد بھی اکلوتی بہن کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ انہیں دبئی گئے بیس روز ہو چکے تھے۔

"ہاں... لیکن مجھے یہ لڑکیاں کہاں کچھ کرنے دیتی

ہیں۔ آج عفیرہ اکیلی تھی تو میں کچن میں آگئی کہ بچی کیا کچھ سنبھالے گی۔" امی کے لہجہ میں ان سب کے لیے محبت تھی۔

"کیوں۔ فاری وغیرہ کہاں ہیں؟" سعد کو بھی گھر کے خالی پن کا احساس ہوا۔

"رات کو ہی تو گئی ہیں اپنے نانا کے ہاں ابھی دو چار روز ٹھہریں گی۔" امی بھی کرسی کھینچ کر سعد کے مقابل بیٹھ گئیں۔

"کیوں خیریت؟" سعد چونکا۔

"ہاں.... وہ مبشر بھائی آئے ہوئے ہیں نا کینیڈا سے۔" انہوں نے فاری کے ماموں کا نام لیا۔

"میرا خیال ہے کئی برس کے بعد آئے ہیں۔"

سعد نے عفیرہ کو دیکھا جو خاموشی سے چائے کے دو کپ امی اور اس کے آگے رکھ کر باہر چلی گئی تھی۔

"بچوں کی شادی کرنے لوٹے ہیں۔ بھابھی بتا رہی تھیں فاری کو مانگا ہے انہوں نے۔" امی نے کچھ جتاتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

سعد کو زبردست اچھو لگا۔ گرم گرم چائے حلق جلا گئی تھی۔

"لیکن امی! ان کے بیٹے کی ایج تو زیادہ نہیں، میرا خیال ہے عباد بھائی کے ساتھ کا ہے وہ۔" سعد کی یادداشت غضب کی تھی۔

"ہاں ہے تو.... لیکن ماشاءاللہ سرجن ہے۔"

"تو کیا چچا، چچی ہاں کردیں گے۔" سعد کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"ظاہر ہے، وہ تو راضی ہی ہیں۔ بس اماں کہہ رہی ہیں کہ فارینہ کو اتنی دور نہیں بھیجنا۔ کتنی خواہش تھی ہماری کہ ثناء کی طرح فارینہ بھی گھر کی گھر میں ہی رہ جائے، لیکن تمہارے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔" امی کا قلق اتنے دن گزرنے پر بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔

سعد نے امی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ پرسوچ انداز میں چائے کے کپ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔



"یہ نہیں ہو سکتا۔" ابی چچا اضطراری کیفیت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" سعد ایک بڑے محاذ کے لیے خود کو تیار کر کے عبید چچا کے پاس آیا تھا۔

"دیکھو سعد! زیادہ بحث نہیں کرو، میں نہیں سمجھتا کہ یہ مناسب ہو گا۔"

"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں ابی چچا! کہ آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں۔" سعد نے ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھو سعد! مجھے اپنے تمام بھتیجا بھتیجی بہت عزیز ہیں، لیکن فاری مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے۔ میں اس کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"کیسی آزمائش ابی چچا! میں بچپن سے زین کو جانتا ہوں۔ وہ نہایت شریف اور نیک اطوار کا حامل ہے اور فارینہ کو وہ کتنا پسند کرتا ہے۔ اس کا میں بھی گواہ ہوں۔ آپ اس سے مل کر تو دیکھیں۔" سعد کے لہجہ میں دبا دبا جوش تھا۔

"میں زین کی شرافت پر شک کر رہا ہوں، نہ عادات و اطوار پر۔ لیکن یہ جو پیار محبت کی باتیں ہیں نا یہ جوانی کا خمار ہوتی ہیں اور یہ خمار ایک بار اتر جائے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔" ان کے چہرے پر ہلکی سی سرخی در آئی۔

"یہ تو آپ کا تجربہ ہے نا اور ضروری تو نہیں کہ ہر کسی کے ساتھ ایسا ہی ہو۔" سعد نے بے رحم تبصرہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ میری ناکام ازدواجی زندگی کا خمیازہ فارینہ کو بھگتنا پڑے۔ وہ لوگ اتنی آسانی سے فارینہ کو نہیں اپنائیں گے اور یہ بات یاد رکھو کہ فارینہ بے خبر ہے تو اسے اس معاملہ کی خبر ہونی بھی نہیں چاہیے۔ کوئی آپ کو چاہتا ہے یہ احساس دل میں امنگیں پیدا کرتا ہے اور کیا فائدہ ایسی امنگوں کا جو بار آور ثابت نہ ہوں۔" انہوں نے اپنے تئیں سعد کو قائل کیا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ فاری بے خبر نہیں ہے تو۔" سعد نے ان کی باقی بات سنی ہی نہ تھی۔

"کیا مطلب ہے؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ فاری انوالو

نہیں ہے۔" وہ چونکے۔

"ہاں۔۔۔ وہ انوالو نہیں ہے۔ لیکن بے خبر بھی نہیں۔ زین نے ثناء کی شادی میں اس سے اس کی رضامندی چاہی تھی۔" سعد نے گویا دھماکہ کیا۔

"پھر کیا کہا فارینہ نے؟" معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ جتنا کہ وہ سمجھ رہے تھے۔

"ظاہر ہے ابی چچا! فاری نے بڑوں کی رضامندی سے اس معاملہ کو مشروط کیا ہے۔"

"سعد! تمہیں یہ بات اتنا بڑھنے ہی نہیں دینا چاہیے تھی۔" وہ غصہ میں آگئے۔ "اول تو زین کے بڑے اس کا رشتہ مانگنے آئیں گے ہی نہیں اور اگر زور زبردستی مانگ بھی لیا تو اس گھر میں فاری کا کیا مقام ہوگا جہاں۔۔۔" ابی چچا شدید طیش کی حالت میں بات ادھوری چھوڑ کر کھڑکی میں آکھڑے ہوئے۔

"اگر میں کہوں کہ وہ لوگ راضی ہیں تو۔۔۔؟" سعد ان کے پیچھے اٹھ آیا۔

"ناممکن۔۔۔" وہ ماننے کو تیار نہ تھے۔

"آپ ہر بات خود سے کیوں فرض کرلیتے ہیں ابی چچا۔" سعد جھنجلا گیا۔ "اب حالات وہ نہیں ہیں۔ آپ کا معاملہ بگڑا اس میں دو فریق زیادہ قصوروار تھے، ایک ذکیہ دادی اور۔۔۔" اس نے توقف کیا۔

"اور دوسرے آپ۔۔۔" سعد کی آواز دھیمی ہوگئی۔ "ذکیہ دادی اب اس دنیا میں رہی نہیں اور رہ گئیں عائشہ چچی تو وہ اپنے حصہ کی سزا کاٹ چکیں۔ ان کو ہم پورے عزت و احترام سے واپس لے کر آئیں گے۔" سعد کے لہجہ میں عزم تھا۔

"ہاں دنیا میں مذاق بنواؤ گے میرا۔ یہ زندگی ہے، کوئی ایڈونچر نہیں۔" وہ آگ بگولہ ہوگئے۔

"زندگی ہے۔ جب ہی تو یہ بات کررہا ہوں۔ کیا قصور ہے اس عورت کا جو پندرہ برس سے آپ کے نام پر اپنے گھر بیٹھی ہے۔" سعد تلخ ہوا۔

"اور یہ بات میں فارینہ اور زین کے رشتہ کی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔ ان کی قسمت میں ملاپ ہوا تو کوئی نہیں روک سکتا۔ میں ایسا صرف آپ کی اور عائشہ چچی کی ویران زندگی کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔ یقین کریں ابی چچا میں جتنی بار بھی ان سے ملا ہوں، وہ ہر بار اتنی محبت سے ملتی ہیں اور ایک ایک شخص کا نام لے کر احوال پوچھتی ہیں کہ میں شرمندہ ہوجاتا ہوں۔ سچ بتائیں ابی چچا! آپ کو اس معاملہ میں اپنی کوئی غلطی کبھی نظر نہیں آئی۔ آپ سے منسوب ہونے سے پہلے اگر ان کے دل میں کسی کے لیے محبت تھی بھی تو انہوں نے آپ کی زندگی میں داخل ہونے کے بعد کبھی آپ کے ساتھ خیانت تو نہیں کی۔ آپ کی محبت کی قدر کرتی تھیں اور شاید محبت بھی کرتی تھیں کہ آج تک آپ کے نام پر بیٹھی ہیں۔ چاہتیں تو خلع لے کر اپنی مرضی سے شادی کرسکتی تھیں۔ لیکن آج تک اسی آس میں ہیں کہ آپ کو کبھی تو اپنی زیادتی کا احساس ہوجائے گا۔ آپ نے بہت برا کیا ابی چچا بہت برا۔"

سعد تاسف سے سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ ابی چچا ساکت کھڑے اس کے الفاظ کی بازگشت سنتے رہے۔

☼ ☼ ☼

تین راتوں سے ابی چچا سوئے نہیں تھے۔ آنکھیں بند کرتے ہی ایک فلم سی چلنے لگتی بند آنکھوں کے سامنے۔ ان کا غصہ شروع دن سے ہی خاندان میں مشہور تھا۔ مزاج میں رعونت نہیں تھی، لیکن جو کہہ دیتے، اس سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ ساری زندگی بیوی کے بغیر گزار دی۔ اب پینتالیس برس کی عمر میں بیوی کو لے کر آوں۔ وہ بار بار نہ جانے کیوں اس امکان کو سوچ سوچ کر جھنجلا رہے تھے۔

"عائشہ نے خلع کیوں نہیں لی۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

عجیب کشمکش تھی، وہ جتنا سوچوں سے چھٹکارا چاہ رہے تھے اتنا ہی دل و دماغ الجھتا جارہا تھا۔

"پینتالیس برس کو ہوگیا ہوں۔ زیادہ گزر گئی جو باقی ہے وہ بھی گزر جائے گی۔" وہ کمرے کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر نکل آئے۔

میں بچوں کی بات کو اتنا سیریس کیوں لے رہا ہوں۔ جب یہ معاملہ نیا نیا تھا اور خاندان برادری کا ہر قابل ذکر شخص ان کو منانے کی کوشش کرتا تھا تو تب تو انہوں نے ایک بار بھی عائشہ کے لیے واپسی کے دروازے نہیں کھولے۔ اب کیوں بے چینی ہورہی ہے۔

"اس لیے کہ اللہ اور رسول کو گواہ بنا کر ایک جیتے جاگتے وجود کو زندگی میں شامل کیا تھا اور پھر یکطرفہ فیصلہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ ان پندرہ برسوں کا اگر روز قیامت اس نے حساب مانگ لیا تو؟"

اندر سے ابھرتی آواز نے ان کو منجمد کرڈالا۔ خوف سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ دور کہیں موذن نے فجر کی اذان دینا شروع کی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں آگئے۔ اس روز سجدہ میں جاکر انہوں نے اللہ سے اپنے ہر عمل اور کردہ، ناکردہ گناہوں کی معافی طلب کی تھی۔

☼ ☼ ☼

عبید چچا کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ پورا گھر جیسے زلزلوں کی زد میں آگیا۔ ان کو تو کبھی دل کی معمولی سی تکلیف بھی نہیں ہوئی تھی۔ دادی کے آنسو خشک نہیں ہورہے تھے۔ سعد کو پشیمانی نے آگھیرا۔ ان کے دل میں مچی اکھاڑ پچھاڑ کا اصل ذمہ دار تو وہی تھا۔

"معمولی سا اٹیک ہے۔ اسٹریس کے زیر اثر ہیں۔ اسٹریس ریلیز ہوگا تو جلد نارمل ہوجائیں گے۔" ڈاکٹرز نے تسلی بخش صورت حال قرار دی تھی۔

سعد نے زین کو فون کرڈالا۔ اسٹریس اس وقت تک رہنا تھا جب تک عبید چچا فیصلہ کرنے کی کشمکش میں رہتے اور یہ فیصلہ آسان سعد کو ہی بنانا تھا اور اس میں اسے زین کی مدد چاہیے تھی۔ آگے کا کام زین نے سنبھالا۔

ذکیہ دادی کی وفات کے بعد دونوں بہوئیں گھر کے معاملات میں آگے بڑھی تھیں۔ دونوں ہی ساس کے برعکس تھیں۔ عائشہ چچی کو سمجھانے میں زین کے ساتھ ساتھ زین کی امی، چچی اور عاطف بھائی کی مسز کا بھی کافی ہاتھ تھا۔ ان کے دل میں عبید چچا کے لیے بہت گلے شکوے تھے۔ لیکن لاڈلے بھتیجے زین نے جس کو انہوں نے اولاد کی طرح چاہا تھا۔ ابی چچا کے دل کی توڑ پھوڑ کی ایسی منظر کشی کی کہ عائشہ چچی کے کرچی کرچی دل میں بھی ہمدردی کا احساس جاگا۔ ازدواجی زندگی کی ناکامی کے بعد انہوں نے دین سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ دین کی رہنمائی بھی گھر کو بنانے کی طرف تھی۔ سو جب امی، ابو اور دادی ان کو لینے آئے تو بغیر کسی رد و کد کے وہ بن باس کو خیرباد کہہ کر اپنے گھر لوٹ آئیں۔

سعد اکیلا یہ محاذ نہیں سنبھال سکتا تھا۔ سو اس نے تمام لوگوں کو اعتماد میں لیا تھا اور یوں جو فیصلہ عبید چچا خود نہیں کرپا رہے تھے وہ ان سب لوگوں نے مل کر کردیا تھا۔ عبید چچا نے بھی سب کے سامنے عائشہ چچی کا ہاتھ تھام کر ان سے معافی مانگی تھی۔ عائشہ چچی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے مسکرا دی تھیں۔

"لو بھئی عبید چچا کو بڑھاپے میں ہیرو بننے کا شوق سوار ہوگیا۔ پوری دنیا کے سامنے بیگم کے ہاتھ تھامے بیٹھے رہے۔" شازمہ بھابھی لاؤنج میں بیٹھی ہنسی اڑا رہی تھیں۔ ابی چچا کے سامنے تو کچھ نہیں بول سکیں۔ لیکن پیٹھ پیچھے تمسخرانہ انداز میں فقرے اچھال رہی تھیں۔

"بائی داوے کس کو بوڑھا کہہ رہی ہیں؟" عفیرہ نے تیکھی نظروں سے انہیں گھورا۔ "آپ کے شوہر نامدار سے محض دس برس بڑے ہیں عبید چچا اور اسمارٹ یقیناً عباد بھائی سے زیادہ ہی ہیں جن کو فاسٹ فوڈ کھلا کھلا کر آپ نے عدنان سمیع بنا دیا ہے۔"

"واہ۔" سعد جھوم گیا۔ "کبھی کبھی تو یہ لڑکی دل خوش کردیتی ہے۔"

شازمہ بھابھی کا موڈ تو ایسا خراب ہوا کہ کئی دنوں تک کسی سے بات نہیں کی۔ صرف عباد بھائی کا دماغ کھایا اور جب کئی روز کے بعد بات کی بھی تو۔۔۔ بات بھی کیا تھی شوشہ چھوڑا تھا۔ نازش کے لیے سعد کا رشتہ طلب کیا تھا۔ سعد تو لاہور گیا ہوا تھا۔ باقی اہل

خانہ اچھل پڑے۔

"یا اللہ! ایبک ہاؤس کو خوشیاں راس کیوں نہیں آتیں۔" ماہین نے ٹھنڈی سانس بھری۔ تائی اماں پریشان تھیں کہ عباد بھائی اس رشتہ پر اپنی رضامندی ظاہر کر چکے تھے۔

"کیا کروں اماں! دوسری بہو بھی شازمہ جیسی لے آوں۔" تائی اماں رو دی تھیں۔ کیونکہ عباد بھائی' ابو کی برین واشنگ میں لگے تھے۔

"ابو آپ کو تو پتا ہے شازمہ کی نیچر کا۔ کوئی اور بہو آگئی تو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے رکھے گی۔ گھر تقسیم ہو جائے گا۔ دونوں بہنیں ہوں گی تو ہم بھائی بھی اکٹھے رہیں گے۔" ان کا بیان اس قدر رقت آمیز تھا کہ ابو بھی سوچ میں پڑ گئے۔

"تائی اماں! میرے ذہن میں آئیڈیا ہے۔" عفیرہ بڑی دل سوزی سے تائی اماں کو آنسو بہاتے دیکھ رہی تھی' ایک دم اچھلی۔

"سعد بھائی خزیمہ کو پسند کرتے ہیں نا۔ ان کے گھر چلتے ہیں۔ آپ عباد بھائی سے کہہ دیں کہ بہت پہلے سے آپ نے سعد کے کہنے پر خزیمہ کے والدین سے بات کر رکھی ہے۔ وہ ناراض تو ہوں گے۔ لیکن کچھ کر نہیں سکیں گے۔ تایا ابو کو بھی آپ کہہ دیں کہ سعد خزیمہ کے سوا کسی سے شادی پر راضی نہیں۔ ویسے بھی دیکھیں نا خزیمہ میں برائی بھی کوئی نہیں۔ ڈاکٹر بھی بن رہی ہے' خوب صورت اور اسمارٹ بھی ہے اور سب سے بڑھ کر سعد کے دل کی پسند ہے۔"

سعد کی خوش قسمتی کہ اس بار عفیرہ کے دل میں اس کی ہمدردی جاگی تھی۔ تائی اماں نے دادی اور چچی سے مشورہ کیا۔ سب کے خیال میں خزیمہ نازش سے بدرجہا بہتر تھی۔ عفیرہ نے فون ملا کر تائی اماں کے ہاتھ میں تھمایا۔ انہوں نے خزیمہ کی والدہ سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ اگلے روز بڑی خاموشی سے امی' تائی اماں اور دادی خزیمہ کے گھر چلی گئیں۔

شازمہ بھابھی بے فکر رہیں۔ اپنے طور پر وہ شطرنج کی بساط پر اپنی چال چل چکی تھیں۔

عادل آفس سے لوٹا تو فارینہ کی زبانی سارے معاملے کا علم ہوا۔ اس سے مارے رنج کے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ جھٹ سعد کا نمبر ملایا۔

"اگر تو خزیمہ کو پسند کرتا تھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔" وہ وہیں فارینہ کے سامنے سعد پر چڑھائی کر رہا تھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟" سعد میلوں دور تھا' لیکن عادل کی بات پر اچھل پڑا۔

"صحیح کہہ رہا ہوں۔ گھر والوں کو خزیمہ کے ہاں بھیج کر تو انجان بن رہا ہے؟"

"کس نے بھیجا ہے اور کیوں بھیجا ہے؟" سعد پریشان ہوا۔

"دادی' چچی اور تائی اماں گئی ہیں تیرا رشتہ لے کر۔" عادل نے الفاظ چبائے۔ جس کو محرم راز بنایا تھا وہی دغا دے گیا۔ اس نے فون بند کر کے صوفہ پر اچھال دیا۔ فارینہ ہکا بکا رہ گئی۔

"عادل اور خزیمہ! اوہ مائی گاڈ۔" اس نے فوراً" امی کا نمبر ملا کر مختصراً" یہ بات ان کے گوش گزار کی۔ شکر ہے ان لوگوں نے اب تک رشتہ کی بات نہیں چھیڑی تھی۔ لاکھ جتنوں سے امی نے دادی اور بھاوج کو اشارے کنایوں میں آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ تائی اماں تو کچھ نہ کچھ سمجھ رہی تھیں۔ لیکن دادی بڑے جوش و خروش سے سعد کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔

نماز کا کہہ کر دادی کو وہاں سے اٹھایا اور دوسرے کمرے میں جا کر انہیں بتایا۔ پھر تو دادی ایسی چپ ہوئیں کہ واپسی کے وقت تک کچھ نہیں بولیں اور یوں یہ وفد بغیر کوئی بات کیے لوٹ آیا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کس نے کہا تھا کہ میرا رشتہ طے کرواؤ۔" سعد بڑی دیر سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ عفیرہ اور فارینہ اس کے کمرے میں ہی تھیں۔ عفیرہ کافی دیر سے اس کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

"عادل خزیمہ کو پسند کرتا ہے۔" یہ واقعی اس کے لیے بریکنگ نیوز تھی۔

"عادل تو تمہارا بھائی ہے۔ وہ تو کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا' ایک میں ہی فارغ ہوں یہاں پر لڑکیاں تاڑنے کے لیے۔"

اف! اس شخص کے کان کتنے تیز ہیں۔ اس دن والی بات کیسے دل میں رکھی ہوئی تھی۔

"اچھا بابا! غلطی ہو گئی۔ ایک تو میں نے تمہارا بھلا کیا تھا۔ اوپر سے ایک گھنٹہ سے سنائے جا رہے ہو۔" عفیرہ اس سے زیادہ کسی کی نہیں سن سکتی تھی۔

"اب کرو گے نا' نازش سے شادی تو پتا چلے گا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں دو دن کا بچہ نہیں جس کو مار پیٹ کر نازش سے شادی کروا دی جائے گی۔ تم میری فکر چھوڑو اور آئندہ ایسی کوئی حماقت کرنے سے پہلے کسی سے مشورہ کر لیا کرو۔"

سعد نے گویا لاسٹ وارننگ دی تھی۔ وہ سر جھٹکتی کمرے سے نکل گئی۔ ابھی اس نے عادل کے پاس جا کر بھی حساب برابر کرنا تھا۔ جس نے بھائی ہو کر بھی اسے اپنے دل پر ہونے والی واردات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔



زین کے گھر والے آئے تھے' فارینہ کا رشتہ لے کر۔ سعد کی کوششوں کو کنارہ مل گیا تھا۔ فارینہ انگشت بدنداں تھی۔ زین اس کو پسند کرتا ہے یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ خوشی کے احساس نے دل کو چھوا تھا۔ ساتھ ہی ثناء کی شادی میں ہونے والی زین سے اپنی گفتگو یاد آئی تو خوب شرمندگی ہوئی۔ کیسے مزے سے کہہ دیا تھا کہ بڑے جو فیصلہ کریں۔ اس کا دماغ تو ان دنوں عفیرہ کے چلائے گئے چکر کے گرد ہی گھوم رہا تھا۔

"تو یہ تھی ساری کہانی اور تم اپنے نازک دماغ کو کہاں کہاں کھپا رہی تھیں۔" ثناء اسکائپ پر ان لوگوں سے مخاطب تھی۔

"ہاں۔۔۔ تم بھی مجھے سناؤ۔ ایک وہ تمہارا بھائی ہے۔ وہ بھی ہر وقت طنز کرتا رہتا ہے۔" عفیرہ برامان گئی تھی۔

"نہیں بھئی۔ ہم کون ہوتے ہیں تمہیں سنانے والے۔ ہم تو کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں۔" ثناء بلاوجہ ہی مسکرا رہی تھی۔ ماہین اور مہرین بھی ہنسنے لگیں۔ عفیرہ نے مشکوک نظروں سے انہیں گھورا۔

"اب تم لوگ مجھے بے وقوف بنانے لگے ہو۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ ہم یہ کام کیوں کریں گے۔ ہم قدرت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کرتے۔" ماہین نے گھسا پٹا فقرہ بولا۔

"اچھا بھئی! اب عفیرہ کو مزید تنگ مت کرو۔ اس کو اصل بات بتا دو' تاکہ اس کے من میں بھی لڈو پھوٹیں۔" فاری نے عفیرہ کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کیے۔

"کیا بات ہے' تم لوگ اتنے پراسرار کیوں ہو رہے ہو۔ کیا میں پھپھو بننے والی ہوں۔" اس نے ثناء کے کھلے کھلے چہرے سے کچھ اور ہی اندازہ لگایا۔ ثناء جھینپ گئی۔ صارم وہیں ساتھ بیٹھا آفس کا کام کر رہا تھا۔ عفیرہ کی بات پر اس نے ثناء کو بغور دیکھا۔

"ہائیں! یہ گڈ نیوز تو تمہیں سب سے پہلے مجھے دینی چاہیے تھی۔" اس نے فائل بند کر دی۔

"توبہ ہے صارم! میں عفیرہ سے عفیرہ اور سعد کے رشتہ کے متعلق بات کر رہی تھی۔" ایک تو ان دونوں بہن' بھائیوں کے دماغ بھی ایک ہی سمت میں چلتے ہیں۔ وہ صارم کو گھورنے لگی۔

"بی بی! ہم تمہیں سعد کے لیے مانگ رہے ہیں۔" ثناء نے اندر کی بات باہر نکال ہی دی۔

عفیرہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔

"کیوں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔" ماہین نے ابرو چڑھائے۔

"تمہیں صارم بھائی نے پسند کر کے شادی کی۔ فاری کو زندگی میں شامل کرنے کے لیے زین بھائی نے اتنے

پارٹ بیلے اور میں یونہی تمہارے سڑیل اور بد مزاج بھائی کی بیوی بن جاؤں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔" وہ ناراضی سے کہتی ہوئی وہاں سے واک آوٹ کر گئی۔

امی کے پاس آئی۔ خبر واقعی سچی تھی۔ تائی اماں نے باضابطہ طور پر اس کا رشتہ مانگا تھا۔

"امی! یہ وٹہ سٹہ بڑی غلط چیز ہے۔ وہ لوگ ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے امی کو ورغلانا چاہا' لیکن کمال کی ذہنی ہم آہنگی تھی' اس گھر کی خواتین کے مابین۔ انہوں نے ایک لمحہ میں اسے وہاں سے اٹھا دیا۔ دادی کے پاس پہنچی تو انہوں نے فٹ سے لپٹا کر پیار کیا۔

"ارے ہمارے تو ذہن میں ہی نہیں آیا تھا جب اس نے فاری سے انکار کیا تھا کہ تمہارا نام لے کر دیکھیں۔ لیکن کتنا سعادت مند بچہ ہے۔ میری زبان سے یوں ہی تمہارا نام نکل گیا۔ فوراً" راضی ہو گیا۔ بالکل بھی چوں چرا نہیں کی۔" دادی پوتے کی سعادت مندی پر نہال تھیں۔ وہ بے مزہ ہو کر اٹھ گئی۔

"چوں چرا نہیں کی تو کیا ہوا پسند بھی تو نہیں کرتا۔ میں بغیر ارمانوں کے کسی بندے کی زندگی میں شامل نہیں ہو سکتی۔

شام کو سعد سے ہی بات کروں گی۔" اس نے دل میں پکا ارادہ کیا۔

"تم بے وقوفی کر رہے ہو سعد۔" وہ سعد کے کمرے کا دروازہ کھولنے لگی تھی کہ اندر سے آتی عباد بھائی کی آواز پر ہاتھ وہیں رک گیا۔

"میں کوئی بے وقوفی نہیں کر رہا۔ میں امی اور دادی کی خواہش پوری کر رہا ہوں۔"

"یہ امی اور دادی بھی نا۔ محض شازمہ کی ضد میں آ کر ایسا کر رہی ہیں۔ تم دیکھو سعد! نازش سے شادی کی صورت میں ہم دونوں بھائی ہمیشہ اکٹھے رہ سکتے ہیں۔"

"آئی ایم سوری عباد بھائی' اگر ہم دونوں بھائیوں کے اکٹھا رہنے کی یہی شرط ہے تو میری طرف سے معذرت۔"

"تمہیں آخر نظر کیا آیا ہے اس بے وقوف لڑکی میں؟" اف عباد بھائی اس کے لیے اس لہجہ میں بات کر سکتے ہیں۔ وہ پانی پانی ہو گئی۔

"اخلاص... ہمدردی اور بے غرضی' یہی نظر آیا ہے مجھے اس بے وقوف لڑکی میں..." سعد نے ایک لمحہ کا بھی توقف کیے بغیر جواب دیا۔

"وہ لڑکی جو خاندان کے ہر ایک شخص کی خوشیوں کے لیے تگ و دو کر سکتی ہے۔ وہ یقیناً" میری زندگی میں بھی سکون کا باعث بنے گی۔"

سعد کے لہجہ میں اس کے لیے یقین تھا۔ وہ وہیں سے واپس پلٹ گئی۔ دل پر دھرا بوجھ ذرا سا سرک گیا تھا۔

تائی اماں اس بار کچا کام نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔ شازمہ کی تلوار بدستور موجود تھی۔ اس لیے انہوں نے منگنی کے بجائے ڈائریکٹ شادی پر زور دیا۔ زین اور فارینہ کا بھی نکاح طے پایا گیا تھا۔ ایک ہاؤس میں ایک بار پھر ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

دلہن بنی عفیرہ کا حسن نگاہوں کو مبہوت کر رہا تھا۔ سعد نے کئی بار کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ ابٹن مایوں والے روز بھی وہ اسے بہت خوب صورت لگی تھی۔ کمال ہے اپنے آپ سے ہمیشہ بے نیاز رہنے والی اس لڑکی پر اتنا روپ آسکتا ہے۔

اس نے کبھی عفیرہ کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دلہن بنا روپ اسے حیران کر گیا تھا۔ دل میں کہیں گھنٹی سی بجی تھی۔ اس نے تو صرف سیرت کو ترجیح دی تھی۔ صورت اس کو بن مانگے مل گئی تھی۔

عفیرہ کئی دنوں سے چپ تھی۔ سعد کی باتوں سے دل پر چھائی کثافت کچھ تو دور ہو گئی تھی۔ لیکن محبت کی کمی کا احساس اسے بدستور تھا۔

سب کی چھیڑ چھاڑ اور رسموں سے فراغت کے بعد وہ سعد کے کمرے میں پہنچا دی گئی۔ آنے والے لمحوں کا سوچ کر ہاتھ یخ ہو رہے تھے۔ سعد کمرے میں پہنچا تو وہ سر جھکائے بیڈ شیٹ کے ابھرے ہوئے پرنٹ کو انگلی کی پوروں سے محسوس کر رہی تھی۔

"کمال ہے... آج تو یہ میرا کمرہ لگ ہی نہیں رہا۔" سعد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی باآواز بلند تبصرہ کیا۔ وہ چونک گئی۔

"کمرے کا خوابناک ماحول' پھولوں کی بھینی بھینی سی خوشبو اور اس پر مستزاد ایک خوب صورت سی بیوی' کیا رومانٹک منظر ہے۔" وہ بلاوجہ ہی شوخ ہو رہا تھا۔ عفیرہ کی نگاہیں کچھ اور جھک گئیں۔

"کیا ہوا... اداس ہو؟" سعد کی نظروں سے اس کا اترا چہرہ مخفی نہ رہ سکا۔

"نہیں۔" اس نے بدقت گردن ہلائی۔

"گڈ... اداس ہونا بھی نہیں۔ کیونکہ رخصتی کے بعد اپنے ہی گھر میں آنا خاصا خوش گوار ہوتا ہے اور تمہیں تو ویسے بھی خوش ہونا چاہیے کہ وہاں تم پانچ لڑکیاں ایک روم شیئر کرتی تھیں۔ یہاں تم اکیلی مزے کرنا۔ اپنی مرضی سے سیٹنگ ویٹنگ چینج کرتی رہنا۔ دیر تک جاگنا ہو تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ہرگز لائٹ آف نہیں کروں گا۔ بلکہ دونوں مل کر جاگا کریں گے۔"

ایک تو اس کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔ نہ جانے کیا کیا باتیں یاد کرے گا۔ عفیرہ کو لگا وہ طنز کر رہا ہے۔ جھٹکے سے سر اٹھایا تو اسے مسکراتی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ تسلی سی ہو گئی۔

"ظاہر ہے اب یہ میرا کمرہ ہے تو میں اپنی مرضی سے ہی رہوں گی' فکر نہ کریں۔" وہ زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

"ہاں... یہ تو ہے۔" سعد نے سر کھجایا۔

"آپ کسی اور سے شادی کرنا چاہتے تھے نا؟" اس سے زیادہ دیر تک صبر نہ ہوا۔ کئی دفعہ کا سوچا ہوا سوال بلا ارادہ ہی لبوں سے برآمد ہوا تھا۔ فارینہ اور زین کا قصہ ختم ہونے کے بعد بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

"قطعاً" نہیں... نہ تم سے نہ کسی اور سے' میں فی الحال شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"پھر کیوں کی؟ کوئی زبردستی تھی کیا۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"زبردستی کوئی مجھ سے نہیں کر سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ تو پوری زندگی کا معاملہ تھا۔ بس مجھے لگا کہ جب تک میری شادی نہیں ہو گی شازمہ بھابھی اور عباد بھائی' امی کو پریشان کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایشو بناتے ہی رہیں گے۔ سو میں نے فٹافٹ شادی کا پروگرام بنا ڈالا۔ رہا سوال تمہاری ذات کا تو میں نے سوچا کہ جو لڑکی محض اپنی کزن کی خاطر میری چھپ چھپ کر جاسوسی کر سکتی ہے۔ میرے دن رات پر نظر رکھ سکتی ہے۔ وہ یقیناً" ایک دلچسپ ہم سفر ثابت ہو گی' بس دادی نے لڑکی کا نام پوچھا۔ میں نے تمہارا نام لے دیا اور یوں تم آج یہاں اتنا پیارا سا روپ لیے بیٹھی ہو۔"

سعد ہلکے پھلکے انداز میں وضاحت کرتا ذرا سا رومانٹک ہوا تھا۔

"آپ نے فاری اور زین بھائی کے متعلق پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"بتا دیتا تو تمہاری خداداد صلاحیتیں کیسے سامنے

آتیں۔ پہلے تو فاری کے ساتھ میرا رشتہ جڑوانے کی کوشش کی' وہاں سے بچ نکلا تو پورا وفد خزیمہ کے ہاں بھجوا دیا۔ تمہارا بھائی تو کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک میں ہی پورے جہان میں فارغ تھا جسے لڑکیوں کو نظر میں رکھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔"

"ہاں تو ظاہر ہے' جتنی مشکوک حرکتیں آپ کرتے تھے تو میں نے ایسا ہی کہنا تھا۔ ایک بار میں نے خود سنا تھا آپ فون پر کہہ رہے تھے کہ مجھ پر یقین کرو نہ کرو' اپنی محبت پر تو یقین ہے نا۔ بھلا ایسی بات سننے کے بعد میں نے آپ کو ایسا ہی سمجھنا تھا نا۔"

"ایسا مطلب کیسا؟" اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک اس کے خوب صورت کٹاؤ دار ہونٹوں پر بہت جچ رہی تھی۔

"مطلب... لڑکیوں میں دلچسپی رکھنے والا' پیار محبت کرنے والا۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"پیار محبت تو میں کرتا تھا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "اپنے گھر والوں سے' بہن بھائیوں سے کزنز سے جن میں تم بھی شامل تھیں۔"

"مجھ سے تو کوئی نہیں کرتے تھے۔ ہر وقت غصہ کرتے رہتے تھے۔" ایک اسی چیز کا تو قلق تھا۔

"تم بھی تو مجھے سڑیل' ہلاکو خان' خود غرض اور پتا نہیں کیا کچھ کہتی تھیں۔ لیکن خیر میرا خیال ہے یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ اس لیے باقی حساب بعد میں کرلیں گے۔ ورنہ تم نے ساری زندگی پھر یہی طعنہ دینا ہے کہ زین نے فارینہ کو اپنے جذبوں کی داستان سنائی' ثناء کو صارم نے اپنی محبتوں سے آگاہ کیا اور میرا شوہر مجھے منہ دکھائی دینا بھی بھول گیا۔"

وہ یکدم سیدھا ہوا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ وہ اس کی ہر بات سے واقف تھا۔ پتا نہیں مخبر کون تھا۔

نازک سا بریسلٹ اس کی کلائی میں پہناتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ یہ بریسلٹ کافی نفیس ہے۔ لیکن اس کی اصل خوب صورتی تمہاری کلائی پہ سج کر نظر آرہی ہے۔"

"یہ ڈائیلاگ آپ نے کہاں سے یاد کیا ہے؟" وہ بھی اس کی عادتوں سے بخوبی واقف تھی۔ سو اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ غیر محسوس انداز میں نکالتے ہوئے اس نے خود کو ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔

"یاد تو اور بھی بہت سے فقرے کیے تھے' لیکن تمہارے سوال جواب کے سیشن نے سب ذہن سے نکال دیا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا تو عفیرہ شرمندہ ہوگئی۔ سعد پرشوق نظروں سے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

"اب ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ نروس ہوئی۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب سی ہوئی تھی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم شرماتی ہوئی کتنی پیاری لگتی ہو۔"

"مذاق اڑا رہے ہیں۔" اس نے ساری شرم بھلا کر مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ماضی کی عادتیں جاتے جاتے ہی جاتی تھیں۔

"اف خدایا! لڑکی اب ایک رومانٹک فقرہ بول کر دس منٹ تک اس کا وضاحتی بیان دینا پڑا کرے گا کیا۔" سعد کو انتہائی صدمہ ہوا۔

"جی نہیں اب ایسی بھی بات نہیں۔ مجھے لوگوں کو پرکھنا آتا ہے۔" اس نے تفاخر آمیز انداز میں کہا تو سعد عش عش کر اٹھا۔

"بالکل' بالکل اس کا تو مجھے ذاتی تجربہ ہے۔"

اس نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی تو عفیرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ شفاف اور بے ریا ہنسی جس کے پیچھے خدشات نہیں تھے' کیونکہ سعد کی آنکھوں میں جھلملاتا اس کا عکس اس کے دل کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔





حنا یاسمین



"اتنی برائیاں ہیں مجھ میں' اچھا ہوتا کہ اس دنیا میں میرا وجود ہی نہ ہوتا۔" عفیرا نے چوتھی دفعہ یہ جملہ بولا۔

"میری قسمت جو پھوٹنا تھی۔ اس لیے تجھے پیدا تو ہونا ہی تھا۔"

بس کہنے کی دیر تھی' انتہائی دل سوز انداز سے اٹکے ہوئے آنسو باہر نکلے اور رونا شروع۔ عذیر نے بے زاری سے ہلتی ہوئی چارپائی کو دیکھا۔ جہاں بارہ من بوجھ ہل ہل کر اس کی چیخیں نکلوا رہا تھا۔

"آہستہ نہیں رو سکتی۔ چارپائی ٹوٹ جائے گی۔"

عفیرا کے رونے میں مزید اضافہ ہوگیا۔ وہ بیزار ہو کے خود ہی چارپائی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تب سامنے والے گھر کی نادیہ نے دروازہ کھول کر پھیری والے سے دو کھیس اور چادریں لیں۔ عذیر کی نظر اس کے سراپے پر پڑی تو ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

"یا اللہ! کیسی کیسی خوب صورتی' کن کن لوگوں کے مقدر میں لکھ دی اور میری قسمت میں یہ "موٹی بھینس" ہی رہ گئی تھی۔ نادیہ کا ہسبینڈ موٹا گنجا کلرک ہی تو ہے۔ پر واہ جی' اس کی موج دیکھو گوری چٹی متناسب سراپے والی دوشیزہ اسے مل گئی۔"

وہ نادیہ کو حسرت سے دیکھتے ہوئے سوچتا رہ گیا۔

"ایک میں بانکا سجیلا اونچا لمبا نوجوان۔ (خود کو بانکا سجیلا کہنے پر تھوڑی سی شرمندگی ہوئی) مجھے ملی تو یہ عفیرا بیگم... نام دیکھو کیسا ماڈرن... عفیرا... اور وزن دیکھو۔"

ایک دم عفیرا کا سراپا اس کی نگاہ میں لہرایا تو وہ بدمزا ہوگیا۔

ادھر عفیرا کے دل میں اس کے الفاظ جیسے گڑ کر رہ گئے تھے۔

کیسی بے عزتی کی بات تھی۔ وہ صفائی سے کہہ گیا تھا "میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ تمہارے ساتھ چلتے ہوئے مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔"

وہ اتنی موٹی تھی نہیں... شادی کے ایک سال کے اندر اندر وہ اتنا پھیلی کہ اسے خود اپنے طول و عرض پر حیرت ہوتی تھی۔

"شادی کے دس' پندرہ سال بعد اتنا موٹا ہو جائے تو چلو بات سمجھ میں آتی ہے۔ تم نے تو حد ہی کردی۔"

اوپر سے اٹھتے بیٹھتے عذیر کے طعنوں نے اس کا دل لہولہان کیا ہوا تھا۔ وہ اب سنجیدگی سے وزن کم کرنے کے چکروں میں تھی۔ ہائے وہ کس سے مدد لے۔ عذیر کی بیزاری اور اس کے طعنوں نے جینا حرام کردیا تھا۔ ساتھ والی باجی رباب اسے حکیم صاحب کے پاس لے گئیں۔ جہاں جاکر اس نے دوائی تو کیا لینی تھی۔ الٹا اپنے بھاری ہاتھوں سے حکیم صاحب کی دھلائی کر ڈالی۔ جو بد تمیز' عورتوں کو چیک کرنے کے بہانے بلاوجہ کبھی اس کا بازو پکڑتا' کبھی گال پر' کبھی منہ پر ہاتھ لگاتا۔ لینے وہ دبلے ہونے کی دوائی گئی تھی اور وہ نہ جانے اسے کون کون سے مرض یاد کرانے لگا۔ عذیر کی بے اعتنائی اسے کھائے جارہی تھی۔ عذیر کے علاوہ اس کا ہے ہی کون... کیا موٹا ہونا ہی اصل بدصورتی ہے؟ سارا دن وہ گھر کے کام کرتی۔ عذیر کے کپڑے دھو کر استری کرکے رکھتی۔ اس کے کہے بغیر وہ اس کے سارے کام کرتی جاتی۔ اپنے وزن سے وہ خود بھی پریشان تھی۔ پتا نہیں اتنا وہ کھاتی بھی نہیں تھی' جتنا اسے لگے جارہا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ اس نے عذیر کے اٹھنے سے پہلے مشین لگائی۔ سارے کپڑے دھو کر... صفائی کی... پھر خوب صورت سا گہرے رنگ کا سوٹ زیب تن کیا۔ تاکہ دبلی نظر آئے۔ عذیر کے اٹھنے سے پہلے' اس کے لیے قیمہ بھرے پراٹھے بنائے' ٹرے میں ناشتا سجا کر وہ کمرے میں ہی لے آئی۔ عذیر نہانے گیا ہوا تھا۔ ساری چیزیں سمیٹ کے اس کے کمرے کی بھی صفائی کرڈالی۔ وہ نہا کر باہر آیا' تو پراٹھوں کی مہک اور بھاپ اڑاتی چائے نے اس کی بھوک چمکادی۔

"واہ... آج تو مزا آگیا۔" وہ مزے سے پراٹھے کھانے لگا۔ "عفیرا تم نے تو کمال کردیا۔" اتنے عرصے بعد اس کے منہ سے تعریف سن کر وہ بہت خوش ہوگئی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس نے اس کے ساتھ ناشتا کرنے کے لیے پراٹھے کی طرف ہاتھ بڑھایا' تو اس کے جملوں نے ساری خوشی غائب کردی تھی۔

"رہنے دو تم... خدا کا خوف کرو... وجود دیکھو اپنا ذرا... اور چلی ہو قیمہ بھرے پراٹھے کھانے... تم سلائس کھاؤ... بلکہ تم تو صرف ایک ٹائم کھایا کرو۔" الفاظ تھے یا بم... اسے لگا اس کی کوئی انا اور عزت نفس ہے ہی نہیں۔ وہ موٹی تھی۔ پر تھی تو اس کی بیوی' پڑھی لکھی تھی' سلیقہ مند تھی' صرف ایک خامی تھی۔ پر وہ شخص اس کے احساسات کا خیال کیے بغیر اسے مختلف القابات سے نوازتا۔ کبھی موٹی بھینس' تو کبھی موٹی گینڈی۔

صبح کی ساری تیاری ایک دم پھیکی پڑ گئی۔ وہ گم صم سی ہوکر رہ گئی۔ وہ ناشتا کرکے چلا بھی گیا اور وہ وہیں بیٹھی رہی۔ بڑی ہمت کرکے خود کو آئینے کے سامنے کھڑا کیا۔ ایک موٹی عورت... پر نقش تو پیارے تھے۔ رنگ بھی صاف تھا اور وہ موٹی ضرور تھی پر بے ڈھنگی موٹی نہیں تھی۔

"عذیر! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔" وہ پھر چھلک پڑی۔ "تمہاری محبت' چاہت' مجھے دی جانے والی عزت' سب کدھر غائب ہوگئیں۔"

اس نے ایک عزم سے چادر اٹھائی اور گھر کو تالا لگا کر وہ ڈاکٹر رخشندہ کے کلینک آگئی۔ ان کے پاس آکر اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ انتہائی دلچسپی سے اس کی کتھا سنتی رہی۔ پھر بڑے اطمینان سے بولی۔

"مسز عذیر ایکچوئیلی' آپ کے شوہر خود

کمپلیکسز کا شکار ہیں۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں آپ کو ڈائٹ چارٹ بنا دیتی ہوں۔ صرف مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ باقی کام اللہ پر چھوڑ دیجیے۔ ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ نے مستقل مزاجی سے ہدایات پر عمل کرنا ہے۔ پھر کمال دیکھیے گا۔"

وہ اب مزید عذیر کی بے اعتنائی اور کڑوی کسیلی باتیں برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر رخشندہ کی ہدایات پر عمل کرنے کا عزم کیا۔ روز ایک گھنٹہ واک کرتی... اور ڈائٹ پلان کے مطابق کھانا پینا شروع کردیا۔ ایک اور کام اس نے کیا۔ اس نے عذیر کی باتوں پر رونا دھونا اور کڑھنا بالکل چھوڑ دیا۔ اس کے لیے اس نے ہیوی ناشتا' لنچ اور رات کا کھانا لازمی بنانا اور اپنے لیے وہی روکھا سوکھا کھانا۔ اپنے نفس کو اس نے تھپک تھپک کے سلا دیا۔ عذیر نے اس کے اندر تبدیلیاں دیکھ کر اسے مزید چڑانا شروع کردیا۔

"رہنے دو' ملا کی دوڑ مسجد تک' ڈائٹنگ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تمہیں پتلا ہونے کے لیے چالیس سال درکار ہیں یعنی چربی اتنی جلدی کبھی پگھلی بھی ہے۔"

وہ باتیں سنتی ضرور' پر گونگی بہری بن جاتی۔

پھر چالیس سال کیا صرف چھ ماہ میں ہی وہ پہلے والی عفیرا ہی نہیں رہ گئی تھی۔ چہرے کی چربی اتری تو بڑی بڑی آنکھیں مزید واضح ہوگئیں۔ عذیر کا التفات اور محبتیں واپس لوٹ آئیں۔ بالکل ایسے جیسے سال خوردہ بوسیدہ خزاں کی رت میں مارے ہوئے درختوں پر بہار لوٹ آئے۔ وہ ڈاکٹر رخشندہ کے پاس شکریہ ادا کرنے گئی۔ وہ بس مسکرائی تھیں۔

"عفیرا! اس میں میرے مشورے سے زیادہ تمہاری ہمت و کارکردگی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ورنہ لوگ تو کبھی بھی ڈائٹ پلان پر اتنی جلدی عمل نہیں کرپاتے۔ نتیجتاً" وہ ہمیشہ موٹے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ ہم جتنی ڈائٹنگ کرتے ہیں۔ اتنا بعد میں کھا بھی لیتے ہیں۔ تم اس لیے دبلی ہوتی گئیں کہ تم نے دوبارہ جنکس فوڈ لیا ہی نہیں۔"

"پھر بھی آپ کا شکریہ۔" وہ خوشدلی سے کہہ گئی۔ ڈاکٹر رخشندہ بھی مسکرادیں۔

"تمہارے ہسبینڈ کا رویہ اب کیسا ہے؟"

"وہ تو اب بالکل بدل گئے ہیں۔" وہ شرمیلی سی مسکراہٹ سے بولی۔ "لیکن میرا دل اب بدمزا ہوگیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" ڈاکٹر رخشندہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ان کی توند نکل آئی ہے اور کھا کھا کر گردن بھی موٹی ہوگئی ہے۔ وہ تو وہ عذیر ہی نہیں رہے جو پہلے اونچے لمبے تھے۔ مجھے اب الجھن ہونے لگی ہے۔ پینٹ شرٹ میں بھی سخت برے لگتے ہیں۔"

ڈاکٹر رخشندہ سر پکڑ کر رہ گئیں۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے ان کے کلینک میں ایک مرد یہ ہی کتھا سنا کر گیا تھا کہ وہ موٹا ہوگیا ہے اور اس کی بیوی اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی خراب ہے۔

"کیا تمہارے ہسبینڈ نے آج نیلا ٹو پیس پہنا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں ہلکی براؤن ہیں۔"

عفیرا نے بے زاری سے اثبات میں سر ہلایا۔ تو ڈاکٹر رخشندہ چپ کی چپ ہی رہ گئیں۔ انہیں لگا انہیں فریشن کی نہیں سائیکاٹرسٹ کی ضرورت تھی۔

عفیرا کے اٹھتے ہی ان کے — اسسٹنٹ محمد انوار نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میڈم جی! موٹاپا تو مجھے بھی بڑا برا لگتا ہے۔" منہ پر خوشامدانہ مسکراہٹ سجائے وہ بولا۔ "میں نے تو اپنی پہلی بیوی اسی لیے چھوڑی تھی۔ وہ بڑی موٹی تھی۔ جو بھی دیکھتا تو میرا مذاق ہی اڑاتا۔"

"چلو دھیان سے کام کرو۔ مریض آرہے ہیں۔" وہ اس کے موٹے سے پیٹ پر ایک نظر ڈال کر برہمی سے بولیں۔

"اس میراتھن میں تم کہاں پیچھے ہو؟" وہ بس سوچ کر رہ گئیں۔

آمنہ ریاض



باقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت ہڈ حرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساحر کو اس سے شدید جلن ہے۔ وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساحر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساحر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستانہ بنانے پر اس نے ساحر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساحر پر لگا دیا کہ ساحر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر ساحر کو دو تھپڑ مار دیتے ہیں۔ ساحر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور ساحر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف کر دیتے ہیں مگر ساحر شفا سے بیر باندھ لیتی ہے اور غلط بیانی کر کے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوا دیتی ہے۔



کاسٹنگ ڈائریکٹر جاثم تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہوجاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں' جہاں شفا کا گروپ ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو ثمر پر اپنی منگیتر کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ اور باقاعدہ منگنی پر دونوں کو پتا چلتا ہے کہ وہ واقعی ثمر ہے۔ وہ دونوں منگنی تو کرلیتے ہیں مگر سخت غصے میں ہوتے ہیں۔ منگنی کے بعد سمیر ٹرپ کے دوران مذاق میں کہی شفا کی بات کہ "ثمر کا نکاح ہوچکا ہے" اپنی ماں کو بتا کر منگنی توڑ دیتا ہے۔ ثمر کے والد شکیل صاحب سمیر کے والد سے سخت ناراض ہوجاتے ہیں۔ ثمر کی والدہ یہ جان کر کہ ثمر کے نکاح کی افواہ شفا نے اڑائی ہے۔ وہ شفا سے خفا ہوجاتی ہیں۔ ساہر انہیں مزید بھڑکاتی ہے۔ ساہر اور عمیر تقی سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ مہک' تقی کا پورٹ فولیو بنوالیتی ہے۔ تقی کو آفرز آنے لگتی ہیں۔ وہ ایک دو کمرشلز میں کام کرلیتا ہے۔ رضی کی بدولت مہک کے والد سے باقر لودھی کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ تقی کے لیے مہک کو پسند کرلیتے ہیں۔ جری کے میڈیکل میں ایڈمیشن ہونے کی خوشی میں باقر لودھی ایک چھوٹی سی تقریب کرتے ہیں۔ انہیں تقی کے شوبز جوائن کرنے کی خبر مل جاتی ہے۔ وہ بھری محفل میں اسے سخت بے عزت کرتے ہیں اور چھڑی سے مہمانوں کے سامنے خوب پٹائی لگاتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں۔

وہ متضاد سوچوں میں گھرا جارہا تھا' اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ عمیر اسے اپنے ہاں لے آتے ہیں اور جب تک گھر کا بندوبست نہیں ہوجاتا' اسے اپنے گھر رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ تقی ممنون اور شرمندہ سا ان کے گھر رہنے لگتا ہے۔ شفا اور وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں' مگر زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔ شفا کو عمیر کی نظروں میں گرانے کی ساہر کی سازش کا اسے علم ہوجاتا ہے۔ وہ ساہر کو منع کرتا ہے' مگر ساہر بجائے شرمندہ ہونے کے اسے اس معاملے سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہے۔ وہ کمرشلز اور ڈراموں میں مصروف ہوجاتا ہے۔ سمیر کے آفس میں ثمر انٹرن شپ کے لیے آتی ہے۔ سمیر اس کی طرف مائل ہونے لگتا ہے' مگر وہ اس کی جانی دشمن بنی ہوئی ہے۔

رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً" رباب کو کالج پک کرنے آتا ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں امتیاز احمد کو فون کرکے طلاق کا مطالبہ کردیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اٹینڈ کرلیتا ہے۔

ساہر' شفا سے انتقام لینے میں اتنی آگے بڑھ جاتی کہ اپنی دوست کے بھائی روحیل کو شفا کا موبائل نمبر اور تصاویر دے کر اس کے پیچھے لگادیتی ہے۔ وہ شفا کو بلیک میل کرنے لگتا ہے اور عمیر کو بھی اطلاع دے دیتا ہے جبکہ وہ اپنی تصاویر لینے کے لیے مجبوراً" اس سے ملنے آتی ہے۔ اس کے بعد روحیل کو گھر پر بلوالیتی ہے۔ روحیل الٹا ساہر سے بے تکلف ہونے لگتا ہے۔ ان ہی دنوں ان کے گھر عمیر کے دور کے تایا آئے ہوئے تھے۔ وہ چھت پر مردانہ سایہ دیکھ کر فائر کردیتے ہیں۔ روحیل بھاگ جاتا ہے اور ساہر' عمیر کے گھر کود جاتی ہے۔ دوسری طرف تایا شور مچادیتے ہیں کہ شفا چھت پر کسی مرد سے بات کررہی تھی۔ تقی کو ساہر کی ان منصوبہ بندیوں کا علم ہوتا ہے۔ وہ عمیر کی عزت کے خیال کرتے ہوئے اپنی شوٹنگ ادھوری چھوڑ کر گھر آجاتا ہے' جس کا خمیازہ اسے شفا سے نکاح کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ پھر تایا کے اصرار پر رخصتی بھی کردی گئی۔ ساہر نے تقی کے گھر فون کرکے بتادیا۔ لودھی صاحب مزید بگڑ گئے مگر شفا کو اپنے گھر لے گئے مگر دوسرے دن تقی سے پھر جھگڑ پڑے۔ تقی' شفا کو لے کر جوہر ٹاؤن والے گھر میں منتقل ہوجاتا ہے۔ وہ دونوں وہاں اجنبیوں کی طرح رہنے لگتے ہیں۔ تقی پر شدید غصے کے سبب ساہر' مہک کو بھی اس کے نکاح سے باخبر کردیتی ہے۔ وہ جوہر ٹاؤن پہنچ جاتی ہے اور شفا کو دیکھ کر تقی سے شدید غصے کا اظہار کرتی ہے اس کے ناراض ہونے پر تقی کو شفا پر غصہ آتا ہے۔ لڑائی میں شفا بتادیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ چھت پہ راحیل کے ساتھ ساہر بھابھی تھیں۔ اس لیے وہ آئندہ اس پر یہ احسان نہ جتائے کہ اس نے شفا کی عزت رکھی ہے۔ تقی اس کو باور کرادیتا ہے کہ وہ اسے مستقبل میں ساتھ نہیں رکھے گا۔ شفا ذہنی طور پہ تیار ہے

دسویں قسط

شوٹنگ کا شیڈول آگیا تھا اور فردوس صاحب ریہرسلز کروانا چاہ رہے تھے۔ تقی کی ٹائمنگ ایسی تھی کہ کس وقت گھر سے نکلتا اور کس وقت تک واپسی ہوتی' اس بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا' سو اس نے امی کو فون کرکے یہاں آنے کے لیے کہا۔

"شفا سارا دن اکیلی رہے گی' آپ آجائیں تو اسے سہولت ہوجائے گی۔"

"آنے کو تو آجاؤں لیکن بیبن کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ میں وہاں آگئی تو بھی دھیان یہیں اٹکا رہے گا۔۔۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ شفا کو ہی یہاں چھوڑ جاؤ۔" انہوں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"مجھے دونوں طرف کی فکر نہیں ہوگی اور شام کو میں شفا کو مارکیٹ لے جاکر اس کی پسند کے کچھ کپڑے بھی لے دوں گی۔۔۔ بچی کیا سوچے گی ایک تو آتے ہی گھر سے نکال دیا' دوسرے بری کے نام پر بھی کچھ نہیں دیا۔"

"نہیں خیر۔ اتنی عقل سے فارغ نہیں ہے بچی کہ بیٹھ کر ایسی بے تکی باتیں سوچے اور آپ کو بھی بلاوجہ خرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دو چار سوٹ ضرور لے دیجیے گا لیکن بری' وری لے کردینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اپنی طرف سے اس نے بڑا عقل مند بن کر کہا لیکن چونکہ بری کے متعلق بیشتر مرد حضرات کی طرح اس کی معلومات ناقص تھیں' سو بونگی مار گیا۔ امی ہنسیں مگر کہا کچھ نہیں۔

"اچھا تم زیادہ سیانے مت بنو۔ کب تک چھوڑ کر جاؤ گے اسے؟"

"امی۔۔۔! ابا کچھ کہیں گے تو نہیں؟" اسے کچھ خیال آیا۔

"کہا بھی تو تمہیں ہی کہیں گے' شفا کی تو بڑی فکر ہے انہیں۔" امی کا لہجہ مطمئن تھا' سو اسے بھی قدرے تسلی ہوگئی۔

"میں شفا سے پوچھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ یہیں رہنا چاہے۔"

"نہیں' اکیلا مت چھوڑنا۔ وہ تو شاید تکلف میں راضی نہ ہو مگر تم اسے یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ بے چاری اکیلی کیا کرے گی گھر میں۔۔۔" امی نے زور دے کر کہا۔ "بلکہ تم ایسا کرو' شفا سے بات کراؤ میری۔ میں خود اس سے کہتی ہوں۔"

تقی اچھا کہہ کر شفا کے کمرے کی طرف بڑھا اور سیل فون اس کی طرف بڑھادیا۔

"امی سے بات کرلو۔" اسے فون پکڑا کر وہ واپس کمرے میں آیا اور تیار ہونے لگا۔ چند منٹ بعد شفا کمرے میں آئی۔

"تم کتنے بجے تک نکلو گے؟" اس نے سیل فون تقی کے تکیے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس پانچ منٹ۔۔۔ تم چلوگی یا یہیں رکنا ہے؟"

"اکیلی کیا کروں گی۔ مجھے وہیں چھوڑ دو۔" شفا نے کہا تو اس نے سر ہلادیا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔ اسے بھی تسلی رہے گی۔



بائیک تقی کی تھی سو جب چلتی تو اسی کی طرح۔ بقول اس کے' چلتی نہیں تھی اڑتی تھی' سو اس وقت بھی اڑ رہی تھی۔

شفا تکلف سے بیٹھی تھی' ہر آن لگتا ابھی گر جائے گی۔

"یہ تم اتنی تیز بائیک کیوں چلا رہے ہو؟" جب گرنے کے خوف سے کانپتی کانپتی تھک گئی تو پوچھ ہی لیا۔

"اسے تیز کہتے ہیں؟ ستر پہ چلا رہا ہوں۔" تقی نے چڑ کر کہا تھا۔

"چالیس پر چلانا چاہیے۔" ہانپتا کانپتا مشورہ آیا۔ تقی نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے یوں گھورنے کی کوشش کی جیسے اس کی عقل پر شک گزرا ہو۔

"آگے دیکھو۔۔۔ آگے۔" وہ اور کانپنے لگی۔

تقی کو اس کے ڈر کا اندازہ ہوا تو جلے دل سے لیکن رفتار کم کرہی دی۔

لیکن وہ بھی اپنے نام کی پکی تھی پھر بھی کانپتی رہی

اور بار بار اسے رفتار کم سے کم تر کرنے کے مشورے دیتی رہی۔

"پہلے کبھی بیٹھی ہو بائیک پہ؟" اس نے شفا کا دھیان بٹانا چاہا۔

"ایک بار بچپن میں عمیر بھائی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ بھی اندھادھند چلاتے تھے تمہاری طرح۔۔۔"

"اچھا پھر؟"

"پھر کیا۔۔۔ میں جب ان کے ساتھ بیٹھی تو وہ ایسے ہی چلا رہے تھے۔ سگنل پر بائیک رکی تو میں اتر گئی کہ اب کیا اس بے ہودہ سواری پر بیٹھی رہوں۔ جب سگنل کھلے گا تو بیٹھ جاؤں گی لیکن جب سگنل کھلا تو۔۔۔"

"تو؟" تقی نے دلچسپی محسوس کی۔

"تو عمیر بھائی نے پیچھے مڑ کر ہی نہیں دیکھا۔ وہ بائیک پر یہ جا وہ جا۔۔۔ اور میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔"

تقی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جو سڑک کی ٹریفک کے شور میں گم ہو گیا۔

"پھر تم گھر کیسے پہنچیں؟"

"گھر جا کر عمیر بھائی نے جب پیچھے دیکھا تو میں تھی ہی نہیں۔ وہ سمجھے مجھے کہیں گرا آئے ہیں تو مجھے لینے واپس دوڑے۔" اسے ابھی وہ واقعہ یاد آیا تو ہنسی آ گئی۔

"اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں، آہستہ چلاؤ۔ عمیر بھائی تو مجھے پیچھے چھوڑ آئے تھے، تم کہیں گرا ہی نہ دینا۔"

"گرانے کی گارنٹی نہیں ہے۔ البتہ پیچھے تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ اس کی گارنٹی دے سکتا ہوں۔" اس نے شرارت سے کہا۔ ساتھ ہی رفتار اور بھی بڑھا دی شفا جو قدرے پُرسکون ہو رہی تھی دوبارہ دبک گئی۔

"آ گئے تم لوگ؟" خدا خدا کر کے گھر پہنچے تو شفا نے شکر ادا کیا۔ امی گیٹ پر ہی ان کی منتظر تھیں۔

"جی آ گئے۔۔۔ لیکن میں اندر نہیں آؤں گا، رات کو اسے لینے آؤں گا۔" تقی نے عجلت میں کہا۔

"لیکن میں اس کھٹارا بائیک پر واپس نہیں جاؤں گی۔۔۔ آپ کا بیٹا بہت خوفناک طریقے سے چلاتا ہے۔" شفا نے امی سے کہا۔

"ابھی اتنا بڑا ایکٹر نہیں بنا کہ تمہارے لیے زیرو میٹر گاڑی لے کر آؤں۔۔۔ جانا تو اسی پر پڑے گا۔ ورنہ یہیں رہ لینا اور خبردار جو آئندہ میری بائیک کو کھٹارا کہا۔۔۔" وہ زن سے بائیک لے گیا۔

امی ابھی اسی بات پر حیران ہو رہی تھیں کہ کل تک ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے والے آج اتنے دوستانے سے بات کیسے کر رہے ہیں، پھر سر جھٹک کر بولیں۔ "تم اندر تو آؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گی واپس۔ آپ مجھے اپنے گھر رکھ لیں گی؟" شفا نے اندر آتے ہوئے روہانسی ہو کر پوچھا تھا۔ امی ہنس دیں۔

"فکر کیوں کرتی ہو، میں رضی سے کہوں گی، تمہیں گاڑی پہ چھوڑ آئے گا۔"

شفا بددل ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا وہ اسے اپنے گھر رکھنا نہیں چاہتیں اور اس بات کی تصدیق رات کو ہو بھی گئی۔ اگرچہ اس نے وہاں ایک بھرپور دن گزارا تھا۔ اپنے مسائل کو ذہن سے نکال کر خوب ہنسی تھی۔ جری، سبین، مناہل سب کے ساتھ اس کا وقت بڑا اچھا گزرا۔ شام کو امی اسے شاپنگ کے لیے لے گئیں۔ نہ نہ کرنے کے باوجود انہوں نے اسے تین سوٹ لے کر دیے تھے، اس کے ہر انکار کے جواب میں وہ کہتیں۔

"نئی دلہن ہو، یہی دن پہننے اوڑھنے کے ہوتے ہیں۔"

اگلے روز وہ اسے دوبارہ مارکیٹ لے جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ شام کو ابا سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دو چار تکلف بھرے جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ سات بجے تقی کا فون آیا کہ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا، تب امی نے شفا سے تیار ہونے کے لیے کہا۔

"سبین! آج جو سوٹ لیے ہیں۔ ان میں سے کوئی شفا کو پہنا کر اچھا سا میک اپ کر کے تیار کر دو۔ تقی آنے والا ہے۔"

سبین اسے کمرے میں لے گئی۔

"سبین! مجھے تیار نہیں ہونا۔" کپڑے تو اس نے بدل لیے تھے لیکن میک اپ کروانے پر راضی نہ تھی۔

"کیوں بھئی۔ تقی دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔" سبین نے کہا۔

"اسے میک اپ پسند ہے تو وہ خود کر لیا کرے، میں کیوں کروں؟"

"بدھو ہو تم بالکل۔" سبین نے ہنس کر کہا تھا۔ "شادی کے شروع کے دن ہی تو ہوتے ہیں جب شوہر بیوی کو تیار ہوا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں، ان دنوں کو جی بھر کر انجوائے کر لو۔ آگے بچوں وچوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سارا رومانس اڑنچھو ہو جائے گا۔"

وہ اپنی طرف سے بڑا عقل والا سبق پڑھا رہی تھی لیکن بچوں والی بات سن کر شفا چُپ ہی رہ گئی پھر سبین بولتی رہی اور اس کے چہرے پر اپنی کارکردگی دکھاتی رہی۔ آٹھ بجے تقی آیا تو اس نے نظر بھر کر شفا کو دیکھا بھی نہیں اور مناہل سے باتیں کرنے لگا۔ گو کہ شفا کے دل میں اس کے لیے کچھ نہیں تھا لیکن غیر شعوری طور پر وہ بھی منتظر تھی کہ تقی اسے دیکھ کر کیا کہتا ہے۔ اس انداز پر شفا سے زیادہ سبین کی امیدوں پر پانی پھرا۔ وہ اسے تیار کرتے ہوئے اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اسے یقین دلاتی رہی تھی کہ وہ بہت پیاری لگ رہی ہے اور تقی اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دے گا۔

"تقی! شفا کیسی لگ رہی ہے؟" اس نے سب کے درمیان بیٹھ کر خود ہی پوچھ لیا۔ تقی نے بے ساختہ شفا کی طرف دیکھا تھا، یہ سرسری اور عام سی نظر تھی لیکن وہ خفیف سی ہو گئی۔

"کیوں، پلاسٹک سرجری کروا کر آئی ہے کیا؟" اس نے چند منٹ بغور اسے دیکھنے کے بعد کہا تھا۔ شفا اس بات پر ہنس دی۔

"خیر اب بنو تو مت۔ میں نے اتنا اچھا میک اپ کیا ہے کہ وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو۔۔۔"

"پھر تو آپ کے لیے بری سی خبر ہے اور وہ یہ کہ آپ کا میک اپ بالکل بے کار ہے۔" اس نے صاف مذاق اڑایا۔

"اچھا اب اتنا بھی مت بنو۔۔۔ میں سمجھ گئی، تم گھر جا کر فرصت سے شفا کی تعریف کرنا چاہ رہے ہو۔ پتا ہے نا شفا اسپیشلی تمہارے لیے تیار ہوئی ہے۔" سبین نے ان دونوں کو بیک وقت چڑایا تھا۔ شفا تو صحیح معنوں میں خفیف سی ہو گئی جبکہ تقی نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"واہ بھابھی! بڑی ذہین ہو گئی ہیں آپ۔" وہ ایسا تو تھا نہیں کہ آرام سے کسی کے قابو آ جائے، سو اس بار بھی بچ نکلا۔ یہ الگ بات کہ رضی اور سبین اسے مستقل ہی چڑا رہے تھے۔

شفا ذرا الگ ہی رہی پھر امی نے ان دونوں کو کھانا کھلا کر ہی جانے دیا تھا۔ شفا کو رضی اور سبین گاڑی پر چھوڑ گئے۔

"تمہیں بائیک پر ڈر لگتا ہے تو وہیں رہ لینا تھا کیونکہ میری تو اب کچھ روز یہی روٹین رہے گی۔" گھر آتے ہی تقی نے کہا تھا۔

"میں نے آنٹی سے کہا تھا۔ مجھے وہیں رہنے دیں لیکن انہوں نے کہا۔ عورت کا گھر وہ ہوتا ہے جہاں اس کا شوہر رہے۔ اس لیے مجھے "اپنے گھر" ہی جانا چاہیے۔" اس نے "اپنے گھر" کو قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

تقی زور سے ہنس دیا۔

"میری امی نا بہت شوہر پرست قسم کی خاتون ہیں۔ وہ تمہیں اکثر ایسے سبق پڑھاتی ہی رہیں گی۔"

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شفا اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے کانوں میں پڑے بھاری آویزے اتارے، چوڑیاں اتاریں، کپڑے تبدیل کیے اور سونے

کے لیے لیٹ گئی لیکن ان سارے کاموں کے درمیان اس کا ذہن عجیب سا رہا۔ ایک خالی پن سا تھا۔ خاموشی تھی۔

اس کے ذہن میں بار بار تقی کی امی کے جملے گونج رہے تھے۔

"شوہر کا گھر... گھر تو یہ بھی میرا نہیں ہے..."

سونے سے قبل جو آخری سوچ اس کے ذہن میں تھی، وہ بس یہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز تقی نے اسے پھر وہیں چھوڑ کر جانا تھا۔ وہ شفا کو یہ بات بتانے اس کے کمرے میں آیا تو وہ پلنگ پر آرام سے بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ سنہری سنہری آملیٹ، پراٹھا اور چائے۔ تقی کے منہ میں جتنا بھی پانی آتا، وہ کم تھا۔ ساتھ ہی امیدوں پر پانی بھی پھرا۔ اس کا خیال تھا شفا بنا کہے اس کے لیے بھی ناشتا بنا دیا کرے گی۔

"تم تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں امی کی طرف چھوڑ دوں گا۔"

شفا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جھوٹے منہ بھی اسے کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔

تقی ذرا مایوس ہوا۔ وہ کھانے پینے کا شوقین تھا، پکانے کا ہرگز نہیں۔ کئی سال کی محنت کے بعد بھی اسے یقین تھا وہ، اتنا خوش رنگ آملیٹ اور پراٹھا نہیں بنا سکتا تھا۔

"تمہیں تیار ہونے میں کتنا ٹائم لگے گا۔ پندرہ منٹ یا پچیس منٹ؟ میں اس لیے... پوچھ رہا ہوں... تب تک... اپنا ناشتا بنا لیتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے رکا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر جملہ مکمل کیا کہ شاید وہ کہہ دے کہ میں بنا دیتی ہوں۔

"میں نے کیا تیار ہونا ہے۔ بس یہ ناشتا ختم کر لوں تو چلتے ہیں۔" شفا نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن تم آرام سے اپنا ناشتا بنا لو، دس منٹ تو مجھے بھی لگ ہی جائیں گے۔"

ٹھاہ... ٹھس... تقی کا دل باقاعدہ آواز کے ساتھ ٹوٹا تھا۔ اس نے مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا اور ایسے ہی قدموں سے چلتا کچن میں آ گیا۔ بحالت مجبوری پیالہ اور چھری اٹھائی۔

"نہایت ہی بے مروت لڑکی ہے۔" اس نے انڈا نہیں گویا شفا کا سر پھوڑا تھا۔ انڈا پھینٹنا دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا، تب ہی شفا آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی بھی چائے کا مگ تھا۔

"تمہاری واپسی کب تک ہو گی؟"

"کیوں؟" تقی نے جل کر پوچھا۔ (بتاؤ ذرا۔ آ کر سر پر کھڑی ہو گئی۔ یہ نہیں کہ اپنی خدمات ہی پیش کر دے۔) اس نے دانت پیسے۔

"اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ پہلے ہی رضی بھائی کو بتا دوں گی۔ تمہارے ساتھ بائیک کا ایک چکر ہی میری آدھی جان نکال دیتا ہے۔ واپسی پر بھی تمہارے ساتھ آنا پڑا تو ساری جان ضائع ہو جائے گی۔"

ایک تو ناشتا بنا کر نہیں دیا، اوپر سے اس کی بائیک کی شان میں گستاخی۔ انتقام کا جذبہ سر چڑھ کر بولنے لگا۔

"میں سات بجے تک ہی آؤں گا۔ تم بھابھی کو بتا دینا، وہ رضی کو فون کر دیں گی... مجھے لگتا ہے میرا فون بج رہا ہے۔" اس نے کان لگا کر سنا۔ "یہ ذرا پکڑنا۔ میں فون سن کر آتا ہوں... ذرا آٹا بھی نکال کر رکھ دینا۔ میں ابھی آیا۔" وہ کچن سے نکل گیا۔ شفا نے ہاتھ میں پکڑے چمچ کو دیکھا پھر چائے کا مگ سائیڈ پر رکھ کر آملیٹ بنانے لگی۔

آملیٹ تیار ہوئے بھی جب دس منٹ گزر گئے اور تقی واپس نہیں آیا تو اس نے پراٹھا بھی بنا دیا اور چائے بھی۔

"ارے تم نے کیوں تکلف کیا۔ میں آ کر بنا ہی لیتا۔" تقی نے آ کر معصومیت سے کہا۔ شفا نے خاموشی سے ناشتا اس کے سامنے رکھ دیا۔ تقی دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر قہقہے لگاتا، مزے سے ناشتا کرنے لگا۔ ساری زندگی بھی محنت کر لیتا تو ایسا عمدہ پراٹھا آملیٹ نہیں بنا سکتا تھا۔

شفا چند منٹ بعد کچن میں آئی۔

"تقی! ذرا اپنا فون دو گے؟ میں ثمین بھابھی کو پہلے ہی کہہ دوں، رضی بھائی کو بتا دیں۔"

"میرے پاس ابھی سیل فون کہاں... فردوس صاحب پے منٹ کلیئر کریں گے تو سب سے پہلے سیل ہی خریدوں گا۔" جتنی لاپروائی سے کہا اتنی ہی تندہی سے نوالہ منہ میں ڈالا تھا۔

"لیکن ابھی تو تم کہہ رہے تھے..." وہ ٹھٹک کر رکی۔ اسے ذوق و شوق سے کھاتے دیکھا اور پھر اپنی نادانی پر سر پیٹ لیا۔

"ناشتا بنوانا تھا تو صاف کہہ دیتے، اتنا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ایکسکیوزمی... زیادہ احسان جتانے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے نہیں کہا تھا۔ تم خود ہی بنانے لگ گئی تھیں، پھر اب اتنی اکڑ کیوں رہی ہو۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔

"ایک تو میں نے بغیر کہے تمہارا ناشتا بنایا اور تم احسان بھی نہیں مان رہے۔ الٹا اکڑ رہے ہو۔" اسے غصہ آیا۔

"احسان مندی کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں ہے کیونکہ کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا، جو بھی کچھ کوئی کسی کے لیے کرتا ہے، اپنے ضمیر کی آواز سے بے چین ہو کر کرتا ہے۔" اس نے آرام سے اسی کی بات اسے سنا دی۔ صرف یہی نہیں اب وہ مسکرا بن کر مسکرا بھی رہا تھا۔ شفا کو آگ ہی لگ گئی۔

"ایسی بات ہے تو جب تک ہم ساتھ رہیں گے۔ ایک دوسرے کے لیے کوئی کام نہیں کریں گے۔" شفا نے اپنی طرف سے اس سے اچھا بدلہ لیا تھا، لیکن وہ چونکہ ایک زبردست سے ناشتے سے بنا محنت محظوظ ہو رہا تھا سو فوراً" اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور ہر کام برابری کی بنیاد پر ہو گا۔ ایک دن گھر کی صفائی میں کروں گی، ایک دن تم۔ ایک دن کچن تم صاف کرو گے، ایک دن میں..." وہ ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ تقی نے ٹوک دیا۔

"منظور ہے۔ لیکن ایک بات یاد رہے! مجھے گندے گھر سے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لیے تم صفائی کرو یا نہ کرو مجھے پروا نہیں ہے، میں تو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور کھانا اپنا باہر سے لے آیا کروں گا۔ اب دو روٹیوں کے لیے کون روز روز تمہارے نخرے دیکھے... ہونہہ۔"

پیٹ بھر گیا تھا اور فی الحال اسے کسی چیز کی پروا بھی نہیں تھی، سو اس نے مزے سے چائے کے آخری گھونٹ بھرے۔ کپ اس کے عین سامنے پٹخا اور گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔

"تم کیا تمہارے تو اچھے بھی کام کریں گے۔" شفا دانت پیس کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز وہ گئی نہیں۔ تقی کی امی اس کے پاس آ گئیں۔ ان کے ساتھ اچھا وقت گزر جاتا تھا، وہ اسے اپنے دور کے قصے سناتیں۔ جری سے کہہ کر گھر کا پرانا ٹی وی بھی ادھر رکھوا دیا تھا۔

اب دونوں ساس بہو مل کر ٹی وی دیکھتیں، کبھی مل کر کچھ پکانے لگ جاتیں۔ ایک بات شفا نے بطور خاص محسوس کی اور تقی کی بات اسے سو فیصد درست لگی۔ امی اسے شوہر کی اطاعت گزاری کے بہت اسباق پڑھاتی تھیں۔ یا اسے شوہر کی اطاعت گزاری بھی نہیں کہا جا سکتا، یہ تو کوئی اور ہی قسم کی باتیں تھیں، جنہیں وہ کوئی مناسب نام بھی نہیں دے سکتی تھی۔

لب لباب یہ ہوتا کہ جس سے نکاح ہو، اسے ہی سر کا سائیں مان لو۔ لیکن وہ اس طرح کی باتیں گھما پھرا کر کرتیں۔

"اللہ نے نکاح شرط رکھا ہے تو کچھ سوچ کر ہی رکھا ہو گا نا۔ ضروری تو نہیں کہ پہلے پیار محبت کے گیت گائے جائیں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھوما جائے، پھر نکاح جیسے پاکیزہ رشتے کی بنیاد رکھی جائے۔ ارے بیٹی! یہ تو آج کل کی باتیں ہیں جو میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے آ گئی ہیں۔ آخر ہمارے دور میں بھی تو رشتے

ہوتے تھے۔ نہ کسی کو دیکھا نہ کبھی آواز سنی ہوتی تھی' اماں ابا نے اٹھا کر نکاح کر دیا تو جس سے نکاح ہوا اسے ہی سب کچھ مان لیا۔ نکاح کے بولوں میں ویسے بھی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اللہ خود سے دو دلوں میں محبت ڈال دیتا ہے پھر بال بچے دار ہو جائیں تو محبت مضبوط سے مضبوط ہوتی رہتی ہے۔"

وہ کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں تھی کہ سمجھتی ہی نہیں کہ بالواسطہ اسے کیا درس دیا جا رہا ہے۔

کبھی بات ٹال دیتی' کبھی ہنس پڑتی اور کبھی ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ جو کچھ وہ اسے سمجھاتی تھیں اس کا ایک چوتھائی حصہ بھی اپنے بیٹے کو سمجھا پاتیں تو اس رشتے کی نوعیت شاید بدل بھی جاتی لیکن چونکہ اب وہ تقی کے خیالات سے بخوبی واقف تھی' سو ایسا سوچنا بھی اس کے نزدیک بددیانتی میں شمار ہوتا تھا۔ بے شک اس نے تقی کے سامنے تسلیم نہیں کیا لیکن حقیقت تو یہی تھی کہ تقی نے اسے تحفظ فراہم کیا تھا اور وہ اس کی شکر گزار تھی۔

یہ اس ناشتے والی بات کے تیسرے دن کی بات ہے۔ امی نے تقی کو بھی آڑے ہاتھوں لے لیا۔

وہ اکثر آتی تھیں تو دیکھ رہی تھیں۔ گھر کی کیا صورت حال ہے۔

"یہ تمہارا گھر ہے' کچن کی حالت دیکھی ہے؟"

"یہ شفا انتہائی پھوہڑ ہے امی! ذرا جو کچن کا خیال رکھتی ہو۔" اس نے سارا ملبہ اس پر ڈال دیا۔ خود تو کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"شفا کا نام مت لو۔ اس کا سگھڑاپا میں دیکھ چکی ہوں... میں تو تم سے پوچھ رہی ہوں' کوئی احساس ذمہ داری ہے کہ نہیں؟"

"چلو..." اس نے اس ایک لفظ کو خوب لمبا کیا جیسے انسان اکتا کر کرتا ہے۔ "اب آپ میں بھی ابا کی روح آگئی؟"

"بکو مت۔" انہوں نے شفا کی پروا کیے بنا ڈپٹ دیا۔ "اتنا نہیں کہ گھر میں کچھ راشن ہی ڈلوا دو' بے چاری بچی کو کھانے پینے کی بھی تنگی۔"

"تو جو آپ اتنے ڈونگے بھر بھر کے بھجواتی ہیں' وہ یہ آپ کی بچی ہی تو کھاتی ہے۔ مجال ہے' جو کبھی اس نے مجھے ایک نوالہ بھی چکھنے دیا ہو۔" اس نے بھی خود کو بری الذمہ کروانے کے لیے مبالغہ آرائی کی حد ہی کر دی تھی۔

"بیٹے! ماں ہوں تمہاری۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ لوگ جینے کے لیے کھاتے ہیں تم کھانے کے لیے زندہ ہو۔ جب تک آدھا کھانا خود نہ کھا لو' کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے تھے شفا بے چاری کو کہاں کھانے دیتے ہو گے۔" وہ اس کی ماں تھیں' ایسی سنائیں کہ کان ہی لال کر دیے۔ شفا کا برا حال تھا۔ ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ یہاں تو سب ہی سیر پر سوا سیر تھے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا' میں آپ لوگوں کا سگا بیٹا ہوں ہی نہیں۔ ہو نہ ہو' کہیں سڑک پر سے آپ لوگوں نے اٹھایا ہو گا مجھے۔" تقی نے اس کھلی عزت افزائی پہ جل کر کہا تھا۔

"اور تمہیں بڑی ہنسی آ رہی ہے۔" وہ شفا کے پیچھے پڑا۔

"خبردار۔ شفا کو کچھ مت کہنا۔ میں نے تو آج غور کیا' کچن میں راشن کے نام پر کچھ ہے ہی نہیں جب شفا کو ہماری طرف نہیں چھوڑتے تو یہ بے چاری کھاتی کیا ہو گی۔"

تقی کو بھی یک دم ہی اس بات کا خیال آیا تھا ورنہ اس نے تو اس سے پہلے اس بات پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔ اس نے بے ساختہ شفا کی طرف دیکھا۔ کیسی جھلی لڑکی تھی' اتنے دن سے اس کے ساتھ تھی۔ ایک بار بھی کچھ کہا نہیں۔

"آپ یہ بے چاری بے چاری تو کرنا بند کریں۔ شفا کو بھوک لگتی تو یہ خود ہی کہہ دیتی' یہ دراصل ان لوگوں میں سے ہے' جو زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں' صحت نہیں دیکھی آپ نے اس کی۔" بات کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے ڈھٹائی سے کہا تھا۔

"صحت دیکھی ہے' تب ہی فکر مند ہوئی ہوں۔

بھوکی رہ رہ کر یہ تو نظر آنا ہی بند ہو جائے گی۔" انہوں نے بے حد فکر مندی سے کہا تھا۔

"امی! آپ اتنا بھی فکر مند نہ ہوں میرے لیے۔ آپ جو کھانا بھجواتی تھیں' اس میں سے کچھ نہ کچھ بچا لیتی ہوں اور وہی کھا لیتی ہوں۔"

"یہ میری امی ہیں۔" تقی نے فوراً" بچوں کی طرح کہا تھا۔

شفا کے چہرے پر شرمندگی پھیل گئی۔

"تم چپ کرو' کسے میں نے کہا ہے' امی کہے مجھے... تم جا کر تیار ہو شفا! ابھی مارکیٹ جا کر تھوڑا بہت راشن لے آتے ہیں۔"

انہوں نے اسے اندر کا راستہ دکھایا۔

"کیا ضرورت ہے راشن کی۔ خرچے پہ خرچا... آپ بھجوا تو دیتی ہیں... ایک وقت نہیں کھائے گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔" اس کا انداز ابھی بھی چڑچڑاہٹ لیے ہوئے تھا۔

"ایک تو یہ کہ میں تمہاری ماں ہوں' تم میری ماں بننے کی کوشش مت کرو۔" امی نے جھڑک کر کہا۔ "مجھے مت سکھاؤ' کیا کرنا ہے کیا نہیں اور دوسری بات یہ کہ تھوڑا سوچ سمجھ کر بولنے کی عادت ڈال لو۔ شادی ہو گئی' گھر بار والے ہو گئے' کل کلاں کو بچے بھی ہو جائیں گے' لیکن تم موقع محل کے حساب سے بولنا نہ سیکھنا... اس نے مجھے امی کہہ دیا تو کون سی قیامت آگئی تھی جو اتنی بری طرح سے ٹوک دیا۔"

"اللہ رے اللہ۔" وہ ان ہی کے انداز میں بولا۔ "اس نے تو امی کہا سو کہا' آپ نے اسے بالکل ہی سگی بیٹی سمجھ لیا ہے۔ یعنی اس پرائی لڑکی کے لیے آپ اپنے سگے' ہونہار' شہزادوں جیسے بیٹے کو نہ صرف ڈانٹ رہی ہیں بلکہ ڈانٹتی ہی جا رہی ہیں۔"

امی نے سر پیٹ لیا۔ اس سے کچھ کہنا ہی فضول تھا۔

"اور یہ بچوں وچوں والے خواب بھی دیکھنا چھوڑ دیں۔ اس شادی کی حقیقت میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"میں تمہیں بتا رہی ہوں' تم میرے ہاتھوں پٹو گے تقی!" انہیں اتنی زور سے غصہ آیا کہ جوتا ہی اتار لیا۔ اسی وقت شفا آگئی۔ تقی نے سٹپٹا کر ان کا جوتے والا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اتنا زیادہ کاٹتا ہے تو پہنتی کیوں ہیں... ؟ دفع کریں ایسی گھٹیا کوالٹی کے جوتے کو۔ میری ذرا پہلی پے منٹ کلیئر کرنے دیں فردوس صاحب کو۔ وعدہ ہے' آپ کو اعلا کوالٹی کا جوتا لے کر دوں گا۔"

اس فردوس صاحب والی پے منٹ سے اس نے نہ جانے کون کون سی خواہشات پوری کرنا تھیں۔

"ماشاء اللہ... اللہ نظر بد سے بچائے... تم نے دیکھا شفا! کتنا سمجھ دار ہے میرا بیٹا۔ فوراً" میری بات سمجھ گیا۔" انہوں نے بھی محبت سے تقی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "لیکن یاد رکھنا تقی بیٹا! جوتا اعلا کوالٹی کا ہی ہونا چاہیے... ورنہ مجھے بھی تم جانتے ہو۔"

اتنی مٹھاس... تقی کے فرشتے بھی سب سمجھ گئے تھے۔



آج کے دن کوئی خاص کام نہیں تھا سو وہ صبح بھی آرام سے اٹھا۔ دوپہر میں پھر کچھ دیر کے لیے سو گیا۔ دوبارہ اٹھا تو پتا چلا امی جا چکی تھیں۔ اسے بھی کہیں جانا تھا' لیکن ابھی تھوڑا وقت باقی تھا سو وہ کچن میں آیا تاکہ چائے ہی بنا لے۔ امی چکر لگا گئی تھیں۔ اسے یقین تھا کچھ نہ کچھ تو پکا کر ہی گئی ہوں گی یہ بھی نہیں تو شفا نے ضرور اتنا کھانا بنایا ہو گا جو ان تینوں کے لیے کافی ہو۔ یہی سوچ کر وہ کچن میں آیا اور عین کچن کی دہلیز پر پھسل کر سجدہ ریز ہو گیا۔

شکر ہے سر نہیں پھٹا بلکہ ٹکرانے سے پہلے ہی وہ سنبھل گیا' اس کے باوجود اس نے ایسی دلدوز چیخ ماری کہ شام کے پرندے بھی درختوں سے اڑ گئے اور ماند پڑتے آسمان پر ان کے بھاری پروں کا شور دیر تک سنائی دیتا رہا۔

شفا اندر سے بھاگی آئی۔ اسے زمین بوس دیکھا تو مسکراہٹ دباتی سہارا دینے بڑھی پھر جھجک کر دور ہی رہی۔

"ہائے مر گیا... امی!... یہ گریسی سی چیز کیا ہے یہاں؟" وہ مشکل سے اپنا آپ سہلاتا ہوا اٹھا تھا۔

"یہ؟" شفا نے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ "اوہ اچھا... ہم راشن لے کر آئے تو امی کے ہاتھ سے کوکنگ آئل کا پیکٹ گر گیا تھا... تمہیں احتیاط سے چلنا چاہیے تھا تقی...! مجھے بتاؤ' زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟" بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

"آئل گرا تھا تو صاف کیوں نہیں کیا... ؟ اتنی بری چوٹ لگی ہے مجھے۔" اچنبھے سے پوچھا۔

"میں کیوں صاف کرتی؟" اس نے اور زیادہ اچنبھے سے پوچھا۔

"گندگی صاف کی جاتی ہے یا نہیں؟" تقی کو بڑے زور سے غصہ آیا تھا۔

"اچھا... لیکن تم تو کہہ رہے تھے۔ تمہیں گندے گھر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے اتنا معصوم بن کر پوچھا تھا کہ تقی ایک پل کو تو اس کی بات کا مطلب سمجھا ہی نہیں اور جب سمجھا تو دانت پیس کر رہ گیا اگرچہ خواہش تو اس کی گردن دبانے کی تھی۔

"میرا خیال ہے' اب تو تمہاری سمجھ میں آہی گیا ہو گا کہ گھر اور کچن کی صفائی ستھرائی کتنی ضروری ہے... ؟ میں پچھلے چار دن سے کر رہی ہوں' لیکن اب سب کچھ باری کے حساب سے ہو گا... جھاڑو اور سرف وہاں کچن کے سنک کے نیچے والے کیبنٹ میں رکھے ہیں۔ کام کرتے ہوئے کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے آکر پوچھ لینا۔"

اس نے اطمینان سے کہا اور دل جلانے والی مسکراہٹ چہرے پر سجائے دوسری طرف چل دی۔

تقی کی آنکھوں میں خون اتر آیا' لیکن اب اتنی سی بات کے لیے کیا اسے قتل کرتا' سو ہوا میں ہی اسے ایک جھانپڑ رسید کر دیا اور کر کے پچھتایا کہ کہنی بری طرح کراہی تھی۔

اس نے کراہتے ہوئے مڑ کر کیبنٹ کی طرف دیکھا۔ وہ سیر تھا تو کم کچھ شفا بھی نہیں تھی اور دوسری بار خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اسے کام تو کرنا ہی تھا سو مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق وہ جھاڑو اٹھا کر جُت گیا' یہ الگ بات ہے کہ سارا ہی وقت وہ دانت پیس پیس کر شفا کو کوستا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شفا کمرے سے نکلی اور کچن کے دروازے میں کھڑی ہو کر اس کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگی۔

"شاباش... بہت اچھا کام کیا ہے تم نے۔ کوئی کام والی ماسی بھی اس آئل کو اتنے اچھے طریقے سے صاف نہیں کر سکتی تھی جتنے اچھے سے تم نے کیا ہے... تمہاری کہنی میں چوٹ لگی ہے' چائے بنانے میں دقت ہو گی... ایسا کرو' تم جا کر تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔"

بڑی ہمدرد بن کر کہا اور اس طرح کہتی وہ تقی کو ہر بار سے زیادہ بری لگی تھی۔

"میرے سر پر احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس ٹوٹی کہنی کے ساتھ جب یہ جگہ صاف کر سکتا ہوں تو چائے بھی بنا ہی لوں گا۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

"مرضی ہے تمہاری۔ ورنہ میں بنا ہی دیتی۔" انداز پہلے جیسا ہی تھا۔ تقی پیر پٹختا اس کے قریب سے گزر کر کمرے میں چلا گیا۔ شفا کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر کچن میں آیا تو شیلف پر چائے کا مگ تیار پڑا تھا ایک پلیٹ میں دو چکن رول بھی تھے۔ اسے شفا پر غصہ تھا جو اگرچہ کم تو ہو گیا تھا' لیکن تھا تو ناں اور کھانا بھی نہیں چاہتا تھا' لیکن ان کی شکل اور خوشبو اتنی اشتہا انگیز تھی کہ وہ ہاتھ بڑھانے سے خود کو روک ہی نہیں سکا۔ یہی حال چائے کا تھا۔ مگ کے نیچے ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا۔ لکھا تھا۔

"صفائی نصف ایمان ہے۔

اور شکر کرو چوٹ لگی ہے' اگلی بار بھی اپنے حصے کا کام نہ کیا تو یہ بازو ٹوٹ بھی سکتا ہے... پھر نہ کہنا کہ پہلے

خبردار نہیں کیا۔"

تقی نے کاغذ چڑمڑ کرکے اچھال دیا۔ ہنسنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بے ساختہ امنڈتی مسکراہٹ کو بھی چہرے پر پھیلنے سے روک نہیں سکا۔ اس مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے اس نے چائے کا مگ لبوں سے لگالیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز وہ پھر اسے وہاں چھوڑ گیا اور پھر کچھ دن کے لیے یہ روٹین سی بن گئی تھی، تقی جاتے ہوئے اسے ابا کے گھر چھوڑ جاتا۔ شفا کو سب گھر والوں سے گھلنے ملنے کا موقع مل رہا تھا جتنا وہ تقی سے فرینک تھی۔ اس سے زیادہ اس کے گھر والوں سے ہو رہی تھی، خاموشی سے ان سب کے درمیان ایک تعلق استوار ہو رہا تھا جس کا ٹوٹنا مشکل لگتا تھا۔ ایک روز شفا نے تقی سے پوچھ لیا۔

"عمیر بھائی سے کب بات کرو گے؟"

"میں بہت مصروف رہا ہوں، لیکن آج پہلی فرصت میں سمیر کو کال کرتا ہوں۔ وہ روحیل کو لے آئے اور روحیل عمیر بھائی کو سب سچ بتا دے تو سارا معاملہ ایک گھنٹے میں سمیٹ لیا جائے۔" تقی نے کہا۔

"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ روحیل سچ ہی بولے گا۔" شفا جیسے مایوس ہی تھی۔

"اس کے تو اچھے بھی سچ بولیں گے، ایک بار اسے میرے ہاتھ تو آنے دو۔" تقی نے کہا۔ "اچھا سنو، آج میرے لیے تیار ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تم تو تیار ہو کر بھی ایسی ہی لگتی ہو جیسی اب لگ رہی ہو۔"

تقی نے اچانک شرارت سے کہا تھا۔

شفا شرمندہ ہی ہو گئی۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارے لیے تیار ہونے کا۔ وہ تو سبین بھابھی اور آنٹی مجبور کرتی ہیں تو میں ہو جاتی ہوں۔"

تقی کی شرارتی مسکراہٹ نہ گئی اور شفا کو بری طرح سلگاتی رہی۔ وہ چڑ کر اندر آگئی۔

"السلام علیکم آنٹی!" تقی کی امی وہیں دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔

"وعلیکم السلام... تم نے پھر مجھے آنٹی کہا۔ کتنی بار منع کر چکی ہوں کہ آنٹی نہ کہا کرو، امی کہا کرو۔ اور یہ تم پھر اول جلول حلیہ بنا کر آگئیں۔ کوئی ڈھنگ کے کپڑے کیوں نہیں پہنتیں تم۔" انہوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

وہ ان کی پیار بھری ڈانٹ پر ہنس دی۔

"صبح کو جلدی جلدی نکلنا ہوتا ہے پھر تقی اتنا شور مچاتا ہے کہ مجھے خیال ہی نہیں رہتا۔" اس نے ان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، یہ نہیں بتایا کہ ان کے دلوائے ہوئے کپڑے صرف اس خیال سے نہیں پہنتی کہ تقی مذاق نہ اڑائے۔

"بیٹی! بیاہتا عورتیں اپنے پہننے اوڑھنے سے ہی تو پہچانی جاتی ہیں اور اچھا بھی لگتا ہے کہ بن سنور کر رہیں۔"

"اچھا آپ خفا نہ ہوں۔ کل اچھا سا فینسی سوٹ پہن کر ہی آؤں گی اور یہ کیا پھیلا رکھا ہے آپ نے؟" اس نے صحن میں بکھرے پائپ اور جھاڑو کو دیکھ کر پوچھا بلکہ "حقیقتاً" بات بدلی۔

"کام والی چھٹی کر گئی۔ سبین کے لیے جھکنا اٹھنا مشکل ہے لیکن صحن گندا دیکھ کر تقی کے ابا غصہ کریں گے تو میں نے سوچا میں ہی صاف کر لوں۔"

"اب میں جو آگئی ہوں، آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے پچھلے روز کے برتن انہیں پکڑائے اور خود جھاڑو اٹھالی۔

"ارے رہنے دو تم، کہاں کرو گی، تم سے تو ابھی میٹھے میں ہاتھ بھی نہیں ڈلوایا میں نے۔"

"اب کیا میٹھے پھیکے کے تکلف میں پڑنا امی! اور ویسے بھی ہماری شادی کو کون سا روایتی طریقے سے ہوئی ہے کہ ہر رسم ہی پوری کی جائے۔"

"جو نہیں ہوا نہ سہی لیکن مجھے اپنے شوق تو پورے کر لینے دو۔"

"اچھا جیسے آپ خوش۔ جب دل کرے میٹھا پکوا لیجیے گا، لیکن ابھی یہ کام کرنے دیں مجھے۔ کیونکہ آپ کریں گی تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

اس نے نلکا کھولا اور شڑاپ شڑاپ صحن دھلنے لگا۔

جب تک وہ فارغ ہوئی سبین چائے بنالائی۔ ان تینوں نے وہیں صحن میں چارپائی بچھا کر دھوپ میں بیٹھ کر چائے پی اور مونگ پھلی کھائی۔ عورتوں کو باتیں کرنے کا اتنا شوق ہوتا ہے۔ پھر سردیوں کے تو دن بھی چھوٹے۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ سونے پر سہاگہ ہلکے پھلکے سے بادل بھی آسمان پر نمودار ہونے لگے اور دن کے بارہ بجے ہی دھوپ ماند پڑ گئی۔

"لگتا ہے بارش ہو گی۔" شفا نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

سبین کسی کام سے اندر گئی تو امی نے بات چھیڑ دی۔

"شفا... ! تم اور تقی صبح کیا بات کر رہے تھے؟ میں وہیں گیٹ کے پاس تھی، کچھ نہ کچھ کان میں تو پڑی تھی، لیکن پوری بات نہیں سمجھی؟" ان کا انداز سرسری سا تھا۔

"میں تقی سے پوچھ رہی تھی۔ عمیر بھائی سے کب بات کرے گا... وہ بات کرے گا تب ہی تو عمیر بھائی کو پتا چلے گا۔ اس رات جو بھی ہوا، اس میں میری غلطی نہیں تھی بلکہ وہ سب ساہر بھابھی نے کیا تھا۔"

وہ دوپہر کے لیے مٹر چھیل رہی تھی ان سے چونکہ بہت بے تکلف ہو چکی تھی سو بنا جھجکے بتا گئی۔

"لیکن اس سب کی اب کیا ضرورت ہے؟" امی نے کہا۔ وہ حیران رہ گئی۔

"جی؟"

"دیکھو بیٹی! مجھے غلط مت سمجھنا۔ تم میرے لیے بالکل بیٹیوں کے جیسی ہو، لیکن جو جگہ ساہر کی ہے۔ وہ تو کوئی نہیں لے سکتا۔ اس روز جتنی بھی بدنامی ہونا تھی وہ تو ہو ہی چکی۔ تم لوگ عمیر کو سچائی بتا کر ساہر کو اس کی نظروں میں گرا دو گے، لیکن ایک ایک بندے کو پکڑ کر تو یاور نہیں کروا سکتے کہ تم بے قصور تھیں اور اس روز تم پر بے وجہ انگلی اٹھائی گئی... جتنی عزت جانا تھی۔ وہ تو گئی، لیکن تم گھاٹے میں تو پھر بھی نہیں رہیں، تقی جیسا شوہر مل گیا۔ عزت دار گھرانے کی بہو بن گئیں اور ایک لڑکی کو کیا چاہیے ہوتا ہے... ؟ خون کے رشتے چھوڑے نہیں جاتے جلد یا بدیر عمیر بھی تم سے راضی ہو ہی جائے گا، لیکن جو کچھ تم اور تقی کرنا چاہ رہے ہو، اس کے بعد ساہر کا گھر نہیں بچے گا... اسے ماں کی التجا سمجھ لو۔ تقی کو منع کر دو کہ عمیر سے کوئی بات نہ کرے... اور سچ کہوں تو یہ تمہارے حق میں بھی بہتر ہی ہے کیونکہ جس کی عزت کو نشانہ بنایا گیا ہو، اسے تو پھر کوئی اور پوچھتا بھی نہیں ہے، خواہ اس کا کردار کتنا ہی صاف ستھرا کیوں نہ ہو... میں ذرا یہ سبزی اندر رکھ دوں۔"

نرم لہجہ، سیدھا صاف ستھرا انداز... کچھ باتیں انہوں نے صاف صاف کہیں، کچھ اس لیے چھوڑ دیں کہ وہ خود مطلب اخذ کر لے۔

وہ سارا پانی جو آسمان پر پھیلے بادلوں میں تھا، آن کی آن شفا کے وجود کو سرد کر گیا تھا۔

وہ کیسے بھول گئی کہ ساہر بھابھی اس گھر کی بیٹی تھیں

وہ بہو۔

اور بہو کا مقام کبھی بیٹی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔

یہ ریت ہے، یہ رواج ہے۔ یہ مشرقی معاشرے کا عام چلن ہے۔

بہو کو بیٹی کہہ کر پکار لینے سے اس کا رتبہ بھی بیٹی جیسا نہیں بن جاتا۔

مقابلے کی باری آئے تو بیٹی بلا مقابلہ جیت کی حق دار ٹھہرائی جاتی ہے۔

کوئی سو میں سے ایک گھرانا ہو گا جو بیٹی کہہ کر بیٹی سمجھ بھی لیتا ہے اور اس ایک گھرانے کا ذکر زمین پر تو نہیں ملتا، کتابوں میں ہی ملتا ہے۔

شفا بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کر چیزیں سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے اور ہمارا گھر اچھرے میں ہوا کرتا تھا تو ہمارے گھر کے پاس ایک چھوٹی سی بیکری تھی چھوٹی اور بڑی عید یا عید میلاد النبی کے موقع پر اس بیکری کو فینسی لائٹس اور گڈی کاغذ کی

جھنڈیوں سے سجا دیا جاتا تھا۔ وہ بیکری سجنے کے بعد اٹریکٹو کم مزاحیہ زیادہ لگنے لگ جاتی تھی۔ پتا نہیں کیوں تمہیں اس طرح تیار ہوا دیکھ کر مجھے وہی بیکری یاد آجاتی ہے۔"

گھر کے سامنے بائیک روکتے ہوئے تقی نے جتنی سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا تھا' اس کا اختتام اتنا ہی غیر سنجیدہ تھا۔ اس کے باوجود شفا نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اتر کر گیٹ کا لاک کھولنے لگی۔

آج رضی کو کہیں جانا تھا سو اسے تقی کے ساتھ ہی واپس آنا پڑا۔

تقی کو اس کی خاموشی پر حیرت ہوئی۔ وہ تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والوں میں سے تھی۔

شفا گیٹ کھول کر انتظار کرنے لگی کہ وہ بائیک اندر لے آئے۔

"مزاحیہ سی بیکری' مزاحیہ سی شفا۔۔۔" وہ ابھی بھی باز نہیں آرہا تھا۔

"تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ میں تمہارے لیے تیار نہیں ہوتی۔" شفا نے ترخ کر کہا۔ "پہلے بھی بتایا تھا' تمہاری امی اور بھابھی اصرار کرتی ہیں تو میں تیار ہوجاتی ہوں ورنہ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے' اس طرح ہر روز سج سنور کے بیٹھنے کا۔۔۔ ویسے بھی میں تمہاری زندگی اور تمہارے گھر میں اپنا اسٹیٹس اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ کوئی خوش فہمی نہیں ہے مجھے کسی بھی چیز کے بارے میں۔"

وہ بنا گیٹ بند کیے تیز قدموں سے چلتی اندر چلی گئی۔ تقی حیران ہوا۔ ایسا بھی کیا کہہ دیا تھا اس نے کہ اس طرح سے ری ایکٹ کیا جاتا۔ اور اس کا موڈ تو ابھی سے خراب تھا۔ ابھی تو بری خبر سنانی تھی۔

بارش شروع ہوگئی تھی۔ شفا نے لائٹس جلائیں پھر بیڈ پر گر گئی' لیکن اس طرح لیٹنا بے فائدہ تھا وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی۔ روشن دان بار بار بجلی کے کڑکنے سے روشن ہو رہا تھا اور گرج چمک اندر تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ واش بیسن پر جھکی اور زور زور سے پانی کے چھپاکے منہ پر مارنے لگی۔ کتنے ہی آنسو پانی میں مدغم ہو کر اس کے چہرے پر بہتے چلے گئے۔

جس وقت تقی نے دروازے پر دستک دی' وہ باتھ روم سے نکل رہی تھی۔

تقی وہیں دروازے میں کھڑے کھڑے بات کرلینا چاہتا تھا' لیکن اس پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ اس کی آنکھیں ساری داستان بیان کر رہی تھیں۔

"ذرا باہر آنا۔۔۔ بات کرنی ہے۔" وہ جواب سنے بغیر ہی واپس مڑ گیا۔ شفا جو طبیعت کی خرابی کا بہانا کرنے والی تھی ناچار باہر آنا پڑا۔

ٹی وی پر کوئی مزاحیہ ٹیلنٹ ہنٹ شو چل رہا تھا۔ تقی بالکل سامنے ہاتھوں کے پیالے میں منہ رکھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے خبرنامہ سن رہا ہو۔

"کیا بات ہے؟"

تقی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میں نے کافی بنائی تھی' سوچا تمہیں بھی پلا دوں۔۔۔ اتنی بہترین کافی تم نے آج تک نہیں پی ہوگی۔"

شفا نے اب دیکھا۔ میز پر دو مگ بھی رکھے تھے۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی بیٹھ گئی۔

"تم نے روحیل کا پتا کیا؟"

"ہاں۔" تقی نے چند لمحوں کے توقف سے جواب دیا تھا۔ وہ تذبذب کا شکار تھا کہ بتائے یا نہیں پھر اس نے حتمی فیصلہ کیا اور اسے صاف ہی بتانے لگا۔

"میری سمیر سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا' روحیل تو اس واقعہ کے دو دن بعد ہی واپس چلا گیا تھا اور واپس جانے کے بعد سے اس کا سمیر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔۔۔ بلکہ سمیر ہی نہیں روحیل کی بہن کو بھی نہیں پتا' وہ امریکا واپس جاکر کہاں غائب ہوگیا ہے۔۔۔ اس کے سب دوست بھی لاعلمی ظاہر کر رہے ہیں۔"

شفا نے تھک کر صوفے سے ٹیک لگالی۔ ایک پل کی بات تھی' اس کی ساری امید گئی۔

آنکھوں میں چھپائے ہوئے سارے آنسو باہر نکلنے کو مچلنے لگے تو آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں اور کوشش کے باوجود کئی آنسو گالوں پر بہتے چلے گئے۔

"شفا۔۔۔" تقی مشکل میں آگیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

حیران وہ اس کی حالت پر تھا۔ بڑی سے بڑی بات پر بھی اس نے اسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ آج ایسا کیا ہوا کہ رونے لگی۔ وہ تو امید چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"مجھے نہیں یاد' میرے ماں باپ کا انتقال کب ہوا۔ میں نے تو جب ہوش سنبھالا۔ عمیر بھائی کو ہی اپنی ماں' اپنا باپ بنے دیکھا۔۔۔ ایک بار اسکول میں کسی سے میری لڑائی ہوگئی اور ٹیچر نے عمیر بھائی کو بلا کر میری شکایت لگائی اور کہا کہ میں نے اس لڑکی کو دھکا دیا ہے۔۔۔ پتا ہے تقی! عمیر بھائی نے یہ بات ماننے سے ہی انکار کر دیا' مجھے آج بھی یاد ہے انہوں نے کہا تھا۔۔۔ مجھے اپنی شفا پر پورا بھروسا ہے' وہ ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتی۔۔۔ انہوں نے مجھ سے آکر پوچھا بھی نہیں اور کہہ دیا۔ اتنا بھروسا تھا انہیں مجھ پہ۔۔۔ میں اب بھی تو وہی شفا ہوں پھر عمیر بھائی نے اس بار میرا یقین کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے یہ کہہ کر سب کے منہ کیوں بند نہیں کروا دیے کہ میں ان کی شفا ہوں اور ان کی شفا ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتی۔۔۔ میں تو کسی کے سامنے ان کی نظریں جھکنے نہیں دیتی تھی' انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا۔ میں اتنی دنیا کے سامنے ان کا سر جھکا سکتی ہوں۔"

وہ تحمل سے بول رہی تھی' لیکن آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ بڑی دیر تک روتی رہی۔ تقی خاموش ہی رہا اور اسے رونے دیا جب وہ رو چکی اور شرمندہ شرمندہ سی نظر آنے لگی تو اس نے اس کے سامنے ٹشو پیپر کا ڈبہ رکھ دیا۔

"ایسا نہیں ہے کہ عمیر بھائی کو تم پر بھروسا نہیں۔" اس نے کہا۔ شفا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"یہ وہ ملک ہے جہاں غیرت کے نام پر قتل ہوجایا کرتے ہیں اور تم پر جو الزام لگا۔۔۔ وہ اچھے خاصے انسان کا دماغ الٹا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ عمیر بھائی بھی عام سے انسان ہیں جتنا اب تک میں انہیں سمجھا ہوں' انہیں بھی اپنے اعصاب پر اتنا کنٹرول نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے تم کو کچھ نہیں کہا بلکہ نکاح کرکے تمہیں اس گھر' اس علاقے سے رخصت کرنا زیادہ مناسب سمجھا تو اس کا صاف اور سیدھا سا مطلب یہی ہے کہ انہیں کسی کی بات پر بھروسا نہیں تھا۔ وہ اسی لیے تمہیں اس ماحول سے نکال دینا چاہتے تھے کہ تمہیں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔۔۔ اس سے زیادہ وہ تمہاری محبت میں اور کیا کرتے۔" تقی نے نرم لہجے میں اس کی بدگمانی دور کرنا چاہی تھی۔

"ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ابھی وہ خود بھی پریشر میں آگئے ہوں اور اپنے آپ کو سمجھ نہ پائیں۔۔۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرے گا' بدگمانی کی گرد بیٹھ جائے گی۔"

"اور پتا نہیں اس گرد کو بیٹھنے میں کتنا وقت لگے گا۔" اس نے مایوسی سے کہا تھا۔

"زیادہ نہیں لگے گا۔۔۔ اس بات کی گارنٹی میں تمہیں دیتا ہوں۔" تقی نے کہا پھر اپنی سابقہ جون میں واپس آتے ہوئے بولا۔

"اب اٹھو' کافی کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے لے کر آؤ' لیکن یاد رکھنا۔ یہ کافی تم پر قرض ہے۔۔۔ تمہاری اتری ہوئی شکل دیکھ کر ترس آگیا تھا پھر سردی بھی اتنی زیادہ ہے' میں نے پتا نہیں کس دل سے تمہیں تھوڑی سی دے دی ہے ورنہ میں کافی خود بناتا ہوں اور خود ہی پیتا ہوں' کسی اور کو نہیں دیتا۔۔۔ تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"اچھا شکریہ' مہربانی' نوازش۔" شفا نے مسکرا کر مگ اٹھالیا' بلاشبہ اس تھوڑی سی گفتگو نے اس کے دل کا بوجھ قدرے کم کر دیا تھا۔

"تقی۔۔۔! اب روحیل تو پتا نہیں کب ملے۔۔۔ اللہ کرے اس کی خبر جلدی مل جائے۔۔۔ تم ایسا کرو' میری مہک سے ہی بات کروا دو۔ اس کی غلط فہمی تو دور ہو۔" اس نے سادگی سے کہا تھا۔

تقی کے چہرے سے رنگ ایک پل کو غائب ہوئے' اگلے ہی پل اس نے سرہلا کر ٹی وی کی آواز اونچی کردی۔

"سنو۔۔۔ ذرا یہ مگ کچن میں رکھتی جانا۔" وہ مڑنے لگی تو تقی نے کہا۔

"لیکن تم نے تو کافی پی ہی نہیں۔" اس نے بھرے ہوئے مگ کو حیرانی سے دیکھا۔

"بس اب موڈ نہیں رہا۔" اس نے ٹی وی کی آواز اور اونچی کرلی۔ شفا نے مگ کچن میں رکھ کر واپس آتے ہوئے اپنی کافی کا گھونٹ لیا تھا اور لیتے ہی جیسے ابکائی سی آگئی تھی۔

"یخ۔۔۔ یہ کیا چیز ہے۔"

"کافی ہے۔۔۔" تقی نے اطمینان سے کہا۔

"اتنی بدذائقہ کافی۔۔۔ بلکہ بدذائقہ کہنا بھی غلط ہے۔ یہ تو کوئی عجیب ہی چیز ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جوشاندہ میں تھوڑی سی کڑواہٹ ڈال کر دے دی ہے۔"

"میں تو ایسی ہی کافی بناتا ہوں۔ بتایا تو تھا' خود بنا کر خود ہی پیتا ہوں۔" بڑی معصومیت اور فخر سے جواب آیا تھا۔

"اچھا ہی کرتے ہو۔۔۔ کیونکہ اس فضول چیز کو کوئی اور پینے کا رسک نہ ہی لے تو اچھا ہے۔" وہ جل کر بولی تھی۔ "اونہہ۔۔۔ سارا منہ کا ذائقہ خراب کردیا' واپس کرو میرا شکریہ۔"

اس نے انتہائی برا منہ بنا کر کہا تھا۔ تقی زور' زور سے ہنسنے لگا۔ شفا پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

روحیل کی کچھ خبر نہ مل رہی تھی۔ تقی نے مہک سے بات کرنا چاہی' تو پتا چلا' وہ آؤٹنگ کے لیے ہوائی گئی ہوئی تھی۔ اتنی معلومات بھی مشکل سے دی گئیں' ورنہ اس کے گھر والے تو بتانے کو بھی تیار نہیں تھے۔ ان سب کو تقی پر غصہ تھا۔ تقی کو ان سے بھی زیادہ ان کے بدتمیزی والے رویوں پر غصہ آیا۔ اس نے دوبارہ فون نہ کرنے کی قسم کھائی اور چند روز کے لیے شیڈول کے تحت کراچی چلا گیا۔ چونکہ شوٹنگ سے متعلقہ کام کراچی میں ہی ہونا تھا۔ سو اس کا کچھ پتا نہ تھا' کتنے دن لگ جاتے۔

"میں تم سے بڑی ہی شرمندہ ہوں بیٹی! اس روز اپنی جھونک میں پتا نہیں کیا' کیا بول گئی تھی۔ دراصل ساہر کو بیٹی بنا کر پالا۔ اپنی ماں ـــــــ سے زیادہ میرے ہاتھوں میں پلی ہے۔ اس کا گھر اجڑنے کا خیال ہی سوہان روح لگتا ہے۔ لیکن تم بھی تو کسی کی بیٹی ہو اور جو ساہر نے تمہارے ساتھ کیا اس کی معافی دینا مشکل کام ہے۔ ساہر نے جو بویا خود اس کا پھل کاٹے گی بھی۔۔۔ بس ہوسکے تو میرے لفظوں کو بھول جانا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

"آپ کیوں فکر مند ہوتی ہیں۔ میں بھی نہیں چاہتی کہ بھابھی کا گھر خراب ہو۔" اس نے انہیں روحیل کے متعلق بھی بتادیا۔

"اب جب تک روحیل کا پتا نہیں چلتا' کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔۔۔ میں وعدہ تو نہیں کرسکتی لیکن پوری کوشش کروں گی' وہی ہو جو آپ چاہتی ہیں۔ مجھے تو صرف اپنے بھائی کی ناراضی ختم کرنا ہے اور کچھ نہیں۔ (اور ابھی تو مجھے یہ بھی سوچنا ہے کہ یہاں سے نکل کر کرنا کیا ہے۔)"

وہ کل تقی کی باتوں اور اب ان مہربان خاتون کی باتوں سے خاصی مطمئن ہوگئی تھی' سو مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ جبکہ دل میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے چائے بنائی تھی۔ امی کہیں نظر نہ آئیں تو ابا کو خود ہی دینے چلی آئی۔

وہ صحن میں کرسی میز پر اپنی بساط بچھائے منہمک بیٹھے تھے۔ شفا نے دو' تین بار آہستہ سے انہیں پکارا' مگر وہ اتنے منہمک تھے کہ نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

اتنے دن میں وہ یہ تو جان گئی تھی کہ وہ شطرنج کے شوقین ہیں' لیکن کھیلتے ہوئے اتنے "مگن" ہوجاتے ہیں' یہ نہیں پتا تھا۔

کچھ دیر متذبذب سی کھڑی رہی اور کھڑے کھڑے چونکہ بساط پر نظر بھی ڈال رہی تھی' سو دو' تین چالیں بہت واضح اسے بھی نظر آگئیں۔ اب خود پر جبر کرکے کھڑے رہنا مشکل تھا۔ شطرنج کے کھلاڑی کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ سامنے بساط بچھی ہو تو بنا چال چلے وہاں سے ہٹ جائے۔

سو وہ بھی چپکے سے کرسی اٹھا لائی' احتیاط سے میز کے دوسری طرف رکھی۔ ابا نے چشمے کے اوپر سے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔

"آپ بھی شوق رکھتی ہیں؟" ذرا سا حیران ہوئے۔ شفا نے نہ ان کی طرف دیکھا' نہ جواب دیا' بس پرسوچ نظروں سے بساط کو دیکھتے ہوئے چال دی۔

"بھئی واہ۔۔۔" ابا عش عش کر اٹھے۔ کیا زبردست چال چلی تھی' اتنی دیر سے غور کررہے تھے' مگر مجال ہے جو سمجھ میں آرہی ہو۔ کہاں ان جیسے منجھے ہوئے کھلاڑی اور کہاں یہ کل کی لڑکی۔ اس نے ایک چال چل کر ساری گیم کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ انہیں لطف آیا۔ حریف ہم پلہ ہو تو مقابلے کا مزہ بھی آتا ہے' سو کمر کس کر میدان میں اتر آئے۔

اب چال پر چال چلی جانے لگی۔ کبھی شہ مات اور کبھی مات کو شہ۔۔۔ آدھ گھنٹہ بعد آخری چال چلی گئی۔ تب تک چائے ٹھنڈی یخ ہوچکی تھی۔ جیت البتہ ان کی ہی ہوئی۔

"شاباش۔۔۔" انہوں نے باقاعدہ تالی بجائی تھی۔

"آج بڑے عرصے بعد کھیلنے کا اتنا لطف آیا ہے' مجھے تو پتا ہی نہیں تھا' شفا بیٹی اتنی اچھی شطرنج کھیل لیتی ہے۔"

شفا نے مسکرا کر اس تعریف کو حق کی طرح وصول کیا۔

"میں ہار گئی' لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ اگلی بار میں آپ کو جیتنے دوں گی۔" اس نے مزے سے کہا تھا۔

"ضرور' ضرور۔" وہ بھی راضی تھے۔ "اتنا اچھا کھیلنا سیکھا کہاں سے؟"

"اسکول لیول پر کھیلا کرتی تھی۔ خواہش بہت تھی' لیکن ڈسٹرکٹ لیول تک پہنچ نہیں سکی۔" اس نے ذرا سی شرمندگی سے کہا تھا۔

"وجہ کیا ہوئی؟"

"میچز کے دوران خالہ کے بیٹے کی شادی آگئی۔ شادی بھی ضروری تھی میچز بھی۔۔۔ لیکن شادی ظاہر ہے' زیادہ ضروری تھی سو۔۔۔ اپنا نام کٹوا دیا۔" وہ مسکرا کر بول رہی تھی۔

"اوہو۔۔۔ برا ہوا۔۔۔ خالہ کے بیٹے کی شادی نے ایک اچھی پلیئر کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔" وہ اس سے ایسے بات کررہے تھے جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو اور ان کے سامنے تو بچی ہی تھی۔

وہ خفیف سا ہو کر ہنس دی۔

"اب آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں' اتنا اچھا بھی نہیں کھیلتی۔"

"خیر بیٹے! یہ تو کسر نفسی سے کام لیا آپ نے۔ اگر تھوڑا اور موقع مل جاتا تو مجھے یقین ہے' بہت نام کماتیں آپ شطرنج میں۔ آپ سے بہتر۔ کوئی نہ کھیل سکتا۔ میری مانو' ابھی بھی دھیان دے لو۔ اپنے ٹیلنٹ کو ضائع نہ کرو۔" وہ جیسے اس کی صلاحیت پر بہت ہی

ہوں سے۔
"ابھی تو شفا نے چائے بنانے میں نام کمایا ہوا ہے۔" امی وہاں آگئی تھیں اور ان کے انداز کہتے تھے جلی بیٹھی ہیں۔
"جاؤ بیٹی! ان کے لیے اور چائے بنا لاؤ۔ پہلے سے بنائی ہوئی گرم کرکے تو پئیں گے نہیں۔۔۔ اونہہ لے کے سارا کپ ضائع کروادیا۔ ٹیلنٹ ضائع نہ کرو۔ اسی ٹیلنٹ کے چکر میں اپنی ضد کے ہاتھوں میرا بیٹا ضائع کروا رہے تھے۔ آئے بڑے ٹیلنٹ کے قدردان۔" وہ بڑبڑانے لگیں' آواز ظاہر ہے اتنی ہی رکھی کہ ابا صرف انہیں بڑبڑاتے دیکھیں' سن نہ پائیں۔
"شطرنج کوئی عام کھیل نہیں ہے۔ یہ مائنڈ گیم ہے' مائنڈ گیم۔ ہرا یرا غیرا نہیں کھیل سکتا' لیکن اس بچی میں صلاحیت ہے۔ حیرانی مجھے اس بات کی ہے کہ جب یہ شطرنج کھیل سکتی ہے تو تقی جیسے نالائق کی باتوں میں کیسے آگئی۔" شفا نے جاتے ہوئے سنا' ابا کہہ رہے تھے۔
"تو کیوں۔۔۔ کیا برائی ہے میرے تقی میں؟" امی تڑخ کر بولی تھیں۔ ابا نے پتا نہیں کیا کہا۔ شفا تو چپکے سے اندر کھسک لی۔



دیوار پر شفا کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ساہر نے سب سے پہلے اسے ہی اتار کر اس کی جگہ ہدیہ اور عادل کی تصویر لگائی اور اس کے بعد کمرے کی ایک ایک چیز بدل ڈالی۔ بیڈ شیٹ' پردے' صوفہ' وال ہینگنگز' نائٹ بلب کا کلر۔۔۔ چھت پر رات کی منظر کشی کرتا وال پیپر لگوادیا' دیواروں کا رنگ بدل دیا۔ کل ملا کر شفا کی ایک ایک چیز کو بچوں کی چیزوں سے تبدیل کردیا تھا۔ وہ شفا کو گھر سے نکال چکی تھی۔ اب اس سے وابستہ چیزوں کو نکال رہی تھی' لیکن یہ اتنا بھی آسان نہیں تھا۔
قدم قدم پر شفا کے حوالے بکھرے تھے۔ کسی نہ کسی چیز پر' بات میں وہ یاد آجاتی۔ سب سے بڑی بات عمیر کی اتری ہوئی صورت' یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ وہ اسے اتنی جلدی دل و دماغ سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔
انہوں نے ساہر سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس خاموش ہوگئے تھے۔ صبح آفس چلے جاتے۔ جانے سے پہلے ناشتا کرلیتے۔ واپس آتے اور کمرے میں بند ہوجاتے یا لیپ ٹاپ پر مصروف یا ٹی وی اوڑھنا بچھونا۔ بات کرلی تو جواب مل گیا۔ ورنہ ایک لامحدود چپ۔ بچوں کو پیار کرلیتے۔ ان سے بات کرلیتے۔ وہ ضد کرتے تو کھیل بھی لیتے۔ لیکن وہ خود کہتے تب۔ عمیر نے جیسے کسی بھی چیز کی ڈیمانڈ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے گرد خول بناتے جارہے تھے۔ نارمل انسان تھے۔ لیکن اب نارمل ہوتے جارہے تھے۔
یہ سب کچھ ناقابل قبول تھا۔ شفا گئی تھی تو کیا ہوا' آگے ان کی اولاد تھی اور اپنی اولاد کے لیے تو انہیں خود کو نارمل رکھنا ہی چاہیے تھا۔
ساہر نے جب بھی بات کرنا چاہی موضوع بدل دیے' ایک روز تو اتنے سخت لہجے میں ڈانٹا کہ دوبارہ ساہر ہمت ہی نہ کرسکی۔
اسے کبھی کبھی تقی کی باتیں یاد آنے لگتیں' تو ڈر جاتی' پھر سر جھٹک کر اس خوف سے پیچھا چھڑاتی۔
"ابھی زخم تازہ ہے۔ آہستہ آہستہ عمیر' شفا کو بھول جائیں گے۔" وہ خود کو تسلی دے لیتی تھی۔ لیکن بھول جانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔
بیڈ شیٹ بچھا کر اس نے کمرے پر تفصیلی نظریں ڈالیں۔
"ہدیہ کو روم کیسا لگ رہا ہے؟"
"مما! یہ روم اب میرا ہوگا؟" ہدیہ نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔
"جی جانو! یہ اب آپ کا ہے؟" اس نے پیار سے ہدیہ کا گال تھپتھپایا تھا۔
"شفا پھپھو کا روم اب میرا ہوگا۔ مما! میں بڑی ہوکر شفا پھپھو بنوں گی۔" پتا نہیں یہ سوال تھا یا ارادہ' لیکن ساہر دہل گئی۔
"اللہ نہ کرے۔" اس نے بے ساختہ دل پر ہاتھ

رکھا تھا۔ پھر اپنی بے اختیاری پر شرمندہ سی ہوگئی۔
"چلو ہدیہ! دیکھتے ہیں' عادل سو کر اٹھا یا نہیں۔"
اس نے ہدیہ کا ہی نہیں اپنا بھی دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی۔



"میں نے تو تمہیں سو بار سمجھایا۔ کبھی ڈھکے چھپے لفظوں میں اور کبھی بالکل کھلم کھلا۔۔۔ کہ اپنی پیاری ساہر بھابھی سے ہوشیار رہا کرو۔۔۔ لیکن تم۔۔۔ ایک نمبر کی گدھی۔۔۔ اب کیسا مزہ چکھایا انہوں نے۔" ثمر اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کے بابا چھوڑ کر گئے تھے اماں کو بتائے بغیر۔
"بس جو قسمت میں ہوتا ہے۔ وہ مل کر ہی رہتا ہے۔" شفا نے تحمل سے کہا تھا۔
"چلو پھر بھگتو اس مصیبت کو' قسمت کا لکھا سمجھ کر۔" وہ جل ہی گئی۔ "تم انسانوں کی اس کیٹگری سے تعلق رکھتی ہو جو گھر میں لگی ہوئی کیل سے بار بار ٹھوکر کھانے کے بعد بھی نہیں سنبھلتے۔ بار بار گرتے ہیں۔ بار بار زخمی ہوتے ہیں۔"
"خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں بس عمیر بھائی کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے خاموش رہتی تھی۔ مجھے پتا ہوتا' میری خاموشی مجھے یہ دن دکھا دے گی تو کبھی اتنا کمپرومائز نہ کرتی۔" وہ افسردہ سی ہوگئی تھی۔ ثمر نے فی الفور موضوع بدل دیا۔
"اچھا تم اداس نہ ہو۔ ساہر بھابھی نے جو کیا ہے' وہ اسے ضرور بھگتیں گی۔"
"وہ بھگتیں یا نہ بھگتیں' مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ ان کی اب کوئی عزت نہیں ہے میرے دل میں۔ لیکن مجھے اپنے بھائی سے تو ملنا ہے۔ عمیر بھائی کی خفگی کا خیال مجھے رات کو سونے بھی نہیں دیتا۔" وہ رونے لگی تھی۔
"تم کیوں روتی ہو' تم دیکھنا' عمیر بھائی جلد مان جائیں گے۔" ثمر نے اسے ساتھ لگا کر دلاسا دیا تھا۔
"روحیل کا کچھ پتا چلے گا تب نا۔" وہ بہت ہی مایوس ہوچکی تھی۔ "پتا نہیں' میں نے اللہ کو اتنا ناراض کیسے کردیا کہ اس نے میری زندگی کے سب سے قریبی رشتے کو ہی مجھ سے دور کردیا۔ میرا تو اور کوئی تھا بھی نہیں ثمر۔" وہ باتیں جو وہ کسی سے نہیں کرسکتی تھی' ثمر سے بنا جھجکے کر رہی تھی۔
"گھر بڑا اچھا سیٹ کیا ہے تم نے۔" ثمر سر اٹھا کر ستائشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک بالکل غیر متعلق بات سن کر شفا حیران ہی ہوئی۔
"تقی کی امی نے بہت مدد کی۔ ورنہ تمہیں پتا ہے گھر' ور سجانے کے معاملے میں میری صلاحیت زیرو ہی تھی۔" شفا نے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔
"اچھی خاتون ہیں تقی کی امی۔" ثمر نے کہا۔ وہ بھی یہیں موجود تھیں۔ سو ثمر کی ان سے بھی ملاقات ہوگئی تھی۔ "لیکن تمہارے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے؟ مطلب شکل سے مہربان لگنے والی خاتون اصل میں کتنی مہربان ہیں؟" اس نے بسکٹ کھاتے ہوئے پوچھا تھا۔
"تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔" شفا نے بے ساختگی سے کہا تھا۔
"بلکہ صرف وہ ہی کیوں۔ سب لوگ ہی بہت اچھے ہیں۔ ابا' جری' رضی بھائی' بین' اتنے محبت کرنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں دنیا میں۔"
"اچھا۔۔۔ اور تقی؟ میرا مطلب وہ کیسا ہے؟"
"تقی!" شفا کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ "اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔"
ثمر چونکی۔ (یہ مسکراہٹ کچھ خاص لگی اسے۔ ایسا لگا شفا کے چہرے کا ہر حصہ روشن ہوگیا ہو۔)
"تمہاری مسکراہٹ تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔" ثمر نے شرارت سے کہا تھا۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں تقی کے ذکر پر مسکراؤں۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ "لیکن تقی بہت اچھا ہے۔ بہت بہترین انسان۔
کبھی چھوٹا سا بچہ لگتا ہے اور کبھی ایک بڑے بزرگ کی طرح سنجیدہ۔ اس کا دل بہت خاص ہے' جن کے پاس خاص دل ہوتے ہیں' وہی اس طرح کسی بھی

انجان انسان کی مدد کا حوصلہ کر سکتے ہیں۔
وہ منٹوں میں آپ کا اتنا اپنا بن جاتا ہے کہ لگتا ہی نہیں یہ کبھی غیر تھا۔
اسے کھانا کھانے کا بہت شوق ہے۔ لیکن اگر کوئی جانور بھی اسے بھوکا نظر آجائے تو اپنا کھانا اٹھا کر اسے دے آتا ہے۔ بہت کم لوگ دنیا میں اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ آپ خود بخود دعا کرنے لگیں' اللہ ان کے ساتھ کچھ برا نہ کرے۔"
وہ مسکراتے ہوئے جیسے ایک ٹرانس میں بول رہی تھی۔
"بہت کم وقت میں بہت زیادہ خصوصیات نہیں پتا چل گئیں تمہیں۔" ثمر نے بھی مسکرا کر کہا تھا۔ لیکن اگر شفا اسے غور سے دیکھ لیتی تو جان جاتی' وہ اسے کچھ جتا رہی تھی۔
"میں کبھی اس کے سامنے مانوں گی نہیں' لیکن سچ تو یہ ہے کہ تقی میں خصوصیات ہی بہت ہیں۔ مجھے تو ابھی چند ہی پتا چلی ہیں۔" اس نے شرارت سے کہا تھا۔
"کس قدر احمق ہو تم شفا۔" ثمر نے کہا۔ "ابھی کہہ رہی تھیں' اللہ کو میں نے پتا نہیں کیسے اتنا خفا کر دیا۔ عمیر بھائی تم سے ناراض ہیں' لاتعلق ہیں' لیکن یہ بھی تو دیکھو اللہ نے تمہیں کتنے بہترین انسان سے نواز دیا ہے۔ وہ اتنا بہترین ہے کہ تم خود اس کی تعریف کر رہی ہو' میں یہاں آئی تو سوچ رہی تھی' تم منہ لٹکا کر مایوس اور بے بس بیٹھی ہوگی' لیکن ماشاءاللہ تم تو خوش بیٹھی ہو' تو یہ کس کی وجہ سے ہے۔ تقی کی وجہ سے نا۔"
وہ حیران رہ گئی۔ تھوڑا سا غور کیا' تو واقعی ایسا ہی تھا وہ خوش تو پتا نہیں' لیکن کوئی خاص پریشان بھی نہ تھی۔ قریبی اسکول میں نوکری کرلی تھی۔ تقی کو اکثر شوٹنگ کے سلسلے میں جانا پڑتا تو وہ ابا کی طرف آجاتی۔ ابا اس کی جاب کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن اس نے سب کو اپنا ہم نوا بنالیا' یہ کہہ کر کہ فارغ رہ کر کیا کرے گی۔
بہت دیر وہ یہی سب سوچتی رہی' پھر سر جھٹک کر اس خیال سے خود کو نکالا اور ثمر سے گھر والوں کی خیر' خیریت معلوم کرنے لگی۔
ثمر شام تک رکی' جب جانے لگی تو تقی بھی آچکا تھا۔ سوئے اتفاق سمیر بھی ساتھ تھا۔ گیٹ پر ہی ٹاکرا ہوا۔
ثمر نے تقی سے تو خیر' خیریت معلوم کی' لیکن سمیر پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس ادائے بے نیازی پر سمیر کا ننھا سا دل کٹ کر رہ گیا۔
ابھی ایک غم زدہ گیت گانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ تقی اس کا ہاتھ کھینچ کر اندر لے گیا۔
ثمر شفا کے کان میں گھسی۔
"مجھے یہ سوچ کر بہت فکر ہو رہی تھی کہ تقی بھائی اس بدتمیز لڑکے کے دوست ہیں۔ لیکن تمہاری باتوں سے بہت تسلی ہو گئی ہے۔ ثابت ہوا ضروری نہیں کہ انسان اپنے دوستوں جیسا ہو۔" اس کا اندازہ جلا بھنا تھا۔ شفا کو ہنسی آئی۔ پھر ثمر چلی گئی تو وہ اندر آگئی۔
اندر آتے ہی اسے دوبارہ بڑے زور سے ہنسی آئی تھی' جسے اس نے بڑی مشکل سے روکا۔ سمیر' تقی کے کندھے پر سر رکھے نازیہ حسن کی روح کو تڑپنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"کیا ہوا؟
میرا دل ٹوٹا
میری آنکھیں کھلیں۔
کیا یہ سپنا تھا۔"

"منہ پہ تھپڑ مار کے دیکھ لینا تھا' سپنا ہے یا نہیں۔" تقی جل کر کہا تھا۔ وہ صوفے کی پشت پر سر رکھے نیم دراز تھا۔ اس کے کندھے پر سمیر کا سر تھا اور ان دونوں کی پشت دروازے کی طرف تھی۔
"تقی! میرے دوست' تجھے میری کوئی فکر نہیں؟" درد میں ڈوبی ہوئی آواز۔
"مجھے صرف اپنے کندھے کی فکر ہے۔ دل ٹوٹنے سے اچھا تھا' یہ سر ہی ٹوٹ گیا ہوتا' کم از کم میرے کندھے پر اتنا وزن تو نہ پڑتا۔"
"یار! تو انتہائی بے مروت انسان ہے۔ یہاں دوست بے چارہ غم سے نڈھال ہوا پڑا ہے اور تجھے اپنے کندھے کی پڑی ہے۔"
"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" بے مروتی سے کہا گیا۔
"تو میں بھی جناب کو ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے آفس کے بعد ہی گیا تھا۔ تھکا ٹوٹا ہوا تھا' مگر انکار نہیں کیا۔" سمیر نے عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر کہا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے نا۔ جس دن میں تھکا ہوا نہیں ہوں گا' اس روز تمہارے غم میں شریک ہو جاؤں گا۔" جان چھڑانے والا انداز تھا۔
"اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔" سمیر کا دکھ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔
"اچھا ہی کیا کہ نہیں دیکھا' ورنہ بے چاری ساری رات نیند میں ڈرتی رہتی۔" اس نے بے مروتی سے سمیر کا سر پیچھے دھکیلا۔ "اب پیچھے ہٹو' مجھے ذرا ٹانگیں سیدھی کرنے دو۔" اس نے کاہلی سے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔
"ویسے تقی! ایک بات طے ہے' تم نام کے ہی دوست ہو۔ جب بھی میں نے تمہیں مدد کے لیے پکارا' منہ کی ہی کھائی ہے۔ مجال ہے جو تم نے کبھی میری مدد کردی ہو' الٹا دو اور مسائل بڑھا کر سائیڈ پر ہو جاتے ہو۔"
"واہ کیا زنانہ انداز میں شکوہ کیا ہے۔ یقین کرو تم اس وقت سمیر نہیں سمیرا لگے ہو۔" تقی نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ "لیکن شکوہ کرنے اور طعنے دینے سے پہلے آپ اگر ذرا اپنے ماضی میں جھانک لیں تو اچھا ہوگا۔ یاد کرو سیکنڈ ایئر کے کیمسٹری کے پیپر میں ایم سی کیوز تمہیں کس نے حل کروائے تھے؟ جی ہاں' آپ کا جواب درست ہے۔ اسی احسان فراموش' دوست کے نام پر دھبے تقی نے اور انگلش کا پیپر تو تمہیں پورا کا پورا حل ہی میں نے کروایا تھا' بات کرتے ہو۔"
"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ میری یادداشت کافی اچھی ہے' اب اتنی پرانی باتیں بھی نہیں کہ بھول جاؤں' تم یاد نہ کرواؤ تو اچھا ہے۔" سمیر شرمندہ ہو گیا تھا۔ شفا کوشش کے باوجود اپنی ہنسی روک نہیں سکی۔
آواز پر ان دونوں نے ہی مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔
"سوری۔" شفا شرمندہ ہو گئی۔
"نہیں' اس میں سوری کی تو کوئی بات نہیں' یہ سمیر اپنا ہی ہے۔" تقی نے بے تکلفی سے کہا۔
"بالکل بھابھی۔۔۔" سمیر فوراً" مہذب ہوا۔ "خیر' آپ بتائیں' کیسی ہیں؟"
"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کے لیے چائے لاؤں سمیر بھائی؟"
سمیر نے انکار کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ تقی نے سرعت سے کہا۔
"سمیر چائے نہیں پیے گا' کھانا کھائے گا۔"
شفا جواب دینا چاہ رہی تھی کہ تقی نے اگلا جملہ بول دیا۔
"اور یہ تمہارے ہاتھ کا بنا کھانا کھانا چاہ رہا ہے۔ سارا راستہ میرے کان کھا گیا یہ کہہ کر کہ شفا بھابھی کے ہاتھ کا کھانا کھانا ہے۔ امی سے اس نے تعریف سنی تھی' تمہارے بنائے چکن پلاؤ کی۔ تب سے یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ بھابھی سے کہو چکن' پلاؤ کھلائیں۔" انداز ایسا تھا جیسے خود بڑا بیزار ہوا ہو اس کی باتیں سن کر۔
سمیر کا منہ کھل گیا' یہ کب کی بات ہے جب اس نے یہ سب کہا' لیکن تقی اسے بولنے کا موقع دیے بغیر بولتا جا رہا تھا۔
"اچھا۔ میں چکن پلاؤ بنا لیتی ہوں۔" شفا نے کہا۔
"اور ہاں سنو' ساتھ میں آلو کا رائتہ اور کچومر سلاد بھی بنا لینا' سمیر کو کھانے کا بہت شوق ہے۔" پیچھے سے آواز لگائی۔
شفا کے جاتے ہی سمیر نے اس کی گردن دبوچ لی۔
"خبیث آدمی! میرا نام لے کر اپنے لیے کھانا بنواتے تجھے شرم نہیں آئی۔"
"اس میں شرم کی تو کوئی بات نہیں۔" تقی نے خود کو اس سے آزاد کروا کر کھلکھلاتے لہجے میں کہا تھا۔
"جب میں کھانے بیٹھوں گا تو کیا تم میرے ساتھ

نہیں بیٹھو گے؟ بیٹھو گے نا؟ تو پھر تمہارا نام لیا جائے یا میرا کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق تو واقعی کوئی نہیں پڑتا، لیکن سمجھ میں میری یہ نہیں آرہا' آخر میرا نام لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا بھابھی تمہارے لیے کھانا نہیں بناتیں؟"

"یار! داستان لمبی ہے' ابھی ذرا فریش ہو کر سناتا ہوں' بس اتنا سن لو کہ ہم دونوں باری کے حساب سے کام کرتے ہیں اور آج کھانا بنانے کی باری میری تھی' جبکہ میرا کھانا بنانے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ اب تمہارا نام لیا ہے تو شفا بے مروتی سے انکار بھی نہیں کر سکتی۔ میں کہتا تو اس نے جواب سیدھا میرے منہ پر مار دینا تھا۔۔۔ اور سچ کہوں تو اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے۔ اب جب وہ اتنا اچھا کھانا بنا سکتی ہے تو کون خود اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر اپنے منہ کا ذائقہ برباد کرے۔"

اس نے مزے سے کہا تھا' اپنی کامیابی پر خوش بھی بہت تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" شیو بناتے ہوئے تقی کو اچانک خیال آیا تو اسی طرح جھاگ لگے منہ کے ساتھ کچن میں آگیا۔

ان دونوں کے پاس اسباب زندگی کی کمی تھی' سو بہت سی چیزیں ان دونوں نے باہمی رضا سے ایسے سیٹ کرلی تھیں کہ دونوں کو استعمال میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً" وال کلاک ایک تھا' تو اسے کسی کے کمرے میں لگانے کے بجائے لاؤنج کی دیوار پر لگا دیا تھا۔ شیشہ بھی ایک ہی تھا تو اسے صحن کے ایک طرف جو واش بیسن نصب تھا' اسی کے اوپر لگا دیا کہ دونوں کو مشکل نہ ہو' اب تقی وہیں تولیہ کندھوں پر پھیلائے شیو بنا رہا تھا۔ جب کچن میں آیا تو آدھے چہرے پر جھاگ تھا' آدھے سے غائب۔

شفا اپنا ناشتا بنا رہی تھی' اس نے مڑ کر تقی کو دیکھا اور ہنسنے لگی۔

"منہ تو صاف کر کے آؤ' کتنے مضحکہ خیز لگ رہے ہو اس طرح۔"

"تم مجھ پر بعد میں ہنس لینا' پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"اچھا بتاؤ' کس بات کا جواب چاہیے؟" وہ آملیٹ دم پر رکھ کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وہاں مری میں جب میں نے تم سے سمیر کا ذکر کیا تو تم نے کہا تھا' تمہاری سہیلی شادی شدہ ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ تمہیں پتا ہے' تمہاری سہیلی اور سمیر کی منگنی اسی بات پر نہیں ہو سکی۔ بلکہ یہ بھی سننے میں آیا۔ وہ طلاق یافتہ ہے۔"

"ہاں تو یہ تو تمہاری غلطی ہوئی نا۔ میں نے تو صرف شادی شدہ کہا تھا' تم نے طلاق یافتہ ہی بنا دیا۔"

"میں نے بھی ایسا کچھ نہیں کہا۔ میرا خیال ہے' ایک سے دوسرے تک پہنچتے بات گڑبڑ ہو گئی۔" تقی کو افسوس ہو رہا تھا۔

"میں ایک بات بتاؤں' میں بھی اس بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی' لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ' یہ تمہارا دوست ہے کیسا؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ تم نے اس کا رشتہ کروانا ہے؟" تقی نے تو از راہ تفنن کہا تھا' لیکن شفا سنجیدہ ہی تھی۔

"یہی سمجھ لو۔" اس نے پر سوچ انداز میں کہا تھا۔

"میں جو دو' تین بار سمیر بھائی سے ملی ہوں تو مجھے لگا کہ ان کے بارے میں میرے اور ثمر کے اندازے غلط تھے۔ وہ اتنے برے نہیں ہیں جتنا ہم نے سمجھ لیا تھا۔"

"اتنے فتنے کیا۔۔۔ وہ بالکل بھی برا نہیں ہے' اسے چڑانے کے لیے جو مرضی بولتا رہوں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ بہت خوش رہ سکتی ہے۔" سمیر وہاں تھا نہیں' اس لیے۔ تقی پر اس کی محبت پوری طرح اتری ہوئی تھی۔ سمیر اس کے منہ سے اپنی اتنی تعریف سنتا تو ایک منٹ کو تو غش ضرور ہی کھا جاتا۔

"تم جو بھی کہو' لیکن وہاں مری میں اس کے انداز ہمیں بالکل بھی پسند نہیں آئے تھے۔"

تقی ہنس دیا۔

"یار! وہ تو محض ایک شرارت تھی جو ہم دوستوں نے سمیر کے ساتھ کی تھی اور سچ بات تو یہ ہے کہ سمیر کے گلے بھی پڑ گئی وہ شرارت۔" وہ اسے سب کچھ تفصیل سے بتانے لگا کہ کس طرح ان سب نے مل کر سمیر کو ثمر سے بات کرنے کے لیے اکسایا تھا اور بعد میں مار کھاتا دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔

"مجھے ثمر کے خیالات تو پتا ہی تھے۔ اس لیے میں نے غصے میں جھوٹ بول دیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ سمیر یہ سن کر مایوس ہو اور اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ لیکن کیا پتا تھا کہ قسمت اس طرح ملوا دے گی۔"

"اچھا ایک اور بات بتاؤ۔ اب ثمر کو سمیر کے لیے راضی کر سکتی ہو؟"

"اگر تم گارنٹی دو سمیر کی تو کیوں نہیں۔"

"گارنٹی ہی گارنٹی۔" تقی نے پرجوش ہو کر ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "میں بتا رہا ہوں' وہ بہت اچھا شوہر ثابت ہو گا۔ پھر ثمر کو پسند بھی بہت کرتا ہے۔ تم دیکھنا اس کے آگے پیچھے پھرا کرے گا۔ کیونکہ سمیر میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جنہیں ہم مردوں کی زبان میں جورو کی غلامی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اوپر سے محبت بھی کرتا ہے۔ یعنی سونے پہ سہاگہ۔ تم دیکھنا' تمہاری سہیلی بہت خوش رہے گی۔ اور تم انتہائی نالائق بیوی بنو گی۔ شوہر کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ پتا بھی ہے کہ نہیں' کبھی تو انسان اپنے ساتھ شوہر کا کھانا ناشتا بنانے کا بھی سوچے' لیکن نہ جی۔"

وہ ذہین آدمی تھا۔ اکثر و بیشتر ایک تیر سے دو شکار کر لیا کرتا تھا۔ اب بھی یہی کیا۔ اسے چڑا بھی لیا اور اپنا مقصد بھی اسے بتا دیا۔ گو کہ یہ اس کی شان کے خلاف تھا کہ شفا سے اپنے لیے کچھ بنانے کا کہتا۔ (ڈائریکٹ۔۔۔ ان ڈائریکٹ تو اکثر اپنے کام کروا ہی لیتا تھا۔ بتایا نا ذہین آدمی تھا۔) لیکن وہ اتنا خوش رنگ آملیٹ بنا رہی تھی اور اس قدر دل فریب خوشبو تھی کہ وہ کہنے سے خود کو روک ہی نہیں سکا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے خود کو تمہاری "لائق" بیوی ثابت کرنے کا۔ جس کا یہ کام ہے' وہ کرلے گی۔ تم اتنا کرو کہ مہک سے میری بات کروا دو۔ تمہارے احسان کا بدلہ تو اتاروں۔"

وہ بھی بے مروتی میں کوئی اعلا پائے کی ڈگری ہی رکھتی تھی۔

تقی نے برا سا منہ بنایا۔

"فون کیا ہے اسے۔۔۔ لیکن وہ بات کرنے پر راضی نہیں ہے۔ میں اب دوبارہ فون نہیں کروں گا۔"

"ابھی نہیں کرو گے تو بعد میں پچھتاؤ گے۔" شفا نے تحمل سے کہا تھا۔ "بہت زیادہ محبت کرتی ہے نا وہ تم سے تو اسی لیے اس کا ری ایکشن بھی شدید ہے۔ ناراضی ختم ہو گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جتنی جلدی ہو سکے اسے منا لینا چاہیے' ایسا نہ ہو' وقت ہاتھ سے نکل جائے۔"

وہ سر جھکائے اب آملیٹ کو پراٹھے میں رول کر رہی تھی اور اس طرح بول رہی تھی جیسے ان دونوں کے درمیان وہ خود کہیں ہو ہی نہیں۔

تقی نے بے ساختہ سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پتا نہیں کیوں دیکھا تھا۔ لیکن دیکھا تھا اور بہت غور سے دیکھا تھا' پھر اس نے تیزی سے سر جھٹکا اور باہر نکل گیا۔

شفا حیران ہوئی' وہ اس طرح بات ادھوری چھوڑ کر کس طرح جا سکتا تھا۔ خیر اس نے بھی کندھے اچکائے اور اپنا کام سمیٹنے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صباحت یاسمین



"سوں سوں۔"

میں ہچکیوں کی سی آواز سن کر ٹھٹکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا' اس لیے مجھے یہی لگا کہ کوئی نہیں ہے مگر آواز آنے پہ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو اندھیرے کے باوجود مجھے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ وجود دکھائی دیا' جو جھٹکے کھا رہا تھا اور سسکیوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش میں بے حال تھا۔

"نزہت!" میں تڑپ کر اس کے پاس گیا۔ "واٹس رونگ یار؟" میں نے اس کا گھٹنوں میں دیا سر نرمی سے اوپر اٹھانا چاہا۔ اس نے غمگسار کندھا قریب پا کر خود پہ ضبط کی کوشش ترک کردی۔ میں دوڑ کر اٹھا اور بنا آواز پیدا کیے دروازہ بند کرکے چٹخنی چڑھائی۔ کچھ دیر وہ میرے کندھے سے لگی روتی رہی۔ جب اس کا غبار ذرا کم ہوا تو میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے گال خشک کرکے بکھرے بالوں کی لٹیں سمیٹیں۔

"زین! میں کیوں اتنی غلط ہوں۔ ہر کام میں' ہر بات میں......"

"کس نے کچھ کہا ہے؟"

"کسی نے کیا نہیں کہا' میرے ہر کام میں کیڑے نکالے جاتے ہیں اور ہر لمحہ تنقید کی جاتی ہے۔ میں کیا کروں۔" وہ پھر رونے لگی۔

"میں سب کی طرف سے سوری کرتا ہوں۔ تم ریلیکس ہو جاؤ پلیز۔"

"تم کیوں سوری کرتے ہو۔ باقی کسی کو احساس کیوں نہیں ہوتا۔"

"بس کرو نزہت! چپ ہو جاؤ اب۔" میں نے اسے ننھے بچوں کی طرح پچکارا۔

"لاسٹ سنڈے میں نے تو آلو چھولے نہیں بنائے تھے' پھر بھی چھولے اتنے سخت تھے کہ سب کا پیٹ خراب ہوا' تب تو کوئی ایشو نہیں بنا اور میری دفعہ......" میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی اس بات کے جواب میں کیا کہوں جب ہی میں خاموش رہا۔

وہ بہت خوش مزاج تھی اور صابر شاکر بھی۔ جب ہی میری امی' ان کی بجھلی بہو اور سب سے چھوٹے بیٹے کی طرف سے ہونے والی ہر بات وہ سہہ جاتی۔

"میں نے سالن بنایا تو کہا مرچیں تیز ہیں۔ اگلی دفعہ کم رکھیں تو سب کو سالن پھیکا لگا۔ سب لوگ آرام سے کھا پی رہے ہوتے ہیں' اچانک سعدیہ آکر کہتی ہے کہ شوربا پتلا ہے' شلجم ٹھیک سے نہیں گلے تو سب متفق ہو جاتے ہیں۔"

سعدیہ میرے چھوٹے بھائی کی بیوی تھی۔ میرے پاس ان باتوں کی کوئی جواب نہ تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا کہ وہ جو بھی بناتی' سب کو اس میں خامیاں ہی نظر آتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے پکانے کا کام لے لیا گیا اور اوپر کے کام اس کے ذمہ کردیے گئے۔ آٹا وہ گوندھتی۔ روٹیاں سعدیہ یا کوئی اور بناتا۔ سالن بنانا ہوتا تو سبزی بنانے کا کام اسے ملتا۔ برتن وہ دھوتی۔ وہ بہت ہوشیار نہ تھی مگر جب بار بار ایسا ہوتا رہا تو وہ سمجھ گئی کہ اسے ہمیشہ کم اہم کام دیا جاتا ہے اور دیے گئے کام کو وہ جتنے بھی اچھے طریقے سے کرتی' اتنی تنقید کی جاتی کہ نزہت کا ضبط جواب دے جاتا۔ مجھ سے ایک سال چھوٹے بھائی کی شادی پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔

میری بھابھی اور وہ ہم عمر ہی تھیں۔ ہماری شادی کے بعد جلدی ان دونوں کی اچھی دوستی ہو گئی مگر جانے کیا خار چڑھی سعدیہ کو اس سے۔ وہ اکثر نزہت پہ چوٹ کر جاتی۔ دل دکھانے والے تبصرے کرتی۔ بیرون ملک مقیم اپنے شوہر سے جب بھی وہ اسکائپ پہ باتیں کرتی۔ بظاہر نزہت کی تعریف کر رہی ہوتی مگر در حقیقت طنز ہوتا۔ سب سے چھوٹا بھائی اور امی اس کو ہمیشہ برحق سمجھتے تھے اور اس کے ہمنوا بن جاتے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سعدیہ اس گھر میں پہلے آئی تھی اور گھر پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ سب ہی اس کے گن گاتے تھے وہ نہیں چاہتی تھی کہ نزہت کو اس گھر میں اہمیت حاصل ہو۔

"زین! وہ میرا مت سوچیں' اپنا ہی سوچ لیں' آٹا نرم یا سخت ہونا اتنا بڑا ایشو تو نہیں کہ وہ غیبت پہ اتر آئیں۔ آج میں کچن میں گئی تو سعدیہ اور امی کہہ رہی تھیں' میری ماں نے مجھے کچھ سکھایا ہی نہیں۔ پھوہڑ ہوں۔"

سامنے کی گئی باتوں سے یقیناً اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی ہوگی' جتنی اس بات سے ہوئی تھی کہ سب اس کی غیر موجودگی میں بھی ویسی ہی باتیں کرتے ہیں۔

"زین! یہ تو گناہ ہے نا؟" اس نے میرا گھٹنا ہلا کر مجھے جھنجھوڑا اور تائید چاہی۔

"ہاں!" مجھے اس ایک لفظی جواب کے سوا کچھ نہ سوجھا۔

"زین! تم انہیں سمجھاؤ نا' یوں مت کیا کریں' یہ غلط بات ہے۔"

"نزہت! یار میں انہیں نہیں سمجھا سکتا۔"

"کیوں نہیں سمجھا سکتے انہیں۔ ہماری علیشہ چھوٹی سی ہے پھر بھی جب اس نے کھانے پہ منہ بسورا تو بابا نے اسے سمجھایا کھانے میں عیب نہیں نکالتے۔ اسے برا نہیں کہتے۔ وہ سمجھ گئی۔ چھوٹی بچی سمجھ سکتی ہے تو اتنے بڑے بڑے بندے کیوں نہیں؟"



ایک بار پھر میرے پاس جواباً" صرف چپ سی۔

"زین! زین! سن رہے ہو نا؟ علیشہ نے کہا تھا سالن گندا ہے تو بابا نے کہا کہ آپ کی ماما بسم اللہ پڑھ کر کھانا بنانا شروع کرتی ہیں تو ایسا کھانا گندا کیسے ہو سکتا ہے۔ پتا ہے زین! علیشہ فوراً" سمجھ گئی پھر اس نے مزے سے کریلے کھا لیے تھے۔" اپنی مخصوص معصومیت سے اس نے کہا۔

وہ اپنی برائی سے بہت زیادہ ڈسٹرب ہوئی تھی۔ وہ جواباً" چپ رہتی یا "جی اچھا آئندہ ایسا نہ ہو گا" کہہ کر مسکرا دیتی۔

"نزہت!" میں نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا۔ "یار! اگر میں نے انہیں اچھی نیت سے بھی اس ضمن میں کچھ سمجھانا چاہا تو بات تم ہی پہ آئے گی کہ بیوی نے کان بھرے ہیں۔ اس لیے میں انہیں کچھ نہیں کہوں گا لیکن تم جو بناتی ہو جیسا بناتی ہو مجھے ہمیشہ لذیذ لگتا ہے اور تم جو خرید کر لاتی ہو وہ بہت عمدہ ہوتا ہے۔ تمہاری اولین ذمہ داری میں ہوں۔ کپڑے استری کرنا، جوتے پالش کرنا میرے کھانے پینے کی فکر کرنا۔ تم کسی ایک بھی معاملے میں غیر ذمہ دار نہیں ہو۔ تم بہت سمجھ دار ہو۔ اگر کسی کو تمہارے کام پسند نہیں آتے تو وہ ان کی اپنی پسند ہے۔ تم آئندہ کسی غیر اہم بات پہ نہیں روؤ گی۔ کیونکہ میرے لیے اپنا خیال رکھنا تمہاری دوسری اہم ذمہ داری ہے۔"

"زین!" اندھیرے میں بھی میں جان گیا کہ اس کے لب مسکرائے ہیں، آنکھیں جگمگائی ہیں اور اس نے مسکراتے ہوئے میرا نام لیا ہے۔ مجھے اس کے لبوں کی مسکان بے حد عزیز تھی۔ جب ہی تو چھٹی ختم ہوتے ہی جونہی میں اٹلی واپس گیا۔ میں نے گھر لینے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ وہ بارہ افراد کی بڑی فیملی سے چار لوگوں والے گھر میں آئی تھی۔ لہٰذا اگر کبھی اسے کوکنگ آئل کے اندازے میں غلطی ہوئی نمک مرچ مناسب نہ رکھ سکی تو یہ ایسی غلطیاں نہ تھیں کہ پکانے کا کام ہی اس کے لیے شجر ممنوعہ قرار دے دیا جاتا۔

میٹھی لیٹھی باتیں کرنے والی یہ میٹھی سی لڑکی مجھے اتنی عزیز تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی یہ خواہش حسرت بن جائے کہ گھر میں کبھی اس کے کسی کام کی تعریف کی جائے۔ اس لیے شادی کی تیسری سالگرہ پہ وہ سوا دو سال کے نوفل کے ہمراہ میرے ساتھ اٹلی میں تھی۔



ہم نے کئی بار پاکستان کے چکر لگائے۔ وہاں پہ اب بھی اسے پہلے جتنا نا سمجھ، چھوٹا، کم تجربہ کار سمجھ کر ٹریٹ کیا جاتا تھا۔ جبکہ اب وہ اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ ساس کے عہدے پر فائز ہونے والی تھی۔ نوفل نے اپنے لیے اپنی چچا زاد کو پسند کیا جو کہ اس سے محض ڈیڑھ سال چھوٹی تھی۔ جب وہ پہلی بار اٹلی کے ایئرپورٹ پر اتری تو سردی سے سی سی کر رہی تھی اور دوسرے دن جب اس نے بصد شوق بریانی بنائی تو ہم دونوں میاں بیوی سی سی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد نوفل کھانے کی میز پہ آیا اور پہلا چمچ لیتے ہی دھاڑا۔

"یہ چکن بریانی ہے یا مرچ بریانی۔ تمہیں کھانا بنانا نہیں آتا کیا؟"

"نوفل!" نزہت نے اسے ڈپٹا۔ وہ جو روٹھی ہو گئی تھی۔ ایک دم حیران سی ہو کر دیکھنے لگی۔ "پہلے لقمہ نے ہی آگ لگا دی ہے بھلا اتنی مرچیں کوئی ڈالتا ہے بریانی میں۔"

"دہی کے ساتھ کھا لو، مرچیں نہیں لگیں گی۔"

نوفل خاموش ہو گیا مگر جب جب وہ لقمہ لیتا، ایک نگاہ غلط اپنی بیوی پہ ضرور ڈالتا جو انجان بنی بیٹھی تھی مگر اس کی مرچوں کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے بھی پانی بہہ رہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گئی تو نزہت نرمی سے بولی۔

"دیکھو بیٹا! ان کے گھر میں بہت لوگ ہیں۔ جبکہ ہم صرف چار ہیں۔ اس لیے اگر بریانی تیکھی بنی ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ کھانا پکانا نہیں جانتی۔ آئندہ اس سے اتنی تلخی سے بات نہ کرنا۔"

"اچھا۔" نوفل بددلی سے بولا۔

"میں کافی کے ساتھ تمہیں سینڈوچ دے دیتی ہوں ابھی، ٹھیک ہے؟" بیٹے کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر وہ اسے لالچ دینے لگی۔

"جی دے دیں کیونکہ میں دن بھر کا بھوکا ہوں۔ بالکل پیٹ نہیں بھرا میرا اور کل سے کھانا آپ ہی بنائیں گی۔ میں اس طرح کا کھانا نہیں کھا سکتا۔"

"کھانا تو اب تمہاری دلہن ہی بنائے گی بیٹا! کیونکہ یہ اس کا گھر ہے۔"

"لیکن ماما! اسے کھانا بنانا نہیں آتا۔"

"میں اسے سمجھا دوں گی۔ سیکھ جائے گی۔ لیکن آج اگر اسے کوکنگ سے ہٹا دیا تو وہ کبھی نہ سیکھ پائے گی۔ نہ ہی اس میں کانفیڈنس آئے گا۔ جاؤ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ، میں تم دونوں کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔"

نوفل کے کوئی بھی مزید نکتہ اٹھانے سے پہلے اس نے حکم صادر کیا، پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور نزہت کچن میں۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا جب میرے گھر والے جلے کٹے تبصرے کرتے تو نزہت کبھی پلٹ کر جواب نہ دیتی نہ ان کی باتوں پر ناک بھوں چڑھاتی تو اس کی کیا وجہ تھی؟

آج مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اس کی اعلا ظرفی اور کشادہ دلی تھی لیکن اس سب کا اسے کوئی فائدہ تو نہ ہوا۔ گھر والوں نے اسے اب تک تسلیم نہ کیا تھا مگر اس کا جواب بھی مجھے جلد ہی مل گیا تھا۔

میری بہو اسکائپ پہ پاکستان میں اپنی ماں سے بات کر رہی تھی۔ میں نے اس کے کمرے سے گزرتے ہوئے سنا۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

"رات کو بریانی اور دوپہر میں پھر مٹر پلاؤ۔ تمہیں پتا ہے نزہت اور زین ہی نہیں نوفل بھی چاول زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

"ماما! تائی امی نے کہا ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہاں مجھے ہر طرح کی آزادی ہے۔ میں جو چاہوں کروں۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔"

اور پھر وہ مزے لے لے کر بتانے لگی کہ رات کو بھی بریانی میں مرچیں زیادہ تھیں۔ ابھی نمک تیز رہ گیا مگر تائی امی نے کچھ بھی نہیں کہا۔"

اس کی ماں جواباً" جھٹ سے بولی۔

"نزہت کو خود بھی تو کچھ ڈھنگ سے بنانا نہیں آتا، ورنہ اچھا پکانے والوں کو کہاں برداشت ہوتی ہیں ایسی کمیاں بیشیاں!"

"ماما! تائی امی بہترین کھانے بناتی ہیں۔ بس انہیں یہ عادت نہیں کہ کوئی انہیں کسی کمی بیشی کا بتائے تو وہ ہزار عذر گنوا کر اپنے پکائے کھانے کو بہترین کا ووٹ دلوا کر ہی دم لیں۔ یا کسی کے پکائے ہوئے کھانے میں عیب ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔

نزہت کی اعلا ظرفی کا اسے قدرت کی طرف سے انعام ملا تھا۔ اسے بہو بھی اعلا ظرف ملی تھی۔

کچھ دیر بعد میں چائے بنانے کچن میں آیا تو میری بہو آٹے میں لتھڑے ہاتھ لیے سلیب کے سامنے پریشان کھڑی تھی اور نزہت آٹے کو سنبھالتے ہوئے اسے بتا رہی تھی کہ اس نے بھی سسرال میں پہلی بار آٹا نرم کر دیا تھا تب اس کی ماما اور دادی نے "سمجھایا" کہ یہ ٹھیک نہیں گندھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بہو کو تسلی بھی دے رہی تھی کہ وہ جلد ہی یہاں کا آٹا گوندھنا سیکھ جائے گی اور یہ کہ خراب ہو گیا تو اس کی کیا غلطی۔ اسے تو صرف گندم کا گھر میں پسا ہوا موٹا آٹا گوندھنے کا تجربہ ہے۔ یہ تو اس کے لیے بالکل نئی چیز ہے۔

میں مسکرا دیا۔

زندگی کتنی آسان اور خوبصورت ہو جاتی ہے اگر ہمیں اعلا ظرف اور کشادہ دل لوگ ملیں۔ جیسے کہ میری زندگی خوبصورت اور آسان تھی اور یقیناً" نوفل کی زندگی بھی ایسی ہی سہل و خوب صورت ہو گی کیونکہ میری بہو بھی تنگ دل اور کم ظرف نہیں ہے۔



تاباں کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے ہے جہاں تین بھائی شاہد تاج' مجاہد تاج' اور ساجد تاج مشترکہ خاندانی نظام کے تحت مل کر رہتے ہیں۔

مشاہد تاج کی دو بیٹیاں ماجدہ اور مادہ ہیں اور دو بیٹے ہیں راشد اور ارشد جو مدرسے میں پڑھتے ہیں۔

مجاہد تاج کی چار بیٹیاں نازاں' افشاں' تاباں اور ضوفشاں ہیں اور ایک بیٹا کاشان ہے۔ جس سے سب بہنیں خصوصاً تاباں بہت محبت کرتی ہے۔

ساجد تاج کی بیوی کا تعلق ایک دیہاتی ان پڑھ گھرانے سے ہے۔ ان کے تین بیٹے جمیل' شکیل اور عقیل ہیں اور دو بیٹیاں رانیہ اور سونیا ہیں۔

جمیل پڑھے لکھے ہیں' اچھی ملازمت ہے جبکہ عقیل اور شکیل اجڈ' گنوار اور وحشی ہیں اور تاباں ان سے بہت نفرت کرتی ہے۔

جمیل کی منگنی ماجدہ سے ہو چکی ہے' خاندانی روایتوں کی بنا پر برادری سے باہر لڑکی نہیں دی جا سکتی' اس لیے مائدہ کا رشتہ کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔

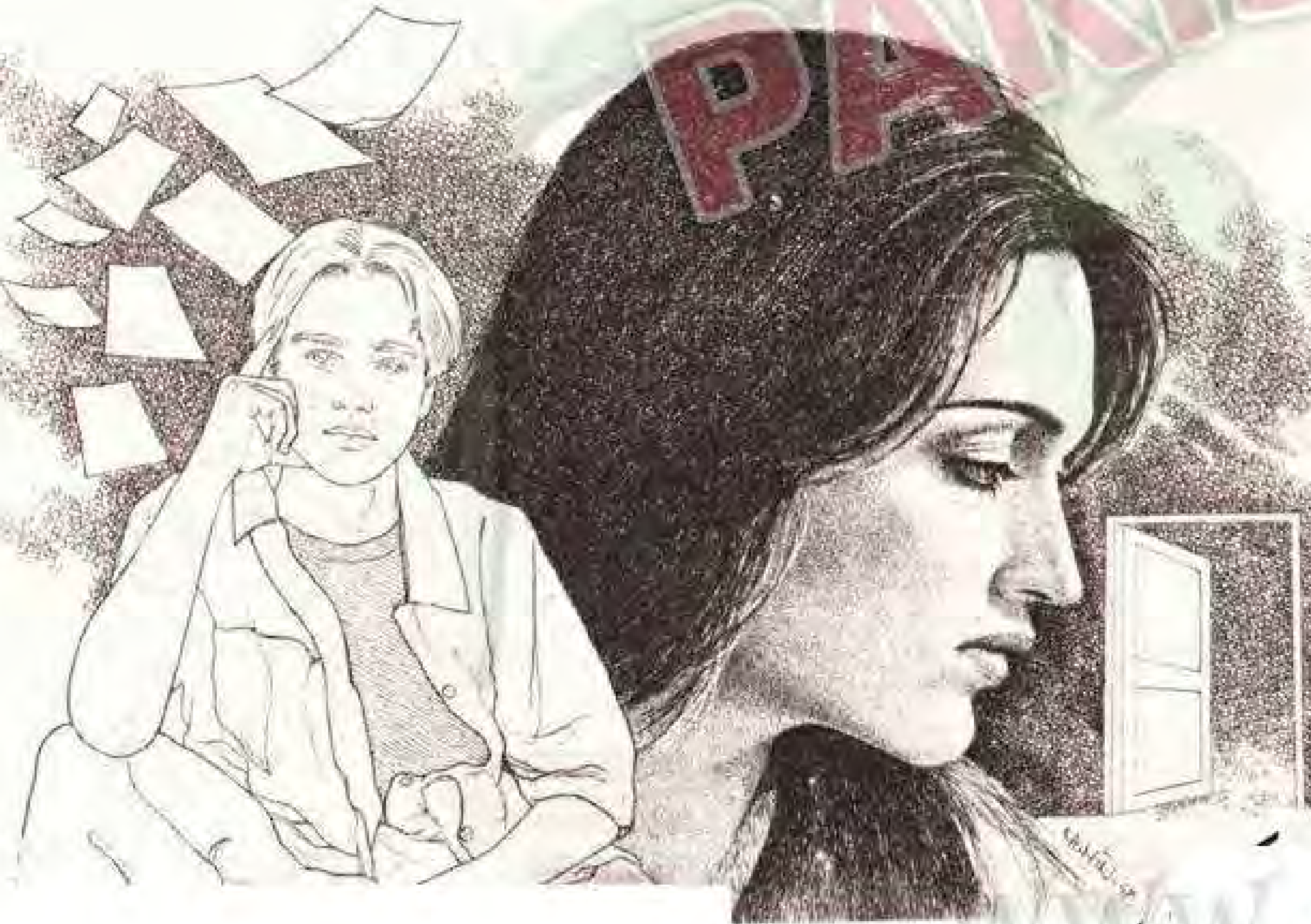
نازاں اور افشاں خوب صورت' پڑھی لکھی سلیقہ شعار لڑکیاں ہیں لیکن اسی بے ہودہ روایت کی بھینٹ چڑھی ہیں۔ ان کی شادی خالہ کے بیٹوں رضوان اور عمران سے ہوئی ہے۔ رضوان عمران نہ صرف کم صورت اور جاہل ہیں بلکہ کماتے بھی نہیں۔ جس کا تاباں کو بہت دکھ بھی ہے۔

ضوفشاں ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔ وہ بے حد ذہین ہے۔ ہر کلاس میں ٹاپ کرتی ہے۔ لیکن اسے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک موقع پر وہ اپنی ذہانت سے باپ سے منوا لیتی ہے اور وہ اسے ڈاکٹر بننے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

مائدہ کے رشتے کے لیے برادری کی ایک رشتہ کرانے والی خاتون کی خدمات لی جاتی ہیں۔ وہ مائدہ کی تصویریں لے جاتی ہیں' ان تصویروں میں غلطی سے تاباں کی تصویر بھی چلی جاتی ہے۔

سلطان حیدر اور جاذبہ کے ہاں شادی کے کافی عرصہ بعد ایک بیٹا پیدا ہوا ہے۔ دونوں اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ جاذب سلطان بے حد خوب صورت ہے۔ پڑھا لکھا ہے' جائیداد کا اکلوتا وارث ہے۔ جاذبہ چاہتی ہیں کہ وہ جاذب کی شادی کر دیں۔ اس سلسلے میں وہ رشتہ کرانے والی خاتون سے مدد لیتی ہیں۔ خاتون ان کے پاس تصویریں لے کر آتی ہیں۔ ان

مکمل ناول



سائرہ رضا

اک جبر مری نوکری



تصویروں کو دکھاتے وقت تاباں کی تصویر بھی نکل کر گر جاتی ہے جاذب سلطان کی نظر اس پر پڑ جاتی ہے۔
تاباں غیر معمولی خوب صورت ہے۔ اس کی پسند بہت اعلا ہے۔ وہ بہت نازک مزاج ہے' چھوٹی چاچی جی اس سے حسد کرتی ہیں۔ جاذب سلطان اس تصویر کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور ضد پکڑ لیتا ہے کہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا ۔سلطان حیدر اور جاذبہ رشتہ لے کر جاتے ہیں۔
تاباں کے گھر والے صاف انکار کر دیتے ہیں۔
تاباں کی بہن ضوفشاں اور ماں زاہدہ جاذب سلطان اور اس کے گھر والوں سے بے حد متاثر ہوتی ہیں لیکن خاندانی روایت کے سامنے منہ کھولنا ممکن نہیں۔ سلطان حیدر کے بار بار اصرار پر گھر کے مرد انہیں ذلیل کر کے آفس سے نکال دیتے ہیں۔
سب طرف سے مایوس ہو کر جاذب تاباں کو خط لکھتا ہے۔ وہ اپنا نام نہیں لکھتا لیکن تاباں جان جاتی ہے کہ یہ جاذب ہے۔ خطوط کی زبان اتنی خوب صورت ہے اور ان میں اتنی سچائی ہے کہ تاباں جاذب کے بارے میں سوچنے لگتی ہے' وہ ضوفشاں کو یہ خط دکھاتی ہے تو وہ خوف زدہ ہو کر انہیں پھاڑ دیتی ہے۔ جاذب سلطان تاباں کے کالج کے باہر کھڑا ہوتا ہے تاباں اس سے ناواقف ہے' اس نے جاذب سلطان کی شکل کبھی نہیں دیکھی' اس لیے وہ اسے پہچانتی بھی نہیں۔ مجاہد تاج ایک دن اسے کالج سے لینے جاتے ہیں تو جاذب کو کھڑا دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔
وہ گھر آ کر بتاتے ہیں تو شکیل عقیل جو لڑائی بھڑائی کے شوقین تھے فوراً" جاذب سلطان کو مارنے کے لیے مستعد ہو گئے۔ جمیل بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے جا کر جاذب سلطان کو اتنا مارا کہ صرف جان لینے کی کسر رہ گئی تھی۔ اس کی ہڈیاں توڑ ڈالیں۔
سلطان حیدر نے ان کی رپٹ درج نہیں کرائی اور اسے بائیک چھیننے کا واقعہ قرار دے کر بات دبا دی۔ مجاہد تاج نے فیصلہ سنا دیا کہ تاباں کے لیے جو بھی رشتہ ملے فوراً" شادی کر دی جائے۔ زاہدہ پریشان ہو گئیں پہلی بار تاباں کی اچھی صورت زہر لگی۔
ضوفی نے تاباں کو بتایا' جاذب سلطان ان کے گھر کے سامنے آ کر کھڑا ہوتا ہے۔ تاباں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
"میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا ضوفی!"
"کیا؟" ضوفی کا رنگ فق ہو گیا۔ سادہ جملے کے اندر چھپا تجسس' قلق' بے چینی آمیز اشتیاق۔
ضوفی کو اپنے قدموں کے نیچے سے سرکنے کا احساس ہوا تھا۔

-2-
دوسری اور آخری قسط

"تت..... تت تم نے ایسی بات کہی کیسے تاباں"۔ ضوفی بہ دقت بول سکی۔ "تمہیں حسرت ہے اسے دیکھنے کی؟"
"تو کیا نہیں ہونی چاہیے؟"
تاباں نے ضوفی کے نکھرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر دور کھڑکی پر نظریں جما دیں جہاں پردہ بہت ہلکے ہلکے ہل رہا تھا۔
"میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کیا چیز ہے..... جس نے اتنا غدر مچا رکھا ہے۔"
"تمہیں غدر کے بعد کا انجام معلوم ہے۔" ضوفی نے بمشکل آواز کو بلند ہونے سے روکا۔ "فقط تباہی' بربادی' اختتام....."
"تم اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کر رہی ہو ضوفی..... خواہش ہی تو کی ہے کچھ کیا تو نہیں ہے۔" تاباں کی فطری ہٹ دھرمی عود کر آئی۔ "تم جن باتوں کو سوچ کر ہول رہی ہو پتا ہے مجھے ان سب کا..... مگر بس یونہی زندگی کے کسی موڑ پر جب وقت ہر شے پر دھول ڈال دیتا ہے۔ اگر کوئی بھولی بھٹکی یاد دستک دے تو..... کوئی شکل تو یاد آئے ناں بس اتنی سی بات ہے اور تم آسمان سر پر اٹھانے پر تلی ہو۔"
ضوفی کے لب باہم پیوست ہو گئے تاباں اپنی کہہ کر جیسے بہت شانت ہو گئی تھی۔ وہ ہلکی پھلکی کمرے سے باہر جانے کو تیار تھی۔
"خواہشیں انسان پر غلبہ پالیں تو انسان سیدھے راستوں کی پہچان کھو دیتا ہے اور غلط راستوں پر چلنے والوں کو فقط رسوائی اور جگ ہنسائی ملتی ہے۔ دوبارہ ایسا خیال آئے ناں تو لاحول پڑھ لینا۔" ضوفی کا لہجہ خوف زدہ تھا تاباں سن کھڑی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

فزیو تھراپسٹ کے ہاتھ مشاقی سے چل رہے تھے۔ نپے تلے ہاتھ..... مہارت' یقین' طمانیت..... لیکن اس کے چہرے و انداز سے بڑھ کر طمانیت مریض کے چہرے پر تھی۔ وہ کانوں میں ہینڈ فری ٹھونس لیا کرتا تھا یا کبھی ریموٹ پکڑ کر چینل بدلتا بے فکر' پرسکون' بالکل فارغ.....
جبکہ دوسری جانب جاذبہ سلطان ٹکٹکی باندھ کر ڈاکٹر کے ہاتھوں کو دیکھا کرتیں۔ کہیں ٹانگ میں کوئی نقص رہ تو نہیں جائے گا.....؟ وہ پہلے ہی کی طرح صحیح سلامت چلا کرے گا۔ بھاگے دوڑے گا ناں.....؟ وہ بار بار سوال کرتیں' ظاہری گھاؤ جلد بھر گئے۔ پٹیاں بھی کھل گئیں۔ مگر شانے کے پاس گردن میں ناقابل برداشت درد تھا اور دوسرے پلاسٹر کھل جانے کے بعد شاید پنڈلی کی ہڈی میں کوئی کسر رہ گئی تھی۔ چلتا تو ہر قدم پر چہرہ تکلیف کے باعث چیختی دیوار بن جاتا۔ وہ اسٹک کے سہارے چلنے لگا تھا اور کبھی کبھار باہر بھی نکلنے لگا۔
"کہاں چلے جاتے ہو جاذب؟ آرام کیا کرو۔" جاذبہ کی نگاہیں اس کے قدموں سے بندھی رہتیں۔
"ڈاکٹر کہتے ہیں میرے لیے چلنا سب سے بہترین ایکسر سائز ہے۔"
"اگر جو ہڈی میں کوئی ٹیڑھ رہ گئی تو؟" وہ بمشکل خدشہ زبان پر لائی تھیں۔
"ماں! میری ماں....." وہ ایک ہاتھ کو اسٹک پر جما کر سارا وزن اس پر ڈالتا اور دوسرا ان کے شانے پر۔
"ہڈی کی ٹیڑھ ختم ہو گئی تو میرے پاس رہے گا ہی کیا..... آپ دعا کریں یہ ٹیڑھ سلامت رہے۔" وہ دل نوازی سے مسکراتا جیسے کہیں کھو جاتا۔
"تم جاتے کہاں ہو؟"
"بس وہیں تک..... جہاں تک کا راستہ یاد ہے۔"

☼ ☼ ☼

تاباں مجاہد کسی بھی شے کو سر پر سوار کرنے والی فطرت لے کر پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی سے بڑی بات کو چٹکیوں میں اڑا دینا۔ ٹھٹھک کر سننا' چندیل ٹھرنا اور پھر شانے اچکا کر لاپروائی سے گزر جانا بچپن کی عادت تھی جو اب فطرت بن کر لہو میں گردش کرتی تھی۔ لیکن اس بار کچھ الگ ہو گیا تھا۔ ذہن و دل منجمد ہو گئے تھے۔ روشنی چونکاتی تھی۔ تاریکی بجھا دیتی تھی

سانحہ ارتحال
کمپیوٹرڈ ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ زبیر احمد کے خسر سید محمد نذر صاحب طویل علالت کے بعد راہیٔ ملک عدم ہوئے۔
انا للہ وانا الیہ راجعون
ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

پردے کی ذرا سی جنبش جیسے گالوں کو تھپتھپا جاتی۔ ہوا پیغام محسوس ہوتی۔ ایک بے یقینی اور ہراس آنکھوں کا مستقل مہمان بن بیٹھا تھا۔

ہاں اب معلوم نہیں جانتے بوجھتے یا غیر ارادی طور ضوفشاں یونہی آتے جاتے۔ کھڑکی کے پاس ٹھہر جاتی۔ پٹ بند کرنے کے لیے یا پردہ برابر کرنے کے واسطے اور بظاہر لاتعلق بنی تاباں عجب سے امید و بیم کے عالم میں چور نظروں سے اسے دیکھ لیتی۔ ضوفی کے چہرے پر طمانیت پھیل جاتی تو سکھ کا ایک سانس اس کے ہونٹوں سے بھی خارج ہو جاتا۔ دونوں بہنوں کی نگاہیں اس پل اگر ایک دوسرے سے ٹکراتیں تو آسودگی کا ایک پیام نشر ہو جاتا۔ سب اچھا ہے کی رپورٹ...... (باہر کوئی نہیں ہے)۔

دونوں اپنے اپنے کاموں میں مگن ہو جاتیں۔ مگر پتا نہیں کیوں اس آسودہ پل کے گزر جانے کے کچھ دیر بعد تاباں مجاہد پر ایک جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی۔ ایک بے نام سی کیفیت جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ ناقابل فہم ناقابل بیاں......

اسے لگتا اس کا دل بجھ گیا ہے۔ یا پھر جل اٹھا ایک سلگتا احساس تن من پھونکنے لگتا۔ اپنے گردوپیش پر نگاہ دوڑاتی۔ تو سب مگن نظر آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں...... (اور اگر کچھ ہونے والا تھا تو اسے روک دیا گیا بزور شمشیر...... ہاہاہا......)

☼ ☼ ☼

بڑے دنوں بعد ایسے تازگی بھرے پل میسر آئے تھے۔ وہ نہائی دھوئی نکھری ستھری چھوٹے سے لان میں نکل آئی۔ گہرے نیلے چوڑی دار پاجامے اور دوپٹے کے درمیان گہرا جامنی کرتا تھا۔ بال ابھی نم تھے مگر سلجھا کر دائیں جانب ڈال رکھے تھے۔ پیروں میں جوتی اتفاق سے نیلے رنگ کی مل گئی تھی تو وہ بھی چڑھا لی (ماجدہ کی جوتی)

اپنی سائیکل کے ساتھ نبرد آزما...... کاشان نے اسے دیکھ کر پہلے تو خوشی سے چلانا چاہا مگر جب اسے خود میں اتنی بری طرح مگن دیکھا تو برا سا منہ بنا کر دوبارہ نٹ پانے کے ساتھ لگ گیا۔ سائیکل کی چین اتر گئی تھی۔ پایاں کو چین چڑھانا...... آتی تھی۔ مگر وہ اتنی زیادہ تیار تھی کہ بس...... کاشان نے جھنجلا کر پیچ کس پٹخا۔ تاباں بری طرح چونکی۔

"ہائے!" اس نے شکوہ کناں خفگی آمیز سوجے کپے منہ والے چہرے کے ساتھ بیٹھے کاشان کو دیکھا۔ "یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ پیروں کے بل بیٹھ گئی۔

"دوستوں کے ساتھ ریس لگانی تھی۔ اس روڈ سے گراؤنڈ گھوم کے آنا تھا...... مگر یہ...... یہ چین اتر گئی اور چڑھتی ہی نہیں۔"

"میں ہوں ناں...... میں چڑھا دیتی ہوں۔"

"اتنا تیار ہو کر آپ نے آج تک کسی کا کام کیا ہے جو میرا کریں گی۔"

"کسی میں...... اور تم میں کتنا فرق ہے" "تمہیں آج تک یہی پتا نہ لگا میرے شہزادے!" تاباں نے بسورے منہ کو چومنے سے بمشکل خود کو روکا۔ آستین کو موڑا، دوپٹا سرخ اینٹوں والے فرش پر ذرا دور اڑا دیا۔

"پہلے ایسے...... پھر ایسے...... اس کے بعد تین تک گنتی یعنی ایک دو تین اور چین اوپر...... یہ۔" اس نے پیڈل کو الٹا پھر سیدھا گھما کر دکھایا کاشان کا پورا چہرہ جگمگا اٹھا۔

"اب تم تیار ہو جاؤ ورنہ دیر ہو جائے گی۔" تاباں ہاتھ آگے کی جانب بڑھاتے ہوئے اٹھی۔ اس کے ہاتھوں پر گریس لگی ہوئی تھی۔

"میں تو تیار ہوں ہی......" کاشان نے کسی فوجی جوان کی طرح سلیوٹ کے سے انداز میں کھڑے ہو کر دکھایا۔ وہ برموڈا کے ساتھ پیلی شرٹ میں بے پناہ جچ رہا تھا۔ "بلکہ میں ہمیشہ تیار ہی رہتا ہوں، اچھا لگ رہا ہوں ناں؟"

"میرا گڈا برا لگ ہی نہیں سکتا۔" تاباں کا لہجہ محبت سے چور چور تھا۔ وہ لان کے سرے پر لگے نلکے کے پاس جا کر اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔

"دیکھو کاشان! دھیان سے چلانا کہیں چوٹ نہ......"

"مجھے ریس جیتنی ہے۔" وہ جاگرز کے لیس بند کر رہا تھا۔

تاباں دوپٹہ شانوں پر جما رہی تھی کرتے کی سلوٹیں ہاتھ سے درست کر رہی تھی۔

"بھلے ہار کے آجانا مگر ذرا سی خراش بھی نہ آئے بلکہ تمہیں پینٹ پہننا چاہیے تھی خدانخواستہ گر گئے تو گھٹنے چھل سکتے ہیں۔"

"آپ نے ہار کا نام ہی کیوں لیا؟" کاشان کرنٹ کھائے انداز میں مڑا تھا۔ "مجھے ہارنا کبھی پسند نہیں ہے آپا......!"

"اے کاشان سنو!" تاباں یکدم پیچھے لپکی۔ "یہ تمہاری آنکھ کے پاس کیا ہے؟ شاید گریس لگی ہے ادھر رکو ذرا۔"

کاشان آگے آیا تب تاباں نے ذرا جھک کر دیکھا دائیں آنکھ کے کونے پر لکیر کی صورت گریس کا دھبا تھا۔ اس نے بے حد فکرمندی سے اپنا نیا دوپٹا زبان کی نوک سے نم کیا اور پھر احتیاط دھبے کو مٹا دیا۔

"میری مانو اب ایک بار آنکھ دھو بھی لو۔"

"آپ نے صاف کر تو دیا ناں۔"

"نہیں کاشان! ایسے خطرناک ہوتا ہے بلکہ لاؤ میں خود دھلوا دیتی ہوں۔" وہ اسے لیے نلکے کے پاس بڑھی خوب تسلی کے بعد اسے جانے دیا۔

"میں اچھا لگ رہا ہوں ناں آپا! اور میں ہاتھ ہوا میں لہرا کر بھی سائیکل چلا سکتا ہوں۔" گھر سے نکلتے ہی وہ اپنے پرپرزے دکھانے لگا۔

"اللہ!" تاباں نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔ "خدا کی قسم کاشان تم...... تم یہ سب کرو گے......"

"یہ تو صرف آپ کو دکھا رہا ہوں۔ مجھے تو اور بھی بہت سے کرتب آتے ہیں۔" وہ پیڈلز پر کھڑا ہو کر سائیکل چلانے لگا۔

"میں امی کو بلانے لگی ہوں کاشان...... بند کرواتی ہوں یہ سائیکل کا ڈراما۔ آٹھ سال کا بچہ اور...... اور ہائے۔"

"میں نو کا ہونے والا ہوں۔" وہ اب رخصت کو تیار تھا۔

"نو کے بھی ہو گئے تو ایسی حرکتوں کی اجازت نہیں ملے گی۔" وہ چلائی اور باہر نکل آئی کہ وہ تو تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ کافی آگے جا کر گردن گھما کر اسے دیکھا۔ اب وہ ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلا رہا تھا۔

تاباں نے شدید خوف کے عالم میں آنکھیں موند لیں۔ کاشان نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔ گھنٹی بجا کر اسے متوجہ کیا اور یہ جا وہ جا۔

تاباں نے شانے والے دوپٹے کو سر پر ٹکایا اور چند قدم اور آگے سرک آئی۔ مگر اب فقط خاموشی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کاشان ہی کی عمر کے چند بچے خوب شور مچاتے سائیکلوں پر وہاں سے گزرے تاباں کی بے چینی حد سے سوا تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے اس نے وہیں کھڑے کھڑے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ گھر بھر کا چہیتا لاڈلا بچہ اور ان کا اکلوتا بھائی...... اسے ایک سے ایک برا خیال تواتر سے آ آ کر تنگ کر رہا تھا۔

اس کی متلاشی نگاہیں کبھی ادھر ہوتی تھیں اور کبھی ادھر...... کھوج اور بے چینی......

"تم......!" ایک بے یقین غصیلی...... شکوک سے پر آواز اس کے سر پر گونجی وہ بری طرح سٹپٹا کر پلٹی۔

"تم ادھر کھڑی کیا کر رہی ہو؟" دوسری آواز پہلی سے زیادہ مشکوک تھی۔

"وہ...... میں ادھر کاشان سائیکل پر۔"

"کدھر کاشان؟؟؟ وہ تو ادھر گراؤنڈ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہے ہم ابھی دیکھ کر آرہے ہیں۔ تم کس کے انتظار میں ادھر کھڑی تھیں؟"

"کسی کا انتظار بھی نہیں...... میں نے کہا ناں۔ وہ کاشان۔"

"ہمارے گھر کی لڑکیاں کب اس طرح دروازوں پر کھڑی ہوتی ہیں؟"

"اور اتنا سج بن کر......" عقیل نے اسے بغور سر تاپا دیکھا اور شکیل کو دکھایا۔

شکیل کے ہونٹ سکڑے پھر آنکھیں..... وہ اسے دیکھ رہا تھا۔
تاباں اتنی آسانی سے ہراساں ہونے والی نہیں تھی مگر تابڑتوڑ سوالات..... اور انداز۔
اور کوئی وقت ہوتا تو..... تو وہ بری طرح جھڑک کر انہیں سیدھا کر دیتی مگر اس وقت اس کے لب جنبش بھی نہ کر سکے۔
"اب یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو' چلو اندر....." عقیل دھاڑا تھا۔



تاباں نے سوچا: جملے زیادہ سنگین تھے یا چہرے کے تاثرات یا آنکھوں کی بے یقینی یا سب کچھ ہی بہت عجیب و غریب تھا۔ ناقابل یقین اور..... اور..... ناقابل برداشت۔
ہاں اس کے لیے اس صورت حال کا سب سے موزوں نام ناقابل برداشت تھا۔ وہ ڈائننگ چیئر کی پشت پر ہاتھ ٹکائے کھڑی تھی۔
"تم سب مجھے اس طرح کٹہرے میں کھڑا نہیں کر سکتے ابا!"
"تو پھر کیا خط لکھ کر بھیجیں کہ۔" عقیل نے بہت جارحانہ طنزیہ انداز میں کسی نامعقول جملے کا گلا خود ہی گھونٹا۔ دونوں بھائی اسے پلکیں جھپکائے بنا گھورے ہی جا رہے تھے۔
"میں صرف اپنے ابا ہی کو جواب دوں گی۔ سمجھے..... کیوں ابا؟" اس نے انہیں اوقات یاد دلانے کی کوشش کی۔
"لڑ بھڑ کے تو ہم آئے تھے۔ چوٹیں تو ہمیں لگی ہیں۔" شکیل نے اپنا ہاتھ ذرا سا بلند کیا۔
اس دن جاذب سلطان کی ٹھکائی کے وقت وہ ہر لحاظ سے حاوی تھے اور اسے نیم جان چھوڑ آئے تھے مگر نجانے کیسے شکیل کا پیر لڑکھڑایا تھا۔ بھاگتے ہوئے پوری طاقت سے اس کا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔ کسی ابھری ہوئی کیل نے ہاتھ کی پشت پر لکیر نما زخم بنا دیا۔
جو اتنے دنوں بعد بگڑ گیا تھا۔ ہر روز بینڈیج ہو رہی تھی۔
"تو تمہیں کس نے کہا تھا کہ جا کر جانور بن جاؤ۔ مارنے کوٹنے کے لیے بیٹ بلے لے کر جاؤ گے تو بے خیالی ہی میں سہی کبھی کبھار وار پلٹ بھی جاتا ہے۔"
"تاباں.....!" زاہدہ سمیت سب کی سانسیں خشک ہو گئیں (کیا اس نے جاذب سلطان کی طرف داری کی تھی؟؟؟)
دوسری جانب سب مردوں کی نظریں ترازو ہو گئیں۔ وہ اسے تول رہے تھے۔ جو کبھی گھٹتی تھی اور کبھی بڑھتی تھی۔
"باس!" مجاہد تاج نے دونوں ہاتھ ٹھہراؤ کے لیے ہوا میں سیدھے کیے۔
"میرا سوال وہیں کا وہیں ہے تاباں.....! تم دروازے سے اتنا باہر کیوں نکلیں؟"
"میں پہلی مرتبہ نہیں نکلی ابا.....!" وہ تڑپی تھی اور بھڑک کر بولی تھی۔ "اور آپ جانتے ہیں' میں گھر سے باہر نکلنے سے پہلے یہاں اسی کامن روم سے خود کو عبایا میں ڈھک لیتی ہوں۔ صرف انگلیاں نظر آتی ہیں اور آنکھیں اور پیر..... بلکہ پاؤں میں بھی موزے چڑھا لیتی ہوں ورنہ جوتے کے ڈیزائن کے باہر پاؤں کالے ہو جاتے ہیں۔"
وہ اپنی صفائی دیتے دیتے ایک اہم ٹپ بھی دے گئی۔ ضوفشاں' جمیل بھائی' تایا جی سب ایک ساتھ چونکے۔ یہ بے ساختگی اور مگن انداز اس بات کی دلیل تھا کہ وہ حرف بہ حرف سچ کہہ رہی ہے۔
"مگر ابا میں کاشان کو دیکھ رہی تھی اور میرا نہیں خیال کہ مجھے اس کے لیے صفائی دینی ہو گی کہ میں کاشان کو کیوں دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے سوال پوچھنے کے بجائے آپ ان دونوں سے کیوں نہیں پوچھتے کہ انہوں نے مجھ سے اس طرح بات کی ہی کیوں؟"
"ایسی دلیلیں دے کر تم ہمیں الو نہیں بنا سکتیں۔" عقیل کو اتنی مدلل بات ہضم نہیں ہوئی۔ شکیل نے اثبات میں سر ہلا کر جیسے بھائی کی تائید کی۔
"بنے بنائے پر مزید محنت کرنے کو میں بھی وقت کا

ضیاع سمجھتی ہوں...... جسے!" وہ دھاڑی۔

"بدتمیزی نہیں تاباں۔" تایا جی نے انگلی اٹھا کر اسے ہوش مندی کی تلقین کی۔

"میں بدتمیزی نہیں کر رہی ہوں تایا ابا...... لیکن"

"چھوٹا زیادہ جھگڑتا ہے۔" عقیل نے شکیل سے یونہی برسبیل تذکرہ کیا جیسے۔

"میں تمہارا منہ توڑ دوں گی عقیل......!" اس نے کانٹا — ہاتھ میں بھالے کی طرح لہرایا پھر وہ باقی سب کی جانب گھومی۔ "اگر یہ اسی طرح بلاوجہ بولتا رہا تو ......" اس کی اونچی آواز پر سب الرٹ ہو گئے تھے' اسے بھی احساس ہوا۔

"مجھے نہیں پتا ابا......! یہ دونوں اتنا ڈراما کیوں کر رہے ہیں۔ ابا! اگر آپ کو یقین کرنا ہے تو کرلیں۔ نہیں کرنا تو بھی بتا دیں...... مگر ان کا منہ بند کروا دیں۔ میں کاشان کے پیچھے۔"

"کاشان کا اچھا بہانہ ہے اتنا تیار شیار ہو کر...... نیا جوڑا' خوشبوئیں لگا کر سائیکل کی چین لگانے بیٹھ گئیں ...... ہونہہ!" یہ جملہ چاچی کے علاوہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

تاباں نے صرف اک بے حد گہری نگاہ ان کے چہرے پر جمائی تھی جبکہ وہاں موجود تمام خواتین و لڑکیاں فقط کچھ بھی کہنے کی خواہش میں لب کھول سکی تھیں۔

"چاچی جی! آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔" وہ سینے پر ہاتھ لپیٹ کر بڑی تسلی سے ان کی جانب گھومی۔ "میں بچپن ہی سے ایسے رہتی ہوں۔ میں نے یہ سارے کپڑے الماری میں سجانے کے لیے نہیں بنائے ہیں۔ میں انہیں پہنوں گی۔ ختم کروں گی اور پھر نئے سلوالوں گی۔ میں آپ کی طرح نہیں کر سکتی کہ اچھے کپڑے الماریوں میں غائب کر دوں۔ اور خود کسی سوٹ کی قمیص کسی کی شلوار اور کوئی دوپٹا چڑھا کر سارے گھر میں لہسن' ادرک اور پسینے کی بو کا اسپرے بن کر چکراتی پھروں...... ہونہہ!"

کئی لبوں پر مسکان لپکی اور چاچی جی آگ بگولہ ہو گئیں۔ یہ ساری تو ان کے حلیے کی تفصیل بتا دی گئی تھی۔ ساجد چاچا کے چہرے پر قائل ہونے کے بعد جتاتا تاثر...... تو دونوں صاحب زادوں کو احساس ہوا بی تاباں نے ان کی ماں کی بے عزتی کی ہے۔

"جب میرے ابا مجھے یہ سب لے کر دے سکتے ہیں تو میں کیوں نہ شکر کر کے سب چیزوں کو استعمال کروں۔ کفران نعمت کیوں کروں...... کیوں ابا؟"

"تم موضوع بدل رہی ہو۔" شکیل بھنایا "تم دروازے پر گئی ہی کیوں تھیں؟"

"تم دروازے کی بات کرتے ہو اگر دو منٹ اور گزرتے تو میں...... پیچھے گراؤنڈ میں چلی جاتی۔ آپ اگر دیکھ لیتیں ناں امی کہ وہ کیسے تماشے کر رہا تھا۔ مجھے تو لگا' وہ موت کے کنوئیں میں سائیکل چلانے جا رہا ہو۔" اس کے چہرے پر سنسنی پھیلی جس کے رنگ زاہدہ کے چہرے پر بھی پھیل گئے۔

"وہ تو میرے ہاتھ نہیں آیا ورنہ ایسے کھیل سے بہتر میں اسے کمرے میں ہی بند کر دیتی۔"

"اس سے اچھا کر ہی دیتیں۔ میں کون سا جیت کر آ گیا۔ دو راؤنڈ جیت لیے تھے' تیسرے میں وہ چین دوبارہ اتر گئی۔ لگائی ہی اتنی غلط تھی۔ سب بھاگ گئے۔ میں اسے جوڑنے میں لگ گیا۔ جڑتی بھلا کیسے ...... تھی ہی بے کار' ہار کے آ گیا۔ پتا ہے جاتے ہوئے ٹوکتے نہیں۔ مگر یہ وہاں دروازے پر کھڑی ہو کر مجھے پھونکیں مار رہی تھیں۔"

پھولے ہوئے منہ کے ساتھ آتے کاشان نے اپنی بپتا بیان کی۔

وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ رہا تھا۔ تندرست چہرہ سوج کر اور کپا لگ رہا تھا۔

"سب نے میری سائیکل کا اتنا مذاق اڑایا اور کوئی مجھے ایسا ویسا کچھ کہے' یہ تو میں برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ ایک بڑا بلاک اٹھا کر پہلے اگلے وہیل پر مارا۔ پھر ایک بلاک پچھلے پر...... پچکا کر رکھ دی میں نے سائیکل۔"

وہ ڈونگوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا کہ کھانے کے لیے کیا کیا ہے؟؟؟

"میں نے باہر سے منگوا کر دی تھی سائیکل!" ساجد چاچا کی آواز میں بے یقینی آمیز صدمہ تھا۔

"تو سب کی سائیکل باہر ہی سے منگوا کر دی جاتی ہیں۔ کسی کی امی کچن میں جا کر تو بنا کر دیتی نہیں ہیں۔" کاشان نے نکتہ رسی کی حد کر دی۔

"اور اب وہ سائیکل کہاں ہے۔" سرسراتی آواز چاچی جی کی تھی۔

"کہاں ہونی تھی' وہیں پھینک کر آ گیا۔" اسے قطعاً پروا نہ تھی۔

"میں نئی لے دوں گا اچھی والی۔" مجاہد تاج نے اعلان کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اچھا ہوا خود ہی جان چھوٹ گئی۔" تاباں نے کسی قدر بے چینی سے کہا "تم صرف ان ڈور گیمز کھیلو گے کاشان!"

"میں سب گیمز کھیلوں گا۔ مگر آپ میرے پیچھے دروازے تک نہیں آئیں گی۔"

"وہ تو میں آؤں گی ہی۔ بلکہ اگر تم ایسے تماشے کرنے کے لیے نکلتے ہو تو میں تمہارے پیچھے گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ جایا کروں گی۔" تاباں نے سچ مچ کہا۔

"امی!" کاشان نے غصے سے چیخ پڑا۔

"امی کو آواز مت دو...... میں اس معاملے میں اپنی مرضی ہی کروں گی اور لازماً کروں گی۔"

تاباں کے برجستہ لہجے نے کاشان کے ذخیرہ الفاظ میں آگ لگا دی سو اس نے تڑپ کر بڑوں کو دیکھا۔ اس کے آنے پر سب اصل معاملے کو پل بھر کے لیے ہی سہی فراموش کر چکے تھے۔ دیکھنے پر یوں لگا کہ جیسے اس ساری مجلس کو کاشان اور تاباں کے مسائل حل کرنے کے لیے تکلیف دی گئی ہو۔ کاشان بے چین کھڑا تھا۔ جبکہ تاباں سر اٹھا کر لاپروائی سے کھڑی تھی۔ وہ اپنا فیصلہ سنا چکی ہے۔

"تاباں!" ابا کی آواز پر وہ گھومی۔

"یہ کاشان اور اپنا معاملہ تم بعد میں حل کرتی رہنا۔"

وہ اپنی نشست سے کھڑے ہو چکے تھے۔ "لیکن تمہیں...... دوبارہ دروازہ پر نہ دیکھا جائے۔" (ابا...... کا...... لہجہ...... ؟؟؟!)

"ابا!" تاباں کو اپنی آواز گھٹنے کا احساس ہوا۔ "میں دروازے پر نہیں جاتی ہوں اور جاؤں بھی کیوں؟"

"اچھی بات ہے...... جانا بھی مت۔" ابا سمیت سب اسے دیکھ رہے تھے۔

تاباں کو اس پل پہلی بار احساس ہوا۔ اسے کیا کہا جا رہا تھا اور کیوں کہا جا رہا تھا۔

"آپ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ اور ابا ...... ہمارے درمیان دروازہ کیوں ڈسکس ہو رہا ہے۔ کیا پہلے کبھی میں دروازوں' چوراہوں پر کھڑی ہوتی ہوں جو۔" اس کے جملے میں جیسے جیسے لفظ بھرتے گئے آواز بھی لہرانے لگی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔" مشاہد تایا نے کہا۔

"کیا بات تھی پہلے تایا جی!"

تاباں نے بری طرح چونک کر سب کو دیکھا۔ گھر کے ماحول میں لڑکیوں کو دوبدو بولنے کی تربیت نہیں تھی نہ فطرت مگر تاباں غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا جانتی تھی۔ ابا کے واضح جملے و احکامات اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ سب سمجھ رہے تھے وہ حیران رہ گئی۔

مجلس برخاست ہو چکی تھی۔ سب ادھر ادھر ہو گئے۔ وہی جہاں کی تہاں تھی۔ ایک غیر یقینی کے احساس میں گھری جملے اور لہجے اور چہروں کے تاثرات باری باری آ کر اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔

اس سے کیا کہا جا رہا تھا۔

کیا اس پر شک کیا جا رہا تھا؟

لیکن کیوں؟

ضوفی نے شانہ چھو کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ چونک کر مڑی۔ سارے سوال چہرے پر تحریر ہو گئے۔ لب فقط نیم وا ہو کر رہ گئے ضوفی نے شانہ تھپتھپایا تھا اور سر ہلا کر ہی تسلی کروائی تھی۔

"یہ سب لوگ۔" اس کے منہ سے نکلا۔

☆ ☆ ☆

حیدر سلطان اتنے بڑے واقعے کو خاموشی سے پی گئے تھے۔ منہ سے بھاپ تک نہ نکالی کہ بیٹے کی زندگی مطلوب تھی۔ جو نیم جان چھوڑ گئے تھے۔ وہ اگلی بار ..... خدانخواستہ دل پر ہاتھ رکھ کر تحمل و بردباری سے سوچتے تو..... سب کو یہی بتایا کہ بائیک چھیننے کی کوشش تھی۔ جاذب بائیک چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ تو سامنے والے بھڑک گئے اور نتیجے میں حشر نشر کر گئے۔

اور اگر وہ کسی کے سامنے لب کھول بھی لیتے تو کہتے کیا..... کہ ان کا بیٹا لڑکی کا پیچھا کرتا گھر تک پہنچ گیا اور کالج کے گیٹ پر کھڑا رہا اور..... اور.....

اگر مضروب نے لب سی لیے تھے۔ تو ضرب لگانے والے بھی لاکھ چاہنے کے باوجود) کسی کو بہادری کا کارنامہ سنانے نہیں بیٹھے تھے۔ ورنہ دل تو یہی کرتا تھا۔ مار کی مکمل وڈیو چینل پر چلادیں اور ساتھ تنبیہی بیان بھی کہ..... "ہم ایسا حشر کردیا کرتے ہیں۔"

لیکن مین روڈ پر شکیل، عقیل اور جمیل کے ہاتھوں کیا جانا والا تماشا بہت سوں نے دیکھا بھی تھا۔ ان کے منہ پر ہیلمٹ تھے۔ مگر پہچاننے والے پہچان گئے تھے۔ نازاں و افشاں کے شوہروں نے تینوں بھائیوں کو پکڑ لیا۔

"تم لوگوں نے بڑی اندھی مچائی ہوئی ہے شہر میں ..... ایسی بھی کیا کٹ لگانا۔"

تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ انہیں ٹالنا ہی تھا یا ایک شان دار من گھڑت قصہ فوری طور پر تیار کرنا پڑے گا۔ جمیل بھائی نے سوچا۔ مگر اس سے پہلے عقیل نے سب اگل دیا۔ کھول کھول کر بیان کیا بلکہ بہت سے پھول بوٹے بھی ٹانکے۔ شکیل بھی شامل ہو گیا اور جہاں عقیل سے کچھ بھول ہوتی، وہ زیادہ وضاحت سے بیان دینا شروع کردیتا۔ جمیل بھائی لب بھینچ کر رہ گئے۔

یہ قصہ جیت جانے کے باوجود بتانے کا نہیں تھا کہ کہیں نہ کہیں اس میں گھر کی لڑکیاں بدنام ہوتی تھیں اور خاص طور پر دامادوں کو..... اور داماد بھی رضوان، عمران جیسے، جو ہمہ وقت کھاتے پیتے، خود سے بلند مرتبہ سسرال کے عیبوں کی تلاش میں رہتے ہوں۔

اگلے دن خالہ جان حاضر تھیں۔ بیٹوں نے کمرہ بند کر کے سارا قصہ بڑے پراسرار لہجے میں کسی قدر رعونت سے ماں کو سنایا تھا اور ہر واقعہ کو ضرب دے کر بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ پھیلی آنکھوں اور کھلے منہ سے سنتی خالہ جان کو مزہ نہ آیا۔ وہ کرید کرید کر پوچھتی رہیں۔ یہ سچ جھوٹ ملا کر سناتے رہے۔

صبح سویرے ہی وہ تفصیلی معلومات و تبصرہ کے لیے موجود تھیں۔

ان کے مسلسل سوالوں نے گھر کی سب خواتین کو حق دق اور لاجواب کردیا۔ انہیں کس نے..... یہ سب بتایا (سارا سچ بھی..... اور چسکہ دیتا جھوٹ بھی)

"ایسے معاملات ہی میں تو بھائی بھائی کے کندھے سے کندھا جوڑتا ہے۔ ایک آواز لگادینی تھی۔ رضوان عمران کو....."

"نہیں بس وہ....." امی آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی بس ایک دھمکی ہی تو دینی تھی۔" تائی جی نے شعوری لاپروائی سے کہا۔

"دھمکی کی خوب کہی۔" خالہ جان نے ہاتھ نچایا۔ "دھمکی سے سدھرنے والے ہوتے تو تب ہی نامان جاتے، جب تم تینوں عورتیں سمجھانے گئی تھیں۔ بلکہ جب بھائی صاحب نے اس کے باپ کو شرافت کی زبان میں سمجھایا تھا۔ بلکہ تم نے زاہدہ..... مجھے یعنی سگی بہن کو بالکل ہی فراموش کردیا۔ کوئی مشورہ، عقل تو میں بھی دیتی بلکہ تم لوگ مجھے ساتھ ہی لے کر جاتیں میں بتاتی انہیں کہ....."

"وہ بس ہم نے کہا کہ..... گھر کی بات گھر ہی۔"

"اچھا آ آ آ..... تو اب سگی بہن باہر والی ہو گئی ہے؟" خالہ اچھل پڑیں۔

"ناں، ناں..... میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ بس..... وہ ہم نے اتنی اہمیت دی ہی نہیں ورنہ..... اور بچیوں کے لیے باہر اندر سے رشتے تو آتے ہی رہتے ہیں۔"

زاہدہ تیزی سے صفائی دینے لگیں۔

خالہ نے گال چڑھا کر تاثر دیا کہ یہ صفائی بے سود رہی۔

"یہ بتاؤ....." وہ آواز مدھم کر کے صوفے پر آگے کو کھسکیں۔ "تاباں تو صحیح رہ رہی ہے ناں!"

سب خواتین اچھل پڑیں اور آنکھیں گنجائش سے زیادہ پھیل گئیں۔ چائے کی ٹرالی لاتی لڑکیاں بھی بری طرح ٹھٹکیں۔

"تاباں کا یہاں کیا ذکر.....؟" تائی جی کا لہجہ کڑک تھا۔

"میرا مطلب ہے....." خالہ کو گڑبڑانا پڑا۔

"کوئی مطلب نہیں ساجدہ.....!" تائی جی نے خود کو شانت رکھا۔ "لڑکے کی ماں نے تصویر دیکھ کر پسند لیا۔ رشتہ لے آئیں۔ شریفوں کا یہی چلن ہوتا ہے۔ ہم نے عزت سے چائے ناشتہ پوچھ کر..... اپنی مجبوری بتا دی کہ ہم ذات برادری سے باہر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ بس..... آگے جا کر انہیں لگا کہ شاید سمجھانے بجھانے سے لچک نکل آئے تو وہ آدمی مجاہد وغیرہ سے آفس میں مل لیا۔"

"تو یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ مگر بیٹوں کی کارروائی کے بعد لڑکے نے اسکول کالج کے چکر کیوں کاٹنے شروع کر دیے۔" خالہ جان نے بہت واضح آواز میں کہا اور یہاں سب لاجواب ہو گئے۔

"اب اس کا جواب تو لڑکا ہی دے سکتا ہے ناں؟" ضوفی آگے بڑھی۔ "آپ یہ چائے لیں اور خاص طور پر یہ پزا....." خالہ جان کا دھیان فوراً پلٹا وہ سگی بہن کے ہاں آکر سمدھن والا پروٹوکول چاہتی تھیں۔ پہلی نظر ہی میں سب چیزوں کو دیکھ لیا اور پسندیدگی چہرے پر پھیل گئی۔

چائے تمام حاضرین محفل کے لیے تھی سو وہ چاروں بھی وہیں ٹک گئیں۔

"تو پھر تم نے تو لڑکے کو دیکھا ہو گا ناں..... کیسا ہے؟" بہت کچھ کھا لینے کے بعد وہ تاباں کی سمت گھومیں۔ تاباں کا خون پہلے ہی ابل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تمتماہٹ تھی۔ یہ سب شکیل، عقیل کا کیا دھرا تھا۔ جنہوں نے کسی ایک بات کا بھی پردہ نہ رہنے دیا تھا۔

اس کی زبان سے کوئی انگارہ نما جملہ نکلنے والا تھا۔ مگر تب ہی نگاہ زاہدہ کے ملتجی چہرے پر پڑی۔ ساتھ ہی باقی سب کے تنبیہی چہرے۔

اس نے لب بھینچ کر نفی میں گردن ہلا دی۔ جبکہ خالہ جان کے چہرے پر بے یقینی تھی۔

"ویسے لڑکا تھا کیسا؟" انہوں نے سوال دہرایا۔

"لڑکوں جیسا لڑکا خالہ جان..... جیسے کہ سب لڑکے ہوتے ہیں۔" ضوفی نے رسان سے کہا۔

"میں آپ کو گھر بتا دیتی ہوں آپ جا کر دیکھ لیں۔ لیکن ہمیں اتنی تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس راہ جانا نہیں، اس کے کوس گننے کا کیا فائدہ۔"

"ویسے گھر ہے کہاں؟"

ضوفی نے ٹھنڈا سانس بھر کے علاقے کا نام لیا۔

"اوئی، وہاں تو سب کے سب بڑے بڑے بنگلے کوٹھیاں ہیں۔"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

زاہدہ اور ساجدہ..... دو سگی بہنوں کے نصیب ایک دوسرے کا الٹ تھے۔ زاہدہ کو شادی کے بعد خوشحالی و بے فکری میسر آئی۔ رزق کی فراخی.....

جبکہ

ساجدہ نے زندگی بھر تنگی کا رونا رویا۔ سر ننگے..... پیر ڈھکے والی مثال رہی۔ بچتیں، ضرورتیں، کمیٹیاں..... تمام زندگی وہ چھوٹی بہن زاہدہ سے تقابل کرتی رہیں۔ اس کی آسانیاں، خوشحالی بلکہ تاج ہاؤس ان کے لیے ایک جنت کی طرح تھا۔ جہاں کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں تھا۔ فقط چین کی بنسی زاہدہ کی بیٹیوں کو بہوئیں بنا کر وہ خود کو اب اس گھر کی تینوں خواتین سے بلند رتبے پر پاتی تھیں۔

بہوؤں کو ملنے والے بے پناہ جہیز نے پورے علاقے میں ان کا ٹھکہ بنا دیا تھا۔ مگر جگہ کی تنگی کے باعث سب کچھ ڈبوں کارٹنز میں بند چھتوں تک چڑھا ہوا تھا۔

"میری مانو تو جتنی جلدی ہو سکے لڑکی کو گھر کا کر دو۔" جاتے جاتے وہ بولیں "ایسی باتیں لڑکیوں کا دماغ خراب کر دیتی ہیں۔"

"ایسی یا ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ مناسب وقت آئے گا تو کریں گے۔ مناسب رشتہ..... ابھی تو ساجدہ مائدہ ہی کی تیاری ہے۔"

"ہاں..... مناسب رشتہ..... میرا ہی ایک اور بیٹا ہوتا تو میں ہی لے لیتی..... دراصل لڑکیوں پر نام سا لگ جاتا ہے ناں۔ مگر خیر اللہ بہتر کرے گا۔" ان کے ہمدردانہ جملے نمک مرچ جیسے تھے۔

وہ مزید ایسے مشورے دے کر اور ہمدردی جتا کر چلی گئیں۔ مگر یہ سب جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

"امی!" ماجدہ نے بہت گہری سوچ سے ابھر کر پکارا۔ "یہ عقیل و شکیل کی بے وقوفی ہے یا کوئی..... جانتے بوجھتے ہوئے میرا مطلب ہے۔" وہ اٹکی "بہرحال باز پرس بہت ضروری ہے اور ابا وغیرہ کو بتانا بھی..... کہ اب مزید وہ اپنے منہ بند رکھیں حالانکہ....." اس نے تلخ بستہ سانس لی۔ "اب وہ منہ بند رکھیں یا گھر گھر بتانا شروع کر دیں۔ فرق کوئی نہیں ہے۔"

"ماجدہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ضوفی نے کہا۔ مائدہ نے بھی تائیداً سر ہلایا۔ زاہدہ کے چہرے پر بے چارگی سی تھی۔ جیسے انہیں کوئی غرض نہ ہو یا وہ بولنا سمجھنا سوچنا بھول چکی ہوں۔

تاباں اس وقت سے صوفے پر ایک ہی پوزیشن میں ٹکی تھی۔ اس کا چہرہ تاثرات کا مجموعہ تھا۔ غصہ شدید ترین غصہ..... نفرت..... انتقام۔ فیصلہ کن جارحیت بے بسی دکھ اور آنسو سے بھری آنکھیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری موجودگی میں جمیل..... یہ سب ہو گیا۔ تم نے روکا کیوں نہیں؟"

جمیل کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ ایک بہت برا کام جو ان کے چھوٹے بھائیوں سے سرزد ہوا اور وہ بھی ان کی موجودگی میں۔

بلائے جانے پر پہلے تو عقیل اور شکیل کچھ سمجھے ہی نہیں۔ انہوں نے تو اپنے تئیں اپنا کارنامہ بہت بڑھا چڑھا کر بتایا تھا کہ دیکھو جو کوئی بھی ہمارے گھر کی طرف ہماری عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا ہم اس کی آنکھیں نکال دیں گے اور اس کا وہ حشر کریں گے کہ رہتی دنیا تک نام رہے۔ مگر یہ کیا؟ یہاں انہیں سراہنے کے بجائے ذلیل کیا جا رہا تھا..... وہ کیوں؟؟؟

مجاہد تاج کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ سب نے پہلی بار ان کے چہرے پر تھکن سی دیکھی۔ وہ بس سوال و جواب کرتے مشاہد تاج کو دیکھتے رہے اور سخت شرمندہ و پریشان ساجد تاج کو۔ چاچی جی کا انداز لاپروائی لیے ہوئے تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہہ رہی تھیں مگر ان کے چہرے کا ہر عضو کہہ رہا تھا۔

"بچے ہیں، انہیں کیا خبر ایسی نزاکتوں کی..... اور چلو یہ نہ بتاتے تو کہیں اور سے پتا لگ جاتا اور سب سے بڑھ کر ایسی باتوں کا نتیجہ تو پھر بھگتنا پڑتا ہی ہے۔"

مشاہد تاج نے دونوں طرف کے بیان سننے کے بعد بہت تحمل بھری آواز میں ناصحانہ بیان جاری کیا۔

"تم لوگوں کی بہادری میں کوئی شک نہیں..... اور یہ سچ ہے کہ کوئی بھی کسی بھی حوالے سے اس گھر و خاندان کو نقصان پہنچانے کا سوچے تو اس کا یہی حشر ہو گا جو تم کر کے آئے مگر ایسی باتوں کا چرچا نہیں کرتے۔ اس فخر کو دل میں پالتے ہیں اور سینہ تان کر چلتے ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ زندگی بھر اس بات کو یاد رکھنا۔"

"اب یہ قصہ خاندان کے ہر فرد کے منہ پر ہو گا۔ کون یقین کرے گا کہ میری بچی۔" زاہدہ نے پہلی بار منہ کھول کر بھی ادھورا جملہ کہا۔ وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر رونے لگی تھیں۔

"تو کوئی بات نہیں، جو چسکے لے کر قصہ سنے گا۔ وہ یہ بھی تو سنے گا ناں کہ ہم نے حشر کیا کیا؟" شکیل نے کہا۔ عقیل کے انداز میں بے زاری تھی۔ اس نے زور زور سے سر ہلا کر تائید کی۔

"بدنامی ہو گئی۔ اب آگے کون پوچھے گا۔" زاہدہ کی ایک اور چنا تھی۔

"تو آگے پیچھے کا ذکر ہی کیا۔" چاچی جی نے لب کھولے۔ "اپنے گھر ہی میں سب کچھ سیٹ کر لیں گے۔" تمام لوگوں کو ان کی بات سمجھنے میں چند پل لگے تھے۔

تاباں نے خونخوار نگاہوں سے چاچی جی کو اور پھر ان کے قابل فخر سپوتوں کو دیکھا۔ عقیل اور شکیل اب بور ہو چکے تھے۔

"بہرحال! دوبارہ اس قصے کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ کہیں ذکر بھی ہو تو دامن چھڑا لینا۔" مشاہد تاج نے فیصلہ سنایا۔ یہ برخاستگی کا اشارہ بھی تھا۔

"بس اتنی سی سزا؟" تاباں کی آواز بلند تھی۔

"تو کیا قتل کر دیتے؟" عقیل کا جملہ چڑانے والا تھا۔ اس پر شکیل کا ہلتا سر۔

"قتل نہ سہی۔" تاباں کی برداشت ختم ہو گئی۔ چٹاخ..... اس نے ڈھیلے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

سب کے اوپر جیسے کمرے کی چھت گر گئی۔

"تاباں!" مائدہ نے اسے پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچا۔ مگر وہ بپھری شیرنی بنی کھڑی تھی۔ وہ اس کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی اور گریبان تار تار کر دینا اور..... اور۔

سب بڑے سکتے کا شکار تھے۔ یہ انتہائی ناقابل یقین صورت حال تھی۔ ساجد چاچا اور شکیل ایک قدم آگے بڑھے تھے۔ لیکن پھر اسے لڑکی جان کر یا بیٹی سمجھ کر چند فٹ پیچھے رک گئے مگر ایک تھپڑ ہاتھوں سے پڑتا ہے اور ایک آنکھوں سے.....

چاچی جی جارحانہ عزائم لیے آگے بڑھی تھیں۔ وہ اسے دن میں تارے دکھا دینا چاہتی تھیں۔ لیکن اس سے پہلے.....

تاباں کا جو ہاتھ مائدہ نے دبوچ رکھا تھا۔ وہ مجاہد تاج نے پکڑ کر اپنی جانب گھسیٹا۔ وہ لڑکھڑا کر سیدھی ہوئی یہ کس نے اس بے دردی سے..... اسے ضوفی کا اپنے اور ابا کے درمیان آنا محسوس ہوا مگر تب تک۔

چٹاخ..... ہاہ..... اور کس نے کہا۔ تھپڑ کی تکلیف گال پر ہوتی ہے تھپڑ پہلے مرحلے میں تکلیف دوسرے میں ذلت اور اگر آپ باضمیر ہیں تو موت بن جاتا ہے۔

چاچی جی کا انتقام ابا نے لے لیا تھا۔ حالانکہ ان کا دل پوری طرح ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ مگر..... وہ مارتیں تو پے در پے مارتیں۔

"ابا.....!" ضوفی نے تیزی سے اپنے ابا کو جپھا مار لیا۔ وہ انہیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ امی کے رونے میں تیزی آ گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے تائی جی بھی کھڑی ہو گئی تھیں۔ یہ منظر اس گھر کی دیواروں نے بھی پہلی بار دیکھا تھا۔ لڑکیاں کپکپا رہی تھیں۔

"ایک تو ان کی عزتوں کی حفاظت کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر جاؤ۔ مکے ڈنڈے کھاؤ اور گھر میں بھی کتے والی....." چاچی جی نے شکیل کے ہاتھ کے زخم پر دیکھا جہاں اب بھی بینڈیج تھی۔

"یہ عزتوں کی حفاظت کی ہے یا مجھے چوک پر ننگا کر دیا ہے اور ساتھ ہی ٹکٹ لگا دیا کہ آ کر تماشا دیکھو۔"

تاباں نے بپھری شیرنی کی طرح کہا۔ وہ مائدہ سے خود کو چھڑا رہی تھی۔ وہ اسے چبا ڈالنا چاہتی تھی۔ اسے.....

"ابا..... تاباں ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ضوفی نے لب کشائی کی۔ "ان کے پاس سو بہانے تھے، یہ کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر وہ سب پورے قصے کے عینی شاہد بھی ہوتے تب بھی یہ مکر کے..... اپنی کہتے..... کون چیلنج کرتا۔ یہ تو وہی بات ہو گئی ناں گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے..... اور جمیل بھائی! آپ نے ایک بار بھی انہیں ٹوکا نہیں..... آپ چاہتے تو دن کے بارہ کو رات کے بارہ بتا کر قائل کر لیتے مگر آپ نے شاید اہمیت ہی نہ دی۔"

"کیوں دیتے اہمیت.....!" تاباں کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ ہاتھ گال پر دھرا تھا۔ "یہ کوئی رانیہ..... سونیا کا معاملہ تھوڑی تھا۔"

"اے! میری بہنوں کا نام مت لینا۔ وہ تمہاری طرح نہیں ہیں۔" شکیل کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔

"اچھا...!" تاباں نے سختی سے آنسوؤں کو رگڑا۔ "سن لیں ابا... ہم ان کی بہنیں نہیں ہیں' سو عزت' بے عزتی کا معیار الگ ہے اور اگر آپ ان سب سے اس حوالے سے کوئی امید باندھے بیٹھے تھے تو آج اس سے پیچھا چھڑا لیں اور ہاں ٹھیک ہے شکیل! جب ہم تمہاری کچھ بھی نہیں ہیں تو جو جی میں آئے وہ تم کرو۔ ٹی وی والوں کو فون کرکے بتاؤ کہ تم عزت' بے عزتی کے نام پر کیا کر کے آئے ہو اور کیا کرنے والے ہو۔" وہ سب کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

ساجد چاچا بیٹے کے بے ساختہ جملے پر گڑبڑا گئے تھے۔ مشاہد تاج بھی اس جملے پر کچھ چونکے ہوئے تھے۔ جبکہ مجاہد تاج کو اپنے ہاتھ میں چیونٹیاں چلنے کا گمان ہو رہا تھا۔ ان کی ہتھیلی پر ہلکے درد کا احساس تھا۔ فقط تھپڑ مارنے سے اتنا درد... تو کھانے والے کو کیا لگا ہوگا۔ بیٹی کے بے داغ چہرے پر ان کی انگلیاں ثبت تھیں۔

"ایک تو کارنامے... اوپر سے تڑتڑ چلتی زبان..." چاچی جی کا لہجہ آگ تھا۔

"کون سے کارنامے... میں نے کیا ہی کیا ہے؟ اپنے گھر کے اندر' اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ صبح و شام کرتی ہوں۔ مجھے کیا خبر باہر کیا ہو رہا ہے۔" وہ حلق کے بل چلائی۔ سب کو یکدم اس کے جملے کی سچائی و گہرائی کا اندازہ ہوا۔

"میرے ساتھ تو یہ ہوا کہ رات کو گھر کے اندر والے کمرے میں پردے گرا کر دروازے' کنڈیاں چیک کر کے سوئی اور... اور... صبح اٹھ کر دیکھا تو نہ دیواریں تھیں نہ چھت... کسی نے چارپائی اٹھا کر چوک پر رکھ دی نہ چادر رہی نہ چار دیواری۔"

اس کا لہجہ دھیما' آواز دھیرے دھیرے مدھم ہو گئی۔ شکست خوردگی' بے بسی' بس اتنی ہی اہمیت تھی۔ کیا ہار کیا جیت...

وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

"مجھے اب اور کچھ نہیں کہنا... تم دونوں کو اللہ ہی پوچھے۔" وہ صوفے سے کھڑی ہو کر جانے لگی۔

"اچھا نہ ہوتا ابا!" وہ یکدم مڑی اور رکی' اس نے دھیرے سے اپنے گال پر انگلیاں پھیری تھیں۔ "میں کچھ کر ہی لیتی۔"

اس کا سادہ جملہ سمجھنے میں چند پل لگے تھے۔ اس کے لہجے میں بین تھا ماتم جیسے کوئی ویران کھنڈر میں بال کھولے شام غریباں منا رہا ہو۔

زاہدہ بے آواز رو رہی تھیں۔ وہ یکدم باآواز رونے لگیں' تاباں پیچھے دیکھے بغیر اندر بھاگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مائدہ کی ساس بہت ہلا گلا کرنے والی زندہ دل عورت تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بڑے سے بڑا قہقہہ لگاتیں۔ جب بھی آتیں نئی کہانی... اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے لاتیں اور مائدہ کو چکھاتیں۔ مائدہ کا چہرہ جانچتیں۔ مائدہ تعریف کے لیے لب کھولتی۔ بہترین جملے۔ وہ مائدہ کا چہرہ پڑھ رہی ہوتی تھیں۔

"اونہوں" وہ نفی میں گردن دائیں بائیں کرتیں۔ "میں جانتی ہوں میں کیسا کھانا بناتی ہوں۔ تمہیں اس لیے چکھانے کے لیے لاتی ہوں کہ تم نے میرے گھر آ کر ایسے کھانے' بالکل نہیں بنانے ہیں۔"

مائدہ اور باقی سب حق دق رہ جاتے۔

"ہم سب نئے ذائقوں کے لیے ترس رہے ہیں۔ تمہیں ہمارے گھر آ کر نت نئی چیزیں بنانی ہیں۔ سمجھ گئیں۔"

مائدہ کے حلق سے پھنسی پھنسی "جی" نکل آتی کبھی لان کے جوڑے دینے آتیں اور ساری داستان سناتیں کہاں سے لیا کتنے اور رنگ تھے۔ یہی والا کیوں لیا؟؟؟ ان کی یہ بھی خواہش ہوتی کہ جب وہ آئیں تو سب ہی ان کے اردگرد بیٹھ جائیں اور سچی بات یہ تھی کہ سب کو ان کے ساتھ بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔

اس روز وہ چار پانچ خواتین کا ایک گروپ لے کر آ گئیں۔

"بھئی میں نے آپ سب کی اتنی تعریفیں کیں کہ سب کو ملنے کا اشتیاق ہونے لگا اور دوسرے سب کو مائدہ سے ملنے کا بھی شوق تھا۔ کہنے لگیں۔ اب شادی تک انتظار نہیں ہوتا۔ ہمیں تو تم ملا دو۔"

انہوں نے اپنی سب سہیلیوں کا فردا" فردا" تعارف کرواتے ہوئے توجیہہ پیش کی۔

"چلیں بھئی' بلائیں سب کو... چھوٹے بڑے سب۔" ان کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔

"بات یہ ہے کہ بیٹیاں میں بیاہ چکی ہوں۔ ایک بیٹا یعنی آپ کا داماد صبح دفتر جاتا ہے تو سورج ڈھلنے کے بعد آتا ہے۔ دوسرا کالج میں ہے' ہے تو مارننگ شفٹ میں مگر... مجھے تو لگتا ہے' نائٹ کلاسز بھی بھگتا کر آتا ہے کہ علم حاصل کرنے میں کوئی کسر رہ نہ جائے۔"

لڑکیاں دل کھول کر ہنسی تھیں۔

"ہاں تو سچ کہہ رہی ہوں ناں!" وہ خفا ہوئیں اور ایک نیا قصہ شروع کر دیا۔

تاباں بہت اشتیاق و محبت سے کپڑے درست کرتی ڈرائنگ روم کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔

"تم نہ جاؤ تاباں...!" امی نے اسے روک دیا۔

"میں وہاں اندر... آنٹی آئی ہیں ناں!"

"ہاں وہیں اندر... تمہارے ابا نے منع کیا ہے۔" زاہدہ نے نظریں چرائیں۔

"اور میں بھی کہہ چکی ہوں کہ تم گھر میں نہیں ہو۔" یہ تائی جی تھیں۔

"مگر... کیوں؟" اس نے دونوں کا چہرہ باری باری دیکھا۔

"ہر کیوں پر "کیوں" نہیں لگتی۔" یہ چاچی جی تھیں۔ "خوامخواہ میں نیا تماشا ہوں گی وہ ان کی سہیلیاں... مگر ہمارے لیے تو انجان ہیں ناں۔ آگا پیچھا کچھ پتا نہیں۔ نجانے کون کون سی ذات برادری' خاندان سے تعلق ہو۔ پھر کوئی نیا ٹنٹنا... ہونہہ..."

تاباں کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ایک شدید ناگواری کی لہر تائی جی کے چہرے پر بھی آن رکی۔ مگر اس کا سبب کچھ اور تھا۔

"عصمت بہن کسی ایسے ویسے کو گھر کی دہلیز تک کیوں لائیں گی۔ جن کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہیں' وہ بھی ان جیسی ہی ہوں گی ناں... اور ہمارے گھر کی عزت (مائدہ) اب ان کے گھر کی عزت ہے۔ جتنی محبت سے' مان سے وہ انہیں یہاں تک لائی ہیں ہمیں بدل میں مہمانوں کو اتنی ہی عزت دینی چاہیے۔"

"ہاں تو میں کب منع کرتی ہوں عزت دینے سے... میں بھی اندر ہی جا رہی ہوں۔ مگر اسے آپ رہنے ہی دیں۔ ایسے ہی لوگوں کی نظروں میں آ کر مصیبتیں پھر ہمارے لیے کھڑی ہوتی ہیں۔ ہاں نہیں تو۔"

تاباں پر ایک زہریلی نگاہ ڈال کر وہ آگے بڑھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تم میرے لیے فکرمند نہ ہو' میں نے شادی میں بھی شرکت نہیں کرنی۔"

"یہ کیسی بات کر دی؟" مائدہ' ماجدہ' ضوفی جو کپڑوں کے ڈھیر کو سمیٹنے بکھیرنے میں مصروف تھیں' بری طرح چونکیں۔

"کیسی بات کا کیا مطلب مجھے شرکت کرنے ہی نہیں دی جائے گی۔ تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں بلاوجہ مغز ماری کروں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے تاباں..." ماجدہ اس کے نزدیک آ گئی۔ "تمہیں کون روکے گا؟"

"کون روکے گا۔ اب بھی اس سوال کا جواب درکار ہے تم کو؟ ثبوت یہ سامنے ہے۔" اس نے جہیز کے کپڑوں' جوتوں' چوڑیوں اور دیگر اس طرح کے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ تینوں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

مائدہ کی سسرال کی طرف سے شادی کا پیام آیا تو ساتھ ہی ماجدہ کی تیاریاں بھی شروع کر دی گئیں۔ اتنے دنوں کی تناؤ والی کیفیت سے سب ابھر آئے۔

شاپنگ پر جانے کے لیے تو وہ موت کے فرشتے سے مہلت مانگ لیتی۔

مگر جب شاپنگ کا وقت آیا۔ تو تاباں کے لیے واضح احکامات تھے۔ وہ بازار نہیں جائے گی قطعاً" کسی بھی صورت نہیں۔ اس کے لیے بھی خریداری بہنیں کر لیں گی۔

"مگر میرا قصور..... میں ہی کیوں؟" وہ سراپا احتجاج تھی بے بسی، تڑپ زاہدہ کی بے بس نگاہ کے بعد مجاہد تاج کی جتاتی..... چاچی جی کی چڑاتی نظریں۔ وہ سن رہ گئی اس کا کیا قصور..... کس جرم کی سزا.....؟؟ مگر کوئی بھی اسے جواب دہ نہیں تھا۔

سب کے رویے نے اس کی فطری بے فکری اور خود اعتمادی کو شدید زک پہنچائی تھی۔ وہ جب سب کے درمیان ہوتی تو ہونٹ کچلنے لگتی۔ ادھر ادھر یونہی دیکھتی، ناخن کترنے لگ جاتی۔ ایک عضو معطل..... بنا کسی قصور۔

وہ اتنی نازک مزاج تھی۔ چھوٹی موٹی چیز اس کی ناک پر کبھی چڑھی نہ تھی۔ سب ایک ہی دکان سے ایک میٹریل اور قیمت کی چیزیں لیا کرتیں۔ مگر گھر آکر تاباں کی لی جانے والی چیز سب سے جدا لگتی۔ یہ اس کا ذوق تھا شاید.....

سب اس کے آگے اپنی خریداری کا ڈھیر لگا دیتیں اور اس کی رائے جاننا چاہتی تھیں مگر اس کے چہرے پر تعریف آتی نا تنقید..... نظریں اگر ٹک بھی جاتیں تو ارتکاز نہ ہوتا۔

مفت کی بدنامی..... ذلت..... اور زندگی کی تنگی۔

"میں نے تمہیں کہا تھا ناں تاباں....." ضوفی نے کہا۔ "تم پر شک نہیں کیا جا رہا۔ نہ تم مجرم ہو۔ مگر یاد رکھو، کچھ دیر بعد ہونے والی صبح تمہاری آزمائش ہے سو کوئی ایسا عمل نہ کرنا کہ پکڑ میں آجاؤ ورنہ بلاوجہ ماری جاؤ گی۔"

تاباں نے جواب نہ دیا، اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔

"یہی تو ہمارا المیہ ہے۔ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف جاتا ہے۔" ماجدہ نے کہا۔ "اللہ کرے مر جائے جاذب سلطان....." مائدہ کو اور کوئی رد عمل نہ سوجھا۔

"وہ کیوں مرے مائدہ....." ضوفی بولی۔ "راستوں میں چلتے وقت اکثر کتے بلے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ پھر انہیں مارا جائے گا یا جس کے پیچھے لگے ہیں، اسے کونے بیٹھ جائیں گے۔"

"اسے کتا کیوں کہہ رہی ہو اور وہ کیوں مرے سیدھے سبھاؤ سے آیا تھا وہ..... ایک بے حد شریفانہ عزت دار طریقہ..... مگر بس یہاں اس کے لیے جگہ نہیں تھی۔" تاباں نے تیزی سے کہا تھا۔

تینوں ساکت و صامت رہ گئیں۔

"اور بعد میں پیچھا کرنے کو تم کیا نام دو گی؟" ماجدہ نے چمک کر کہا۔

"ہو سکتا ہے، وہ بدلہ لینا چاہتا ہو، اسے ہتک کا احساس ہوا ہو۔ اسے۔" تاباں نے ایک ساتھ دو تین جملے کہے۔ جو سب کی سماعتوں کے لیے حیران کن تھے۔

ضوفی کو بہن کی نکتہ دانی نے ششدر کر دیا تھا۔ لیکن..... اسے یکدم کچھ کلک ہوا۔

ہتک پالنے والے..... انتقام بننے والوں کی آنکھوں سے اتنے جذبے تو نہیں امنڈتے۔ اتنی شکست خوردگی اور حسرت تو نہیں ہوتی۔

وہ نہتے ہو کر پٹتے نہیں۔ وہ پلاسٹر چڑھی کلائی اور لنگڑاتی ٹانگ کے سہارے یوں در جاناں کی خاک تو نہیں چھانتے۔

یہ کون سا جذبہ تھا۔ وہ شخص کیا چاہتا تھا۔

اپنی جان کی بازی لگا دینے والا..... منتقم مزاج ہو..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مائدہ اور ماجدہ کی آنکھوں نے ایک دوسرے کو پیام دیا۔

اور جس حال میں وہ ایک بار پھر آکر کھڑا ہوا تھا۔ حسرت و یاس سے بس نگاہ ٹکائے ہوئے۔ اس کی آنکھوں کا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر ضوفی نے سوچا ان میں یقیناً "بے رنگی ہی ہو گی۔

"مجھے تم سے کوئی گلا نہیں جاذب سلطان، نہ

ناراضی نہ شکوہ، زندگی بھر..... کبھی نہیں۔" ایسے میں جب وہ سب با جماعت جاذب کو کوس رہی تھیں۔ تاباں اپنے دل کی اس سرگوشی پر بری طرح چونکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔ کبھی نہیں....." تاباں نے صاف واضح آواز و الفاظ میں ضوفی سے کہا تھا۔

"تو کیا کرو گی تم؟"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا کروں گی..... صاف انکار۔"

"اور جیسے کہ سب مان لیں گے ناں۔"

"کوئی مانے نہ مانے، میں اپنی بات سے پیچھے ہٹنے والی نہیں" تاباں کا لہجہ پر عزم تھا "تم ڈاکٹر بن کر اپنا مستقبل محفوظ کرو گی۔ ماجدہ کے لیے جمیل بھائی جیسے شاندار آدمی..... مائدہ کا نصیبا لشکارے مار رہا ہے۔ آنٹی نے فون پر کل ہی خوش خبری سنائی۔ آنے والی بہو کے قدم بے حد مبارک ہیں۔ دو سال سے رکی پروموشن — کے آرڈر آگئے۔ گاڑی بھی مل گئی۔ افسر بن گئے وہ اور میرے لیے چاچا، چاچی..... شکیل کا رشتہ لے کر آگئے ہیں اور ابا نے مسکرا کر سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ میں....."

"شکیل میں کیا برائی ہے تاباں؟" ضوفی کی آواز بہت مدہم تھی۔

"وہ سونے کا بھی بن کر آجائے ناں تو تب بھی میں اس کی جانب نہ دیکھوں جس نے چوک پر میری عزت کا تماشا بنایا۔ وہ اب نگہبان بننے آ رہا ہے۔ میں کالے چور سے بیاہ رچا لوں گی مگر اس سے..... کبھی نہیں بلکہ کالے چور سے بھی کیوں؟ میں اسی شخص سے شادی کروں گی جو مجھے ہر لحاظ سے اپنے قابل لگے گا اور تاباں مجاہد کسی ہلکی شے کو کبھی پسند کر ہی نہیں سکتی۔"

ضوفی کے چہرے پر قائل ہونے کے تاثرات تھے۔ مگر ساتھ ہی ایک فق تاثر بھی جیسے دماغ کہیں اور ہو۔

تاباں کو یکدم محسوس ہوا۔ وہ جتنی بھڑکی ہوئی ہے اور بڑھ چڑھ کر بول رہی ہے اپنے عزائم بیان کر رہی ہے۔ حکمت عملی، قطعی پن۔ فیصلے..... ضوفی اتنا ہی ڈھیلی ہے وہ نہ تو خوف زدہ ہو رہی ہے۔ نہ گھبرا رہی ہے نہ سمجھا رہی ہے۔ وہ کسی اور ہی جہان میں ہے۔

"اے!" اس نے ضوفی کے کندھے کو باقاعدہ جھنجھوڑ دیا "کہاں ہو تم، کن سوچوں میں گھری ہو؟"

ضوفی نے اپنی نگاہیں تاباں کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ اسے جانچ رہی تھی۔ تول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کشمکش تھی۔ کچھ کہنے نہ کہنے کی کشمکش۔

"بہت دن گزرے تاباں۔" ضوفی کے لب کھلے۔ "یہاں شادی کا اتنا ہنگامہ ہے ناں..... میں الرٹ تو تھی ہی..... اور شروع میں گنتی بھی یاد رکھی۔ ایک دو تین اور پانچ اور شاید سات بار....."

"میں کیا پوچھ رہی ہوں اور تم کیا کہہ رہی ہو؟ کس چیز کی گنتی ہے یہ؟" تاباں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"لیکن گنتی سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔" ضوفی نے جیسے سنا ہی نہیں..... "اصل بات یہ ہے کہ وہ ایک بار پھر اسی مضروب و مخدوش حالت میں سامنے زیر تعمیر عمارت میں آکر کھڑا ہونے لگا ہے۔"

تاباں کے اوپر سے ایک ٹرین چنگھاڑتی ہوئی گزر گئی۔

"کہاں؟ کب؟ تم نے..... بتایا نہیں۔" ضوفی خاموش رہی۔

"اگر کسی نے اس بار اسے دیکھ لیا تو۔" تاباں نے جھرجھری لی۔

"تو وہ اپنی جان سے جائے گا۔" ضوفی نے جملہ مکمل کیا۔

"لیکن ضوفی..... میں سوچتی ہوں، کیا اسے اپنی جان پیاری نہیں؟ وہ کیوں اپنی زندگی داؤ پر لگائے کھڑا ہے۔" تاباں نے کھڑکی کے ہلتے پردے کو دیکھا۔ کیا..... وہ..... اس وقت بھی ہے۔"

"وہ تھوڑی دیر پہلے تھا۔" ضوفی بولی۔ ساتھ ہی وہ بے آواز اٹھی اور بہت غیر محسوس طریقے سے پردے

کو سرکا کر اس نے نگاہیں نکائیں۔ تاباں کی نگاہیں ضوفی کے چہرے پر تھیں جس پر جب "پالینے" کا تاثر آن رکا تو تاباں نے اپنے روئیں روئیں کو کھڑا ہوتا محسوس کیا۔

"وہ۔۔ چاہتا کیا ہے ضوفی؟" تاباں کا چہرہ سوال بن گیا۔

"اب تک نہیں سمجھی ہو۔۔۔ وہ تمہیں چاہتا ہے تاباں!" ضوفی کی آنکھیں جواب دے رہی تھیں۔

"اس چاہت کا انجام؟"

"فقط۔۔۔ ذلت، رسوائی اور۔۔۔ اور موت۔" ضوفی کے چہرے پر جواب بہت واضح تھا۔

☼ ☼ ☼

موت طاری ہو جائے تو زندگی کی طرف پلٹا نہیں جا سکتا۔

پر موت کا خدشہ ہو جائے تو زندگی کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ چھینا جھپٹی بھی جائز اور ناجائز بھی۔۔۔ سر دھڑ کی بازی لگائی جا سکتی ہے۔

جسم کی موت سکون ہے۔ اطمینان، بے فکری۔

اور روح کی موت۔۔۔ ؟؟؟

اور تاباں مجاہد کی روح کو چھلنی کیا گیا تھا۔ چر کے لگائے گئے۔ اسے بے موت مارا گیا یا پھر مارنے کا ارادہ کیا گیا۔ کم از کم تاباں کو تو یہی لگا۔

چاچی جی نے تاباں سے ہمیشہ ایک رشک آمیز حسد کا رشتہ اپنائے رکھا جو بعد میں فقط حسد رہ گیا۔ جب وہ بچی تھی تو سب سے ممتاز لگتی جب وہ بڑی ہوئی اور پھر اب جوانی کا جوبن۔۔۔ اس کی خوداعتمادی، خوش لباسی، بے نیازی، نا چاہتے ہوئے بھی وہ ان کی نظروں کے حصار میں رہتی۔ مقابلے بازی کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر وہ ایک تقابلی جائزہ لیتی رہتیں۔ حالانکہ یہ سراسر بے وقوفی تھی۔ وہ غیر شعوری ہی سہی کوئی ایسا موقع ڈھونڈتی رہتیں جب وہ تاباں کی کسی کمزوری کی پکڑ کر سکیں یا اسے کچھ جتا سکیں یا اسے کچھ سنا سکیں۔

اور جاذب سلطان والے معاملے میں تاباں کہیں سے بھی قصوروار نہیں تھی۔ مگر یونہی برسبیل تذکرہ جاذب سلطان کو لتاڑتے ہوئے اذیت تاباں مجاہد کو دی جا سکتی تھی کہ اس کا خوداعتماد چہرہ دھندلا جاتا تھا۔ وہ ہونٹ کچلنے لگتی تھی۔ لاجواب ہو جاتی تھی اور ایسے میں چاچی جی کو بے حد مزہ آتا۔ ہمدردی کی آڑ میں۔۔۔ جتانے کے سو طریقے۔

ایسی لڑکی جسے ہمیشہ کینہ توز نگاہوں سے دیکھا ہو۔ اسے بہو بنانے کے لیے وہ بڑے کروفر سے مجاہد تاج اور زاہدہ کے سامنے جھولی پھیلا کر پہنچی تھیں۔ ہر ماں کی طرح چندے آفتاب وچندے مہتاب بہو ان کا بھی ارمان تھی۔ مگر وہ بہو تاباں ہو گی، یہ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر کچھ عرصے سے وہ سوچتی تھیں۔ تاباں کو بہو بنا کر وہ اپنی انا کی تسکین کر سکتی ہیں۔ بس یونہی خوامخواہ۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔ مائیں کب بیٹوں کے عیب جانتی ہیں یا مانتی ہیں۔ مگر تاباں جیسی کاملیت پسند پسندیدگی کا اعلا ذوق رکھنے لڑکی کا شوہر شکیل ساجد بھی ہو سکتا ہے اور جاذب سلطان والے واقعے کے بعد تو تاباں کے حوالے سے چوٹ پہنچانے کا خیال اور زور پکڑ گیا۔

"ان کے بیٹے یونہی فالتو کے نہیں ہیں۔" پہلا خیال۔۔۔

"تاباں پر ساری زندگی ایک پریشر رہے گا، وہ جو جی چاہے گا اسے سنا سکیں گی۔ اس کی ازلی بے نیازی اور ایک فطری مغرور تاثر کو وہ اپنے تلوے تلے رکھ سکیں گی۔"

بعض اوقات ہم جانتے ہی نہیں کوئی خاص وجہ۔۔۔ اور کچھ لوگوں سے یونہی چڑنے لگتے ہیں۔ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ عناد پال لیتے ہیں اس کی پرورش کر کے اسے تناور درخت بنا دیتے ہیں اور پھر اس تلخ پھل سے زندگیوں کو زہریلا کر دیتے ہیں۔

پھر شکیل کا بھی رجحان نکلا۔ اس نے دل میں خود سے ہی طے کر رکھا تھا کہ اسے تاباں ہی سے شادی کرنا ہے اور یہ ارادہ کوئی اتنا حیران کن ہی نہ تھا۔

تاباں وہ چہرہ تھی جو ارادے بنا دیتی تھی۔ ارادے توڑ دیتی تھی۔

تمام تر مردانہ زعم کے باوجود اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ تھا کہ تاباں مانے گی نہیں لیکن وہی کہ اب ایک سنہری موقع ہاتھ آگیا تھا تو کیا گنوا دیا جاتا؟؟؟

اور پھر یہ کہ زندگی بھر تاباں پر، تایا پر اور سارے خاندان پر ایک احسان رہتا۔ وہ دب کر رہتی۔

دوسری جانب چاچی اور شکیل اپنے دل کو قیاس آرائی اور بدگمانی کی آخری حد پر بھی لے کر جاتے تب بھی دل کو اطمینان تھا۔ جاذب سلطان کی تمام تر کارروائی یک طرفہ ہے۔ تاباں پچ مچ لاعلم و بے قصور ہے۔ مگر اس حتمی خیال کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا لینے کے بعد وہ اپنا پیر بھی اوپر رکھ رہے تھے۔

شومئی قسمت ماں بیٹے کی بے حد نپی تلی گفتگو تاباں نے اپنے کانوں سے سنی۔ وہ آستینیں چڑھا کر اس کے سر پر پہنچی۔

"اگر تم دنیا کے آخری مرد بھی ہو تو تب بھی میں تم سے شادی کروں؟؟؟ کبھی نہیں۔" وہ اس کے سر پر کھڑے ہو کر چلائی تھی۔ وہ جواباً کچھ نہ بولا بہت گہری نگاہ سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے لطف اٹھاتا رہا۔

تاباں کے اندر بے چینی پھیلی۔ اس نے اس طرح سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ یکدم اٹھ کر اس کے عین روبرو آگیا۔

"دنیا کا پتا نہیں۔۔۔ مگر تمہارا پہلا بھی اور آخری بھی۔۔۔" وہ اتنا نزدیک آ کھڑا ہوا تھا کہ دراز قامت تاباں کا سر اس کے چہرے کے عین نیچے ہو گیا تھا۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر اس کی سیدھی مانگ سے اٹھتی مہک کو اپنے اندر اتارا تھا۔ وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہوئی۔

"میں۔۔۔ مم۔۔۔ میں ابا کو یہ ساری باتیں بتاؤں گی۔" اسے اپنا آپ ہارا ہوا لگنے لگا۔

"بے وقوف!" شکیل کا لہجہ بہت دھیما اور بوجھل ہو گیا۔ "ایسی باتیں اباؤں کو نہیں بتائی جاتیں۔"

تاباں کے پورے وجود میں چیونٹیاں سرکنے لگیں۔ وہ تابڑتوڑ جواب بھی دے سکتی تھی اور منہ توڑ دینا تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مگر۔۔۔ مگر یہاں مسئلہ یہ ہوا کہ وہ کزن سمجھ کر جھگڑنے آئی تھی، دھمکانے اور تادیب کرنے۔۔۔ مگر سامنے والا تو بات ہی کسی اور رنگ میں کر رہا تھا۔

اپنی تمام تر خوداعتمادی کے باوجود اس نے کبھی ایسی نگاہ نہیں جھیلی تھی۔ نہ ایسے جملے سہے تھے۔ وہ الٹے قدموں اپنے گھر کی جانب بھاگی تھی۔ پیچھے ایک بھرپور قہقہہ تھا۔

آج سے پہلے اس طرح کا قہقہہ بھی سماعتوں سے نہ ٹکرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب وہ ضوفی کے سامنے حلق کے بل چلاتے ہوئے چاچی جی اور شکیل کی گفتگو سنا رہی تھی اور پھر اپنی اور شکیل کی تب اس کا لہجہ بھی بہت تیز تھا۔ آنکھ سے شعلے۔ پسینہ اور پھولا سانس۔

اس وقت کامن روم عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ راشدہ آئی ہوئی تھیں۔ افشاں اور نازاں بھی موجود تھیں۔ بچوں نے بھی وہیں دھماچوکڑی مچا رکھی تھی۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ سزا اتنی کڑی سنائی جائے۔۔۔ وہ جمیل بھائی نہیں ہے۔ وہ چاچی کا پرتو ہے اور سب سے بڑھ کر ان کا فرماں بردار۔۔۔ مدر زبے بی ویسے ہی بیویوں کے لیے عذاب ناک شوہر ثابت ہوتے ہیں اور اس پر اگر مدر زہر پروڈیوس لرتی ہو تو پھر۔۔۔؟"

"بیٹا! سا سیں تو ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔" تائی جی کا چہرہ دکھ کا مظہر تھا اور آنکھیں کہتی تھیں "ہمیں تاباں کے حرف حرف پر یقین ہے۔"

"مگر شکیل میں اتنی بھی برائیاں نہیں۔ ہوتے ہیں اس عمر میں لڑکے اتنے شوخے، اکڑے، لاپرواہ۔۔۔ کون سا تمہیں جنگل میں بھیج دیں گے۔ اس کے ہمراہ یہیں اسی گھر میں سب کی نگاہوں کے سامنے رہو گی۔ کسی کی

کیا مجال کہ تمہیں کچھ سنا بتا سکے۔ میں اس کا حشر نہ کر دوں گی اور شکیل..... اسے تو میں اب بھی گھٹنے کے نیچے دبا کر کوٹ سکتی ہوں۔"

تائی جی نے اپنے گمبھیر لہجے اور جملوں کو انت میں ڈھیلا کر دیا۔ سب کے لبوں پر مسکان آگئی۔ بہت بچپن سے وہ لڑکوں کو غلطیوں پر اسی طرح فرش پر اوندھا گر کے مکوں سے مارا کرتی تھیں۔

تاباں کی چڑھی تیوری اور شعلے برساتی آنکھ میں ذرا لچک نہ آئی۔

"بتا دیں آپ سب کو..... ابا کو، میں مر جاؤں گی مگر ..... یہ جو تماشا ہونے جا رہا ہے ناں' اسے ہونے نہیں دوں گی اور تم....."

وہ ساکت سامت بیٹھی ضوفی کی جانب مڑی جو بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے فقط سامع کا کردار نبھا رہی تھی۔ نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔

"جو بڑے دلائل دیتی ہو۔ ایک ایک لفظ نپا تلا ..... اب کہاں گئی وہ صلاحیت؟؟؟ یا پھر وہ سب اپنے لیے کرتی ہو؟ میدان جنگ میں اس وقت آگے بڑھ کر وار کرتی ہو جب تمہاری اپنی جان پر بن جائے ورنہ ہتھیار سنبھالے سب کو لڑتے مرتے دیکھتی رہتی ہو۔" تاباں نے طنز کے تیروں سے سچ مچ ضوفی کا سینہ چھلنی کر دیا۔ اس نے فقط نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

"کہہ دو' جا کر ابا سے..... میں۔"

"کسی کو پیام لانے کی ضرورت نہیں۔ میں سب کچھ سن چکا ہوں۔" مجاہد تاج کی آواز پر سب اچھل پڑیں۔ سب کے چہرے فق ہو گئے مگر تاباں کے چہرے پر رونق آگئی۔ وہ کسی چھوٹی بچی کی طرح چند قدم آگے سرک آئی اور بہت تیز تیز بولنا شروع ہو گئی۔

اس کا انداز یوں تھا جیسے بچوں کے ہجوم میں تنہا کھڑی چھوٹی بچی جو لڑ لڑ کر ہانپ رہی ہو۔ سچی بھی ہو مگر کسی کو قائل نہ کر پاتی ہو۔ اچانک اپنے ابا اماں کو دیکھ کر بہادر ہو جائے کہ "دیکھا' اب آ گئے میرے ابا..... ابھی تم سب کو مزہ چکھائیں گے۔ دیکھنا۔ ذرا ٹھہرو ایک منٹ..... تمہاری تو ایسی کی تیسی..... ہاں نہیں تو....."

لیکن اگر! وہی ابا۔

"خدا کا شکر ادا کروں گا کہ عزت سے اپنے گھر کی ہو رہی ہو۔ سگا بھتیجا ہے وہ میرا۔"

"ابا! میری عزت میں کمی ہی کب ہے۔ جو میں عزت کے لیے ہاتھ پیر ماروں۔" وہ کرلائی۔

"ہر شخص کی زبان پر ہے یہ قصہ..... تم چھت پر کھڑے ہو کر لاؤڈ اسپیکر پر بھی سچ کہنا شروع کر دو تو تب بھی کوئی یقین نہ کرے گا۔"

"مجھے کسی کا یقین درکار نہیں ابا..... !بس آپ..... یقین کر لیجیے۔"

"میرا یقین کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

"میرے لیے رکھتا ہے ابا!"

"مگر مجھے دنیا کو یقین دلانا ہے۔"

"ابا! دنیا کچھ نہیں ہے۔" اس کا لہجہ کرچی کرچی ہو گیا اور سب کے دلوں میں کرچیاں کھب گئیں۔

"دنیا ہی سب کچھ ہے۔ میں نہ دیکھوں دوبارہ ایسا شور شرابا۔ فیصلہ وہ ہے جو ہو چکا۔ مجھے اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کو سنبھالنا ہے اور یہ تو شکیل ہے جو فوری دستیاب ہے۔ لوگوں کی باتوں سے اور تمہارے اس جارحانہ انداز پر..... زبان درازی پر مجھے کوئی بھی مل جائے تو میں کل کا بیاہتا آج بیاہ دوں۔ یہ بھی بہرحال ایک موقع بن رہا ہے۔ ماجدہ کے ولیمہ کے روز نکاح کا ارادہ ہے۔ جو کچھ لینا دینا ہے لسٹ بنا لو۔ تمہاری ماں بہنیں لا دیں گی۔"

"میں زبان درازی نہیں کر رہی ابا!" وہ ان کے نکل جانے تک جہاں کی تہاں کھڑی رہی پھر زیر لب بولتے ہوئے ڈھے سی گئی۔

قسم سے میں زبان درازی کب کر رہی ہوں۔

کیا میں نے زبان درازی کی؟؟؟

وہ زور و شور سے رونے لگی تھی۔ اس نے ماں کو شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا تھا جو یوں تھیں جیسے بولنا نہ جانتی ہوں۔ تائی جان کا چہرہ دکھی تھا مگر ایک پرسکون لہر تھی جو وضاحت دیتی تھی۔ ٹھیک ہی ہے جو کیا جا رہا ہے۔ بڑی بہنیں ساکت چہروں کے ساتھ اپنے بچوں پر چیخ چلا رہی تھیں۔

اور ضوفی جو بہت چپ تھی۔



با اعتماد' بے نیاز..... وہ کاسمیٹک کی سب سے بڑی اور بہترین دکان میں کھڑی تھی۔ شدید سردی میں جب کاروبار کسی قدر مندا جا رہا تھا۔ وہ امپورٹڈ گرم لباس جوتوں میں بہت ہلکی پھلکی سی کھڑی تھی۔ سیلز مین اور دکان کے مالک کے جسم میں ویسے ہی گرمی دوڑ گئی تھی۔ آنے والی گاہک رخصت ہوتے وقت جیبوں کو نوٹوں سے بھر کر جانے والی تھی۔ وہ دونوں خندہ پیشانی سے اس کی ہر فرمائش پر آگے بڑھتے تھے۔ کاؤنٹر پر خوشبودار بوتلوں کا ڈھیر جمع ہو چکا تھا۔

اس کا وہی سجا ہاتھ کاؤنٹر پر دھرا تھا۔ ملائم' چمک دار گداز اور وہ بہت نزاکت سے اس پر نیل پالش کے رنگ سجا سجا کر دیکھ رہی تھی۔

سیلز مین اس کا مسترد کیا جانے والا سامان دوبارہ ریکس میں لگا رہا تھا۔ جبکہ مالک اندرونی خانے کھول کھول کر مزید بہترین کی جستجو میں تھا۔

وہ بے حد پرسکون و بے فکر تھی۔ جب اسے اپنی پشت پر نظروں کے شدید ارتکاز کی چبھن محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا تھا۔ وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو اسے گھور رہا ہوتا۔ وہ اپنا وہم جان کر دوبارہ نیل پالش کی جانب متوجہ ہوئی۔ گلابی رنگ نے ہاتھ اور ناخن کی جلد کو ایک کر دیا تھا۔ اس کے لبوں پر پسندیدگی کی مسکان ابھر آئی مگر تب ہی چبھن کا احساس دوبارہ حاوی ہوا۔ اس کا چہرہ تپنے لگا۔ دکان کے اندر موجود دونوں اشخاص قطعاً" متوجہ نہ تھے اور تیسرا کوئی تھا نہیں۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر عمیق نگاہی سے دیکھا تھا کوئی..... نہیں مگر سامنے والے ریک کی دیوار شیشے کی تھی۔ ترتیب سے لگی خوش شکل بوتلیں۔ اور ان کے پیچھے سے جھانکتی دو آنکھیں جو اس کے چہرے پر پلکوں کی جنبش نے بنا تکی تھیں۔

اس کے پورے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔ خوف کی اک لہر نے ریڑھ کی ہڈی کو سرد کر دیا تھا۔ نگاہیں ملنے پر وہ آنکھیں کترائی نہیں تھیں۔ گھبرائی بھی نہیں تھیں۔ بلکہ ان کے اندر ایک جتاتا سا تاثر آگیا تھا۔ اسے لگا وہ آنکھیں اسی مڈبھیڑ کی منتظر تھیں۔ وہی سیاہ جیکٹ اور چھجے والی گرم ٹوپی کان ڈھکے تھے اور جیکٹ کا کالر کھڑا تھا۔ آج ٹھوڑی چھپی ہوئی تھی مگر آنکھیں ..... کیسی تھیں وہ آنکھیں؟ اس کے اندر برق دوڑی۔ وہ سب سامان چھوڑ کر پیچھے لپکی تھی مگر سیلز مین کی آواز وہ پلٹی تھی۔ شیشے میں اب کوئی نہ تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بے فکری سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔



اتنے بہت سارے لوگوں کی موجودگی اور خوشگوار ہلچل بھرے ماحول پر اچانک جیسے سناٹا چھا گیا۔ سب

کام دھندے ہو رہے تھے مگر سوچوں میں گم اترے ہوئے چہرے۔

چاچی جی دو بیٹوں کو بیاہنے والی تھیں۔ ابھی مہینہ بھر سے زیادہ وقت تھا۔ مگر وہ سر شام ہی الٹی پرات کے نیچے تولیہ ٹھونس کر بڑی مشاق سے بجانے لگتیں اور لہک لہک کر گاتیں۔

لڑکے والوں کی طرف سے گائے جانے والے گانے یوں بھی ایک استحقاقی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں۔ دھونس بھرے، خود کو اعلیٰ وارفع بتاتے ہوئے، حق جتاتے ہوئے مگر تاباں کو وہ استہزاء لگتے، دھمکی لگتے۔ اسے اپنا وجود حقیر لگتا۔

وہ سب کو خود سے نظریں کتراتے ہوئے دیکھتی۔ ظاہر ہے کسی کے پاس اس کے لیے تسلی و تشفی نہیں تھی۔ شکیل کے جناتی قہقہے پہلے ہی ناگوار لگتے تھے۔ اب جیسے سماعتوں پر عذاب بن کر برستے تھے۔ اور تاباں کو لگتا جیسے نماز کے لیے قبلہ رخ کرلیا جاتا ہے، وہ ہنستے ہوئے اس کی ذات کو مرکز بناتا ہے۔ وہ اس پر ہنستا تھا۔

"تاباں کا مستقل انکار و ناپسندیدگی اور اس پر بے بس جانتے ہوئے بھی رشتہ ہو جانا شکیل کی مردانہ انا کو تسکین دے رہا ہے۔" مائدہ نے کہا تھا۔

"وہ تضحیک کے معنوں میں کیوں نہیں لیتا؟" نازاں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ جیت رہا ہے۔ فاتح..... عام حالات میں اسے شاید تاباں مجاہد نہ ملتی جواب مل رہی ہے اور جیت لینے کے بعد بھی وہ کچوکے لگائے گا۔ جیت کے اس جام کو ہر بار لبریز کرکے منہ سے لگائے گا۔ ہاری عورت مرد کی انا کو جتنی تسکین دیتی ہے۔ وہ کسی اور میں کہاں....." افشاں کے جملے نے سب کو چونکایا تھا۔ مستقبل کی دھندلی تصویر واضح ہو گئی جیسے۔

پورے دن میں ایک دو بار چند جملوں میں اسی طرح کے تبصرے کیے جاتے یا امی کی ترحم آمیز، بے بس نگاہیں، بہنوں کے ہوکے، ابا کی بے نیازی یا پھر اسے دیکھتے تو چہرے پر اک تنی ہوئی غصیلی کیفیت چھا جاتی۔

تایا ابا نگاہیں چرالیتے یا پھر انہیں جیسے کسی بھی شے سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن نہیں... انہیں صرف تاباں کے حوالے سے بے غرضی تھی۔

تائی امی جن کی وہ لاڈلی رہی تھی۔ انہیں بھی اپنی دو بیٹیوں کے بیاہ کی خوب فکر تھی۔ سو تاباں مجاہد کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ درست ہے اور بس خاموشی سے ہونے دیا جائے۔

تاباں نے ضوفی کی خاموشی کو بری طرح محسوس کیا تھا۔ جب سب مگن و مطمئن ہیں تو وہ کس سناٹے کی کیفیت میں ہے۔ اس کے حق میں بھی نہ بولی بلکہ اس سے بھی نہ بولی۔ ایسا لگتا جیسے کسی ادھیڑبن میں ہو۔

"تم نے کیوں چپ شاہ کا روپ دھار لیا۔" تاباں نے ضوفی کو جالیا۔ "کچھ نہ سہی پرسہ ہی دے دو۔"

ضوفی نے اپنی نگاہیں تاباں کے چہرے پر ٹکادیں۔ تاباں کی آنکھیں تپتی تھیں۔ وہ ذرا سا اشارہ ملنے پر دھاڑیں مار مار کے رونا چاہتی ہے۔ کالے دھوئیں کو چمنی درکار تھی۔

ایک امی تھیں جو اسے سن کر رو پڑتی تھیں۔ تاباں کو چپ ہونا پڑتا۔

دوسری ضوفشاں تھی۔ جو اسے سن سکتی تھی مگر وہ نجانے کہاں گم تھی۔

"پرسہ۔" ضوفی نے زیر لب دہرایا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا اتنا طویل پل آن رکا کہ دونوں جیسے ایک دوسرے کی موجودگی کو فراموش کر گئیں۔

"پرسہ دوں یا پرزہ.....؟" ضوفی کی آواز کنوئیں سے برآمد ہوئی تھی۔

تاباں چونکی۔ "پرزہ..... کیسا پرزہ.....؟"

"کاغذ کا پرزہ..... کبھی ایسے امتحان میں پڑی نہیں..... میں اچھی رازدار ہوں کہ نہیں۔ میں نے کبھی اس پہلو پر سوچا نہیں۔ لیکن..... میں پیٹ کی ہلکی بھی نہیں ہوں۔" وہ ناقابل فہم سے جملے کہتی کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی کتابوں کے ریک میں سے بہت موٹی کتابوں کی نچلی تہہ میں سے بصد احتیاط کچھ نکال رہی تھی۔

اس نے اپنی بند مٹھی تاباں کے سامنے کردی۔ تاباں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر بند مٹھی کو..... اس کے چہرے پر حیرانگی پھر گئی تھی۔ اس نے اپنی ہتھیلی پھیلائی تو ضوفی نے اپنی مٹھی اس پر خالی کردی۔

تعویذ کی طرح تہہ شدہ کاغذ..... جو دو روپے کے سکے جتنی جسامت رکھتا تھا۔ دراصل بازار جاتے وقت ضوفشاں مجاہد بنا کہے نئے گروپ لیڈر ہو جایا کرتی تھی۔ وہ سب بڑھ چڑھ کر حجت کرتیں۔ مگر فیصلے پر مہر وہ ثبت کرتی۔ والٹ اس کے حوالے ہوتا۔ پیسوں کے معاملے وہ سب کی سب نکمیاں تھیں اور اس دن تھک ہار کے وہ سب سموسے کھانے بیٹھیں اور خوب پیٹ پوجا کرکے جب نئے عزم سے بازار میں دوبارہ گھسنے کے لیے بھاگیں۔ تب کاؤنٹر پر پے منٹ کرتی ضوفی ان سب کو گھور کر رہ گئی۔ ہزار کے نوٹ کا بقایا دس دس روپے کے میلے کچیلے ڈھیروں نوٹ تھے۔ اور نوٹوں کی تہیں کھول کھول کر جماتے ہوئے یہ تعویذ نما پرچی..... اسے حیران کر گئی۔

"اوہ بی بی! آپ یقین کرلیں جی۔ میں نے پورے ہی پیسے دیے ہیں۔ ہر ایک تو ہزار کا نوٹ لاتا ہے۔ بھلے چھی ایک کوک کی بوتل ہو۔" ویٹر اسے دیکھ کے بولا تھا۔

"اب میں کہاں سے لاؤں اتنے کھلے، اب شکران صاحب کا جنہوں نے مجھے پانچ ہزار کے دس بیس اور سو کے نوٹ دے دیے۔ ورنہ تنگ کر آکے بیٹھ جاتے۔ بڑے نوٹ اچھے لگتے ہیں مگر جناب کاروبار کرنے کے لیے چھوٹے بڑے سب ضروری ہوتے ہیں۔" اس نے گہری بات کی۔

ہونٹ بھینچ کر صبر و ضبط سے سنتی ضوفی کے لبوں پر مسکان آگئی۔ وہ اس کے چپ ہونے کی منتظر تھی۔

اور وہ تعویذ نما پرچی..... تب ہی غیر ارادی طور اس نے ویٹر کی نگاہوں کے تعاقب میں ہوٹل کے اوپر بنے کیبن پر سرسری نگاہ ڈالی تھی اور پھر ہفت آسمان اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ زمین اس کی ہتھیلی پر دھری تھی اس نے جیسے ہتھیلی پلٹائی آسمان نیچے، زمین

اوپر..... سب تہس نہس برباد خاتمہ.....

وہاں جاذب سلطان تھا۔ اپنی کافی کے مگ میں چمچ گھماتا۔ کافی سے اٹھتا دھواں اس کے خوبرو چہرے پر مرغولے بنا رہا تھا۔ ضوفی پر انکشاف کے در وا ہوئے اس نے میلے نوٹوں کے ڈھیر کو دیکھا تھا اور اس تعویذ کو۔ ایسا تعویذ جو کالے جادو کے کڑے وار کی طرح زندگیوں کو برباد کردینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

ضوفی نے اس تعویذ کو دیکھا اور پھر جاذب سلطان کو جس کے چہرے پر طمانیت سی تھی۔ ضوفی کے سوچ سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی ورنہ وہ اس تعویذ کے پرزے پرزے کردیتی۔ مگر۔

"اب آبھی جاؤ ضوفی.....!" باقی سب یک آواز ہو کر چلائی تھیں۔



"معذرت نہیں کروں گا کہ وہ سب محبت تھی۔ غلطی نہیں کہ میں شرمندہ ہو جاؤں ہاں مگر..... اس تکلیف کے لیے جو تم جھیل رہی ہو..... وہ سزا جو تمہیں دی جارہی ہے۔ اس کے لیے میں خود کو خطاوار پاتا ہوں۔

اور ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ جو تم دو..... جو تم چنو۔

لیکن نہیں۔ ہمیں کب ہے اختیار سزا کا..... چننے کا.....

دے رہے ہیں دینے والے۔

مغلظات کا طوفان برساتا وہ شخص..... جب ہنستا تھا تو داڑھ تک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دانتوں کا خلا اسے کتنا بدہیت بنا رہا تھا..... میں اسے بتا سکتا تو..... وہ تمہارے لیے جان لینے آیا تھا۔

اور میں تمہارے لیے جان دینے..... پتا نہیں کس کا درجہ بلند تھا۔

عزت و محبت کے اس کھیل میں تمہاری جان پر بن گئی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی مجھے ایسا رخ دکھائے گی کہ پہلی نگاہ گھائل کرے گی اور حسرت ذلیل

و خوار۔۔۔ عقل و شعور سب موجود ہے۔ مگر قوت فیصلہ اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ تمہیں نہ دیکھنے' نہ سوچنے اور تمہارے در پر دوبارہ نہ جانے کا ارادہ ابھی جزئیات و تفصیل سے دہرا بھی نہیں پاتا کہ دل پلٹ جاتا ہے۔ زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ ارادے بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں۔۔۔ دل و دماغ کی اس جنگ میں۔۔۔ میں دماغ کی شکست کو ہر پل جھیلتا ہوں۔

محبت کی داستانوں میں وہی داستان امر ہوتی ہے۔ جس میں جدائی ہو اور مجھے امر ہونے کا شوق بھی نہیں رہا۔

تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو تاباں مجاہد اور بالکل حق پر ہو اگر یہ سمجھو کہ میں کوئی سڑک چھاپ ہوں اور لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہوں تو تم مجھے کوس سکتی ہو' بد دعائیں دے سکتی ہو (تو بھر دو۔۔۔ کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔ لیکن نہیں یہ قائمی ہوش و حواس تو تمہیں بھولنا ناممکن ہے۔ تم کہو کہ میں ہوش و خرد کھو دوں تو۔۔۔ بات ہے)

میں ایسا ویسا کبھی نہیں تھا نہ ہوں۔۔۔ یقین کرو مگر میں نے تمہیں کہا تھا ناں۔ تم با اختیار ہو اگر مجھے سزا دینا چاہتی ہو تو میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں مگر انصاف پر آؤ۔۔۔ میں تو سیدھے راستے سے تمہارے گھر تک آیا تھا اور کئی بار آیا تھا۔ میری پسندیدگی محبت میں ڈھل گئی۔ اور محبت ہوس نہ کہلائی جائے تو میں نے ایک شریفانہ' عزت دارانہ طریقہ اپنایا۔ سچ کہو کیا میں نے غلط کیا؟؟؟

پتا نہیں یہ پیام بھی تم تک پہنچا سکوں گا یا نہیں۔

اور پتا ہے میں تمہیں ہر روز ایک نامہ لکھتا ہوں اور دکھ کی شدید ترین بات یہ ہے کہ محبت نامہ اب فقط معذرت نامہ رہ گیا ہے۔

مگر پھر بھی یاد رکھنا۔ معذرت محبت کے لیے نہیں ہے۔

معذرت اس تکلیف کے لیے جو تم جھیل رہی ہو۔

میں اپنی محبت کو غلطی تسلیم کر ہی نہیں سکتا۔"

"تم نے مجھے یہ کیوں دیا ہے ضوفی۔۔۔ بلکہ تم نے اسے لیا ہی کیوں۔" تاباں کی آواز اس کی اپنی آواز لگتی ہی نہ تھی۔

"پتا نہیں۔۔۔" ضوفی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ "وہ پچھلے سارے رقعے جو تم نے مجھے دیے تھے تاباں۔۔۔ وہ میں نے پڑھے تو تھے مگر پھر شدید ترین گھبراہٹ اور اشتعال کے عالم میں انہیں پرزہ پرزہ کر دیا تھا۔ مگر اسے میں نے صبر سے پڑھا۔ یہ۔۔۔ یہ تو اس دنیا کے الفاظ لگتے ہی نہیں اور تمہیں کیوں دیا ہے پتا نہیں۔۔۔ مگر شاید میں نے غلط کیا۔" ضوفی کا کھویا کھویا لہجہ ہشیار سا ہو گیا۔

"لاؤ۔۔۔" اس نے اپنا ہاتھ تیزی سے تاباں کی سمت بڑھایا "لاؤ اسے پھاڑ دوں۔"

ضوفی کا ہاتھ جتنی تیزی سے آگے ہوا تھا۔ تاباں نے اس سے زیادہ تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا۔

اس کی آنکھوں میں ناقابل فہم سی کیفیت آن رکی تھی۔ مگر نہیں۔ اس میں ایک جارحیت اور قطعیت کا ہلکا عکس موجود تھا۔

اور اس سے پہلے کہ ضوفی آنکھ کے بدلے رنگ پر چونکتی۔ جملے نے آسمان اس کے سر پر گرا دیا۔

"نہیں میں تمہیں اسے نہیں دے سکتی۔۔۔ کبھی نہیں۔" وہ مٹھی بھینچ کر سرعت سے اٹھی تھی اور اگلے پل نظروں سے اوجھل تھی۔



پچھلے سارے مکتوب ایک وہم تھے۔ بے یقینی' خیال و گمان کیوں؟ کب؟ اور کیسے؟ جیسے لاتعداد سوالوں نے ان کے اندر کی خوب صورتی کو دل میں اترنے نہیں دیا تھا۔ وہ بس نگاہ کو متاثر کرتے تھے۔ ایک حیرانگی کی صورت' ایک خوف کی شکل مگر تاباں کی ہتھیلی پر پڑا وہ تعویذ اب کسی اجنبی کی ہرزہ سرائی نہیں تھا۔

تعویذوں کے اندر لکھے لفظ اور نقش عموماً" عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ وہ تو بس عقیدت

مندی سے چوم چاٹ کر سنبھال لیتے ہیں۔ اس یقین سے کہ ان میں لکھے لفظ زندگی کو بدل دیں گے۔

مگر اس تعویذ کے اندر لکھے حروف و جملے زندگی کو ..... زندگی کے اس بھیانک روپ کو بدل دینے کے صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا نقطہ نقطہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس تعویذ میں بربادی تھی۔ (اس میں آبادی بھی تھی)

اس میں ایک جانب محبت کا تاج عزت کے ساتھ سر پر رکھا جا رہا تھا۔ تو دوسری طرف ذلت کی دلدل تھی۔ جو نسلوں تک کو اپنے اندر کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

کوئی اس سے ایسی محبت کر رہا تھا۔ جو محبت کم عزت زیادہ لگتی تھی۔

اور اسے اس کے اپنے گھر والے ایسی عزت دے رہے تھے۔ جس میں محبت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جو عزت کے لفافے میں لپٹی ذلت تھی۔

اس نے شکیل کو نہ تو قبولا تھا۔ نہ ہی اس کا ارادہ تھا۔ مگر جب ایک ان دیکھے شخص سے اس کا موازنہ کیا تو ان دیکھا شخص ہر لحاظ سے برتر لگا۔

کتنی عجیب ترین بات تھی کہ اس سارے فساد کو پھیلانے والے کو اسے اپنی زندگی کے حوالے سے اتنا بے بس کر دینے والے شخص سے اسے کوئی گلہ نہ ہوا تھا۔ ایک بار بھی۔

کھڑکی سے باہر کھڑا ایک شخص.....

جو اسے بے حد و بے حساب چاہنے کا دعوے دار تھا۔

سائنس و ٹیکنالوجی کے اس دور میں جو مہکتے جملوں سے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ زمین پر رہتے ہوئے انجان فضاؤں کی باتیں کرتا تھا۔

اس کے دل میں شدید ترین خواہش ابھری کہ کاش وہ پچھلے سارے پیغام جو ضوفی نے پھاڑ دیے تھے۔ اسے مل جائیں تو وہ انہیں نئے سرے سے پڑھے کہ اب وہ کسی اجنبی کے جملے نہ ہوں گے۔ وہ شکل سے بھلے انجان تھی مگر اس کو پہچان گئی تھی۔

اس کے لکھے پیام حرف بہ حرف یاد نہیں تھے۔ مگر اس نے ایک بار لکھا تھا۔

"میں چھپا ہوا نہیں ہوں..... تم کہو تو ابھی سامنے آ جاؤں..... مگر میں چاہتا ہوں تم میرے وجود، قد کاٹھ..... عمر آواز شکل و صورت کے تناظر میں میرے حق فیصلہ کرنے کے بجائے میرے دل کو دیکھو..... جو تمہاری محبت سے سرشار ہے۔"

اس کے دل میں کھدبد لگی تھی۔ جاذب سلطان کو دیکھنے کی۔ مگر دیکھنے سے پہلے وہ اسے جان گئی تھی۔ اسے خواہش ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنی بپتا میں ایسا الجھی کہ فراموش کر گئی۔

تاباں مجاہد کو اپنی پڑی تھی۔

وہ بے قصور تھی۔ مگر قصوروار ٹھہرائی گئی اور پھر سزا بھی سنا دی گئی۔

سب اپنی زندگیوں میں مگن تھے اور اسے دیوار سے لگا دیا گیا تھا۔ وہ ایک پریشر سہ رہی تھی۔

اندرونی پریشر..... جو چاچی جی کے جملوں، آنکھ کے اشاروں میں پنہاں تھا۔ جو گھر والوں کی بے نیازی میں تھا۔

جو زاہدہ بیگم کی آنکھوں میں نمی کی صورت تھا۔

مجاہد تاج کی درشتی اور خشونت آمیز نگاہوں میں تھا۔ اسے دیکھتے ہی ان کی تیوری چڑھ جاتی تھی۔

مشاہد تاج اسے دیکھتے ہی نگاہیں پھیر لیتے تھے۔ یا اٹھ کر چلے جاتے۔

تائی جی نے اس سے ہمیشہ لاڈ کیا تھا۔ اس نے اسی التفات کے سہارے سب کے رویوں کی شکایت لگانے کی کوشش کی تھی بارہا..... مگر ان کے پاس اب جواب نہیں تھے۔ لہٰذا اس کی شکوہ کناں نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ اس سے بچنے لگی تھیں۔ خود کو بے پناہ مصروف ظاہر کرتیں۔

وہ کس کے آگے دل ہلکا کرتی۔ بڑی بہنیں کنی کترا جاتیں۔ موضوع بدل دیتیں۔

(اتنی جلدی سب نے سب کچھ قبول کر لیا تھا۔ اس نے ایسا کیا کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا اسے موردالزام ٹھہرایا جاتا اور سزائے موت سے بھی کڑی سزا، شکیل کی صورت۔)

اور شکیل.....؟..... ؟؟اس کا دیا جانے والا پریشر۔ اس کی نگاہوں کا استحقاق جس میں نرمی نہیں تھی۔ محبت نہیں تھی اور احترام تو بالکل نہیں تھا ایک ایسا حق تھا۔ جو اس کے چہرے کو فق کر دیتا تھا۔

آنکھوں میں اترا حق اب اس کے ہاتھوں میں اتر آیا تھا (جملوں میں تو موجود تھا ہی)

وہ اس کی کلائی.....

اور ریشمی بالوں کی موٹی لٹ.....

اور.....

اور.....

اس پکڑ میں ملائمت گرم جوشی کا فقدان تھا۔ اس میں جارحیت تھی۔ ہتک سی..... تذلیل اور شکیل نے اس روز میسج کیا تھا۔

"بعض باتیں ابا کو نہیں بتائی جا سکتیں اور بعض حرکتیں.....؟؟؟"

وہ منہ توڑ کر ہاتھ میں رکھ دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسے ترت جواب دینے بھی آتے تھے۔ مگر کوئی اسے سنے گا نہیں..... اور یقین بھی نہ کرے گا اس احساس نے اسے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ اب جیسے جنبش بھی محال تھی۔

اور آخری دباؤ وہ تھا جو اسے ضوفشاں کے چہرے کے بدلے رنگ سے پڑتا تھا۔ جب وہ غیر محسوس طریقے سے کھڑکی سے باہر جھانکتی اور پھر اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو جاتا۔

تاباں نے اپنے دل پر ایک نئی کیفیت کو وارد ہوتے محسوس کیا۔

"اگر جو کسی نے اسے دیکھ لیا۔" آگے اس کا دماغ مفلوج ہو جاتا۔

"میرے ساتھ تو جو برا ہونا تھا اور ہونا ہے مزید..... وہ تو ہو گیا۔ طے کر لیا گیا لیکن مجھے تمہاری فکر نے ہولا کر رکھ دیا ہے۔ تم منتقم مزاج نہیں ہو۔ تم نے کہا تھا۔ میں تمہیں پہچانوں اور تمہارے دل کو..... اور میں نے جان لیا۔ تم محبت کے نام پر خوار ہو رہے ہو اور ختم ہو جانا تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس انکشاف نے میرے دل کو دہلا دیا ہے کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو.....

وہ سارے گھر سے کٹ چکی تھی۔ تنہا۔ سوچوں میں گم..... بیزار، خفا، بے سکون اس کی سوچیں دو رویوں کے بیچ گھومتی تھیں مثبت و منفی۔

گھر کے اندر..... اور گھر کے باہر.....

کھڑکی کے باہر کھڑا شخص محبت کا دعوے دار تھا۔ محبت عزت کے ساتھ.....

اپنی جان کی پروا نہ کرنے والا.....

وہ اس کے لیے مرنے آتا تھا ہر روز..... زندگی تب تک تھی ناں جب تک وہ "کسی" کی نظروں میں نہ آتا۔ اگر جو اسے دیکھ لیا جاتا تو..... وہ گھڑی زندگی کی آخری گھڑی بن جاتی اور یہ بات وہ جانتا تھا..... پھر بھی۔

اس لفظ "پھر بھی" نے تاباں کا دل پلٹ دیا۔

یہ سچ تھا کہ اس نے ایک بار بھی کھڑکی سے باہر نہیں دیکھا تھا۔ وہ فقط ضوفی کے چہرے سے اندازہ لگا لیتی کہ باہر کی کیا صورت حال تھی۔

جاذب سلطان کے آخری نامے میں تکلیف و معذرت کی گردان سے اس نے جانا کہ وہ یقیناً "جان گیا ہے کہ تاباں مجاہد کے لیے کیا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس کا سورس آف انفارمیشن یقیناً" آپا تسنیم تھیں۔ وہ مائدہ کی ساس کے ساتھ ایک بار آئی تھیں۔ تب ہی انہیں خبر ملی کہ تاباں کا نکاح کیا جا رہا ہے شکیل کے ساتھ.....

یہ خبر چاچی جی نے انہیں بہت جتا کر، بنا سنوار کر سنائی تھی۔ آپا تسنیم نے بے ساختہ زاہدہ بیگم کے چہرے کو دیکھا تھا۔ ستا چہرہ..... بجھی آنکھیں..... انہوں نے دیورانی کی بات کی تصدیق نہیں کی تھی۔ مگر ان کا پورا وجود ہی تصدیق کرتا تھا۔ فقط زبان نہ بولی تو کیا ہوا۔

موقع دیکھ کر آپا تسنیم نے معذرت کے لیے جب جملے موزوں کیے تب زاہدہ بیگم نے ٹھنڈی سانس

بھری تھی۔

"آپ کیوں معذرت کریں گی۔ وہ سب تو ایک بہانہ بن گیا ورنہ ہمارے ہاں یونہی ہوتا ہے۔ بنا کسی سبب کے ایسے ہی جوڑ جوڑ دیے جاتے ہیں۔ بس خون کا رشتہ ہونا ضروری ہے اور پھر چچا تایا کے بیٹے موجود ہوں تو سگی پھوپھی کو بھی بیٹی نہیں دی جاتی۔ یہاں تو اب احسان بھی چڑھائیں گے، زندگی بھر دبا کر رکھیں گے۔

بس میری تاباں پر نہ نام کا اثر ہوا نہ شکل کا گن کام آیا۔ ٹھنڈا نصیبا لے کر پیدا ہوئی میری بیٹی۔"

"پہلے کبھی کبھار آتا تھا۔ مگر جس دن سے میں نے وہ رقعہ لے لیا۔ اس نے تو ناغہ ڈالنا ہی چھوڑ دیا۔" ضوفی عجب پچھتاوے میں گھر کر بولی تھی۔

"کس گمان میں آجاتا اب..... کیا خوش فہمی ہے اسے۔"

"خوش امیدی بھی تو کہہ سکتی ہو۔" تاباں کا لہجہ کھویا کھویا تھا۔ "بعض لوگ آخری پل تک ہار نہیں مانتے۔"

"یہ پاگل پن ہے صرف..... جو بربادی کے دروازے پر کھڑا ہے۔"

"بربادی اور آبادی میں اب کوئی فرق نہیں رہا۔"

"وہ برباد ہو یا آباد، میری طرف سے جہنم میں جائے۔" ضوفی بھڑکی تھی۔

"بددعا مت دو۔"

"اسے دے رہی ہوں۔ تمہیں نہیں....."

"کیا پتا مجھے ہی لگ رہی ہو۔" وہ اتنا دھیمے بولی تھی کہ ضوفی باوجود کوشش کے سن نہ سکی۔ وہ بہت ہلکے قدموں سے کھڑکی کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"ٹو دی پوائنٹ بات کرتی ہو ضوفی! مدلل..... واضح..... کیا تم ابا کو بتا نہیں سکتیں کہ میں بے قصور ہوں..... اور یہ کہ مجھے اتنی سخت سزا نہ سنائیں۔" وہ کھڑکی کے ساتھ کھڑی تھی اور پردے کے پھولوں پر ہاتھ دھرا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں نے بتایا نہیں ہوگا۔ مگر مجھے لگتا ہے بعض باتیں قسمت سے ہمارے ساتھ ہاتھ پیر کی طرح جوڑ کر اتاری جاتی ہیں۔"

"تم ہی نے ایک بار کہا تھا ضوفی..... قسمت اگر مجسم صورت میں سامنے آجائے تو دیکھنے والے دیکھیں گے، وہ دونوں پیروں سے معذور ہوگی۔ اس کے ہوا میں اٹھے بے حس ہاتھوں کو ایک جانب سے اللہ نے تھام رکھا ہوتا اور دوسری جانب سے اگر بندہ تھام لے تو جدھر جی چاہے لے کر جا سکتا ہے۔ تو کوشش کر لینے کے بعد اگر صبر کیا جائے تو اچھا ہوتا ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو تاباں.....؟" ضوفی کو اپنے جملے یاد تھے۔ اپنی ڈاکٹری کے حوالے سے اس نے یہ جملے کہے تھے کہ وہ سر دھڑ کی بازی لگائے گی، محنت کرے گی اور گھر والوں کو قائل کہ اسے اجازت دے دی جائے۔ ان دو کاموں کے کرنے کے بعد جو ہوگا وہ قسمت ہوگی۔

"یہی کہ....." تاباں نے پردہ سرکایا۔ "قسمت کو بدلا جا سکتا ہے۔"

"تت..... کھڑکی کیوں کھولی تاباں..... پیچھے ہٹو۔" ضوفی کے چونکنے چلانے اور آگے بڑھنے تک پٹ وا ہو چکے تھے۔ تیزی سے اندر آتی ہوا نے اس کے بالوں کو بہت بے ترتیبی سے اڑایا تھا۔ تاباں نے لمبا سانس کھینچ کر ساری زندگی سے اپنا اندر بھر لیا۔ وہ دونوں ہاتھ چہرے کے گرد پھیر کر بالوں کو سنوار رہی تھی۔

"ہٹو تاباں!" ضوفی نے اس کے بازو کو کھینچا تھا۔ تاباں نے ضوفی کو جھٹکا سا دیا وہ بمشکل گرنے سے بچی تھی۔

"تم کیا مجھے اسٹیل مین سمجھتی ہو..... کھڑکی سے باہر کھڑا ایک شخص جو ہار ماننے کو تیار نہیں جو زندگی موت کی پرواہ کیے بنا یہاں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جو سنہری لفظ لکھتا ہے مہکتے جملے..... جیسے میں باغ عدن میں کھڑی ہوں..... اور تم..... تم تو مجھ سے زیادہ عقل مند ہو۔ زمانہ شناس ہو، چہرہ شناس ہو۔ تمہیں پتا نہیں چلا کہ یہ محبت ہے جو اسے موسموں کی پرواہ کیے بنا ادھر لا کر پٹخ دیتی ہے۔ ایسی محبت جو عشق کی حد میں داخل ہو چکی ہے۔

اور عشق ایسا جو زندگی اور موت کے خوف کی حد سے بہت پرے جا چکا ہے اور تم..."

"بکواس بند کرو..... تاباں!" ضوفی آواز دبا کر چیخا تھا اور ہٹو پیچھے کوئی دیکھ لے گا تمہیں..... بل..... بلکہ وہ، وہ تمہیں دیکھ لے گا۔ اس کی خوش امیدی کو سہارا مت دو۔ اسے مایوس ہو جانے دو یہی بہتر ہے سب کے لیے کب تک کھڑا رہے گا اور..... اور ویسے ہی چند دن بعد تو تم نئی زندگی۔"

"کوئی نہیں دیکھے گا۔ میرا ڈر ختم ہو چکا ضوفی!" تاباں نے خود کو جھٹکا دیا تو ضوفی کے ہاتھ جو اس کے شانوں پر ٹکے تھے۔ پہلوؤں میں جا گرے۔

"عزت کا ڈر..... جو میرے گھر والوں ہی نے خراب کر دی۔ موت کا ڈر..... اگر ہوتا..... تو جاذب سلطان یہاں پر روز آکر کھڑا نہ ہوتا۔" اس نے ضوفی کو لاجواب کر دیا۔ "تم سب نے مل کر ہمیں بے خوف کر دیا۔"

"تم کیا کرنے والی ہو تاباں؟" ضوفی نے آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ ضوفی کی سمت گھومی۔ سینے پر دونوں ہاتھ لپیٹ لیے۔

"وہی..... جو میں نے اب تک نہیں کیا تھا اور جو مجھے کر لینا چاہیے تھا۔"

اور ضوفی کا چہرہ اتنا بے رنگ جیسے سرد خانے میں رکھی لاش۔



"ایک سے ایک حسین صورت، حوروں کو شرماتی شکلیں پڑی ہیں۔ کسی کی آنکھیں، کسی کا رنگ، کوئی بولتی ہے تو لگتا ہے جھرنے کا پانی گرتا ہو۔ خدا کی خدائی یاد آتی ہے۔ جو اتنی موہنی صورتیں گھڑتا ہے۔ وہ خود کیسا ہوگا اور تم ایک تصویر کے پیچھے خود کو برباد کرنے پر تلے ہو۔" جاذبہ کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا وہ اپنے اشتعال پر قابو پانے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

"صرف تصویر مت کہیں ماں..... وہ مجسم ہے..... اسی شہر میں۔" اس نے ماں کو بہت اطمینان سے مطلع کیا تھا۔

"اسی شہر میں..... اسی ملک میں..... بلکہ اسی دنیا میں اتنی لڑکیاں ہیں کہ مردوں کی تعداد سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ ایک وقت میں چار ملیں گی۔" جاذبہ نے تیز لہجے میں اس کے انداز میں کہا۔

"ڈھونڈتے وقت تو آپ کو ایک بھی نہیں مل رہی تھی۔" وہ ماں کو چھیڑ رہا تھا۔ جاذبہ نے اس کی صورت دیکھی، وہ معاملے کو جتنی گمبھیرتا سے لیتی تھیں۔ جاذب اتنا ہی بات کو ہوا میں اڑاتا تھا۔ جو وہ طے کر چکا تھا اس نے وہی کرنا تھا۔

"میرے لال!" جاذبہ نے سرعت سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے پیالے میں بھر لیا۔ "کیوں پریشان ہوتے ہو۔ کون کرتا ہے آج کل کے زمانے میں ایسی باتیں اور ایسے اندھے عشق..... تم نے تصویر دیکھ کر اسے پسند کیا۔ پھر سیدھا رستہ اپنایا۔ ٹھیک کیا۔ انہوں نے انکار کیا۔ ہم نے اصرار..... پھر کوشش دوبارہ سہ بارہ..... لیکن وہ چیز تمہارے لیے ہے ہی نہیں۔ لڑکی انوالو ہوتی تو بھی سر دھڑ کی بازی لگانا سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے فرشتے بھی بے خبر ہیں اور تم....."

"وہ جان چکی ہے۔ کوئی بے خبری نہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا؟؟؟"

"اس سوال کو رہنے دیں۔"

"کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہو۔ تمہیں ہم پر ترس نہیں آتا۔"

"اماں! ایسے سوال نہ کریں ناں جن کے میں جواب نہ دے سکوں۔"

"تو جس سوال کا جواب ہی تمہارے پاس نہیں، وہ تمہیں امتحان میں پاس کیسے کروائے گا۔ وہ اگلی بار زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے تو کچھ خاص نہ لگا تھا اس تصویر میں۔ تم کس چیز پر لٹو ہو گئے جاذب؟" جاذبہ نے سر پکڑ لیا۔

"اور بعض لوگ تصویر میں بہت اچھے لگتے ہیں۔ سامنے سے دیکھو تو کچھ بھی نہیں ہوتے۔ تم سے ایسی

بے عقلی کی امید نہیں تھی۔"
"تو آپ سے کس نے کہہ دیا۔ عشق کرنے والے عقل رکھتے ہیں۔ عقل کا عین جب عشق کے عین میں ڈھل جاتا ہے ناں تو بڑے بڑے بینا ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔ میں تو عام آدمی ہوں پھر۔"
"تو یہی تو کہہ رہی ہوں۔ رہو ناں عام آدمی بن کر سیدھے سیدھے گھر بساؤ۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ عشق کی دلدل میں پیر گھساؤ۔"
"اب تو گھسا دیے ماں.....!" وہ بہت دیر سے ماں کے جملوں کو ہلکا لے رہا تھا۔ لاپروائی ظاہر کر رہا تھا۔ پہلی بار بے بسی 'ملال' شکست لہجے میں گھل گئی۔ چہرے پر مایوسی کی ایسی چادر تن گئی کہ جاذبہ لرز لرز گئیں۔
"تجھے تمہاری زندگی عزیز ہے جاذب!"
"اور میری زندگی کو کوئی اور عزیز ہو گیا۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں 'میری محبت کتنی سچی ہے۔ طلب کتنی جان دار..... میں آخری پل تک اپنے عشق کو آزماؤں گا۔ اسے کھڑکی کے پٹ کھولنے ہی ہوں گے۔"
"کون سی کھڑکی؟" جاذبہ نے بھونچکی ہو کر اس کی صورت دیکھی تھی مجال ہے کہ ایک لفظ بھی پلے پڑا ہو۔
"وہ سب جانور تھے جاذب..... میری کوئی نیکی ہو گی جو تمہیں زندہ چھوڑ گئے۔" جاذبہ نے ہار مان لی تھی۔ ان کی آنکھوں کی نمی بے بسی کو بتاتی تھی۔
"امی! وہ" ماں کی جانب گھوما۔ ان کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ ہاتھ کو بہت ہولے سے تھپکتا ہوا انہیں بتا رہا تھا یا شاید خود کو.....
"مجھے مجھ سے زیادہ آپ جانتی ہیں۔ میں کب تھا ایسا..... نہ میں ایسا نہ میرا باپ ایسا کہ لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے گھروں تک پہنچ جائیں۔ آپ کو یاد نہیں میں نے ایک بار آپ سے کہا تھا کہ لڑکیوں کی عزت ہوتی ہے تو کیا لڑکوں کی نہیں ہوتی۔ اپنے اخلاق و کردار کے حوالے سے بہت واضح ذہن تھا میرا اور عمل بھی..... شاید میں بشری تقاضوں سے ناواقف تھا۔ ایک انسان کب کب کس کس طرح ڈگمگا جاتا ہے۔ میں نے کوئی بڑا بول بول دیا ہو گا..... یاد نہیں پر جو بھی ہوا' اچھا یا برا۔ میں تو بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں 'یہ راہ مجھے کس منزل پر لے کر جائے گی۔
ایک بے جان جھلک نے میرا اندر باہر تہس نہس کر دیا۔ مجھے تو اب یہ کھوج بھی لگ گئی کہ میں ایک بار اسے بس روبرو دیکھ لوں۔ بھلے اگلے پل اپنا سارا جنوں ایک پاگل پن دکھائی دینے لگے اور میں خود سے ایسا شرمندہ ہو جاؤں کہ منہ چھپانے کو کوئی جگہ نہ ملے۔
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل کو قرار مل جائے۔ مجھے بس دیکھ لینے دیں کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوتا ہے۔ بس..... ابھی ہوش مندی اور بے خودی کے بیچ ڈول رہا ہوں..... مجھے ایک جانب ہو جانے دیجیے۔"
وہ بہت طویل پیرا بول کر ہانپ گیا تھا۔
"مجھے نہیں سمجھ میں آتیں ایسی باتیں..... میں بس تمہاری زندگی' صحت اور خوشی چاہتی ہوں۔ باقی دنیا....."
"امی.....!" اس نے ان کا جملہ کاٹ دیا "مجھے خود کو آزمانے تو دیجیے۔"
اس کے لہجے کی التجا نے جاذبہ کا دل کاٹ کر رکھ دیا' وہ اس کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

ہمت و جرات کا مظاہرہ اس نے گھر سے نکل کر نہیں دیا تھا۔ ہمت اس کھڑکی کے پٹ کھولنا تھے جب ایک بار اس نے پٹ وا کر دیے تو باقی کے سارے راستے خود بخود آسان ہو گئے۔ کھلتے چلے گئے۔
ساری احتیاط 'خوف' زبان بندی کھڑکی کے بند پٹوں کے پیچھے تھی۔ جب ایک بار وہ کھل گئے تو آنکھیں بھی کھل گئیں۔ گھر کے سامنے کا وہی منظر تھا جو وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی۔ مگر اس میں نیا پن سامنے کھڑا شخص تھا۔

جوش شُدر اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنے کھڑاک کے بعد اتنی ذلت و رسوائی کے بعد۔ مار کٹائی کے بعد جب وہ مایوس ہو کر پلٹنے ہی والا تھا۔ تب سامنے کھڑی وہ حقیقت' اس نے آنکھیں ملی تھیں اور وہ چند قدم آگے بڑھ آیا تھا وہ وہی تھی تصویر والی..... اور حیران کن بات یہ ہوئی کہ وہ تصویر سے کتنی مختلف تھی۔ اس کے دل کے کونے میں یہ بات اول روز سے تھی اگر وہ تصویر کا الٹ نکلی تو.....
سچی بات تو یہی تھی ناں کہ تصویری حسن دیکھ کر ہی مبہوت رہ گیا تھا۔ گھنٹوں اس تصویر کو تکتا تھا (جسے اس نے آپا تسنیم کی نگاہوں سے بچ کر موبائل میں اتار لیا تھا) اور تصویر ہر بار اپنی خوب صورتی کے نئے پہلوؤں سے روشناس کرواتی تھی۔ یہ ضرور سوچتا تھا کہ وہ فقط ظاہری حسن کی جھلک دیکھ کر دنیا کو فراموش کر گیا ہے۔ اگر حقیقت ایسی نہ نکلی تو.....؟
اور وہ خود سے یہ سوال بھی کرتا تھا کہ وہ ظاہری جلوے پر اس طرح فریفتہ ہو گیا؟؟؟ وہ اتنی سطحیت رکھتا تھا۔
نہ کبھی روبرو ملاقات ہوئی۔ نہ آواز سنی نہ لہجہ..... بہت عرصے تک تو نام سے بھی ناآشنائی تھی۔ کردار و اخلاق 'مزاج' اچھائی' برائی تو بہت بعد کا مرحلہ تھا۔
اور جب اسے روبرو دیکھا۔ جو بہت با اعتماد سی سامنے کھڑی تھی۔ جس کی آنکھوں میں فیصلہ کن کیفیت تھی۔ جھجک نہیں تھی دو ٹوک انداز..... نہ گھبراہٹ تھی نہ شرمانا اور خوف تو قطعاً" نہیں تھا۔ وہ فقط جواب کی منتظر تھی۔
"تم مجھے کبھی عملی انسان نہیں لگے۔ ایک ایسا شخص لگے جو خوابوں کی باتیں کرتا ہے 'خیالوں کی دنیا میں رہتا ہے اور جسے لفظ سجانے آتے ہیں۔ ایسے لفظ جو دلوں کو پھیر دیتے ہیں۔ ہاں مگر تم مجھے ثابت قدم لگے ہو۔
زمین سے نیچے کی باتیں کرتے ہو یا آسمان سے اوپر کی..... یہ بتاؤ زمین پر رہنے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟"
وہ بے حد دلنشیں آواز والے جملے سن رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ بس یہ دیکھ رہا تھا کہ تصویر کتنا جھوٹ بولتی تھی اور واقعی تصویر دیکھ کر یوں فدا ہو جانا سراسر بے وقوفی تھی۔ پاگل پن..... وہ تصویر تو فقط جھوٹ تھی۔ غلط فہمی تھی۔
جاذب سلطان دنیا و مافیہا سے بے خبر لبوں کے ہلنے کو دیکھ رہا تھا۔ جو مسلسل ہل رہے تھے اور دھیان کہیں اور تھا۔
اس نے سوچا۔ وہ تصویر دیکھ کر دل ہار گیا تھا۔
اچھا ہوا۔ اس نے پہلے مرحلے پر فقط تصویر دیکھی اگر اسے روبرو دیکھتا تو جان ہار دیتا۔
اس نے خوب صورت' آراستہ' دل موہ لینے والے جملے لکھے تھے اور لفظ لفظ کو سجایا تھا۔ فقط تصور سے ہمکلام ہو کر..... اگر وہ پہلی بار ہی میں یوں بولتی آ جاتی تو..... وہ کیا خاک جملے بناتا..... وہ زندگی بھر کا لکھا پڑھا بھول جاتا۔
وہ صبح بنارس تھی۔
وہ سرما کی دھوپ تھی۔
ہونٹ کلیوں سے مشابہ تھے۔ مگر کس کلی سے.....؟ کوئی پھول مثال دینے کے قابل نہ لگا۔ وہ مکھن سے بنی لگتی تھی۔ جاذب کو گمان ہوا اگر وہ دھوپ میں کھڑی ہوتی تو اب تک پگھل جاتی۔
اسے یاد تھا۔ نیکوکاروں کو حوریں ملیں گی۔ اس نے حوروں کو پانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا مگر اسے اچانک شدید خواہش ہوئی کہ وہ حوروں کو

دیکھے کہ کیا وہ تاباں مجاہد سے بھی زیادہ۔۔۔
آگے وہ سوچ نہیں پاتا تھا۔



ہمت کی ضرورت گھر سے نکلنے کے لیے نہیں تھی ہمت کی ضرورت کھڑکی کھولنے کے لیے تھی۔ جب ایک بار۔۔۔۔
آگے ضوفشاں مجاہد کی سوچ کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔

"تم اس احساس کی خوب صورتی کو ایک بار محسوس تو کرو۔" تاباں نے چٹخارا لینے کے سے انداز میں ہونٹ سکوڑے تھے۔ اس کی آنکھیں خلا میں مرتکز تھیں۔
"کھڑکی سے باہر ایک شخص زندگی اور موت کو داؤ پر لگائے کھڑا ہے۔ بس اپنے دل کے یقین کے سہارے ۔۔۔۔"

"جب ذلت، خواری، بے عزتی اور آخر میں موت ہی مقدر ہے تو میری مرضی کی کیوں نہیں۔۔۔۔ کم از کم دل کو طمانیت تو ہوگی کہ میرے ساتھ جو ہو رہا ہے میں اس کی حق دار ہوں اور سب جائز ہے۔"
تاباں کی سوچ کا دھارا بدلا۔ پھر نظر بدلی۔۔۔ پھر دل ۔۔۔ اس نے اپنا ہر خیال، ہر روز ہر پل۔ آنے والی سوچیں ضوفی سے بانٹی تھیں۔ مگر اپنا عمل سب سے چھپا کر رکھا۔ ضوفی سو بار جنم لے کر بھی یہ شائبہ تک نہ لا سکتی تھی۔ وہ چاروں جانب سے پتھروں کی زد میں تھی۔ اپنے زخم ٹٹولتی۔ انہیں شمار کرتی وہ ان سوالوں کے جواب تلاشنے کی کوشش کرتی جو ہر زبان سے نکلتے تھے۔

★ ★ ★

"تم نے کہا تھا ضوفی! آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے ابا۔۔۔۔" ابا نے اس کے گال پر تھپڑ رسید کیا۔
"تاباں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ابا۔۔۔۔" "تم نے یہ دعوا بھی کیا تھا۔" اس بار ان کی انگلیوں نے دوسرے گال کو داغ دار کیا تھا۔
"ابا! میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ ابا! وہ اس وقت تک کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ۔۔۔۔" ضوفی صفائی دینا چاہتی تھی۔ اپنی بھی اور تاباں کی بھی۔۔۔ مگر تاباں شاید اب صفائی کے عمل سے بہت دور جا چکی تھی۔ اسے نہیں تھی ضرورت کہ اس کی پوزیشن کو صاف کیا جائے۔ وہ اپنی پوزیشن بدل چکی تھی۔ مگر ضوفی اپنی صفائی کسے دیتی۔ اس صورت میں تھا وہ اپنے آپ کو جب کوئی بھی آپ کو سننے کو تیار نہ ہو۔
"پھر جب وہ جان گئی تب۔۔۔ تم نے کیسے ہضم کیا۔" یہ مشاہد تایا کی آواز تھی۔ "اسے سمجھایا کیوں نہیں، کسی کو بتایا کیوں نہیں کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔"
"جبکہ تم ایک کمرہ، ایک بستر، ایک رستہ استعمال کرتی تھیں۔" مجاہد تاج نے بھائی کا جملہ مکمل ہوتے ہی اپنا سوال جڑ دیا۔
"میں جھوٹ نہیں بولتی ابا۔۔۔" وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ "میں کبھی جھوٹ نہیں۔"
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ابا کی انگلیوں کے نشان کے اوپر اب ساجد چاچا کی انگلیاں ثبت ہو چکی تھیں۔ دونوں نشان ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے چہرے پر گال تو جیسے رہا نہیں۔ سرخ نیلا سوجا۔
"اتنی اونچی آواز۔۔۔" ساجد چاچا کی آنکھیں حد سے زیادہ ابلی ہوئی تھیں۔ وہ بے حد ڈراؤنے دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا۔ جب تائی جی نے درمیان میں آکر انہیں باز رکھا۔ ضوفی نے اس مہلت کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تیزی سے گھومی اور مجرموں کی طرح بیٹھی ایک تار سے آنسو بہاتی زاہدہ بیگم سے لپٹ گئی۔
ضوفی کی خواہش تھی کہ ماں اسے سمیٹ لے گی۔ مگر وہ اسی طرح ٹس سے مس بیٹھی رہیں۔ ان کا چہرہ اس ملزم کا سا تھا۔ جو دشمن ملک کی سرحدوں کی حدود میں پکڑا جاتا ہے۔ اسے چار اطراف سے نگہبان گن تھامے گھیر لیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے انجان زبان میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں اور زمین پر بیٹھا ملزم گھوم گھوم کر سب کی صورتیں تکتا ہے کہ کیا پوچھ رہے ہیں اور وہ کیا جواب دے۔

"امی!" ضوفی یوں تڑپی جیسے کسی نے جسم سے جان کھینچنی شروع کردی ہو۔
"امی!" اس نے ماں کی ٹھوڑی اپنی سمت گھمانے کی سعی کی۔ "آپ جانتی ہیں میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی بھی..... جو جو سچ تھا میں نے حرف بہ حرف بتادیا۔ کچھ نہیں چھپایا۔"
اس نے آخری رقعے والی بات چھپالی تھی۔ مگر ایک لوہار والا نتیجہ تو وہ آخری رقعہ ہی بنا جو ضوفی نے نجانے کس سوچ کے تحت تاباں کے آگے رکھ دیا تھا۔ وہ کبھی تاباں سے اس انتہائی اقدام کی امید نہ رکھتی تھی۔ کوئی صورت ہی نہیں تھی کوئی راستہ بھی نہیں ..... لیکن
"میں جھوٹ نہیں بولتی ابا..... ! آپ جانتے ہیں۔" ماں سے مایوس ہو کر وہ تیزی سے باپ کی سمت گھومی تھی۔
"کچھ نہیں جانتا میں..... ماسوائے اس کے کہ میری عزت کا جنازہ تیار کھڑا ہے اور عزت کے اس لاشے کو یوں گھر کی چار دیواری کے اندر رکھ لوں کہ کسی کو کان و کان خبر نہ ہوگی۔ تو بھی خام خیالی ہے۔ عزت لاش کی صورت ہو تو..... پلک جھپکتے ہی وہ تعفن اٹھتا ہے کہ میلوں دور سے لوگ سونگھتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں۔"
بہت اونچی دھاڑ سے شروع ہونے والے جملے آخیر میں مدہم ہوتے چلے گئے۔ ساتھ ہی وہ صوفے پر گر سے گئے۔ سردی کے اس موسم میں بھی ان کے ماتھے پر پسینہ تھا۔
ضوفی اپنی ذلت بھلا بیٹھی اور دہکتے گالوں سے اٹھتی شدید تکلیف بھی..... باپ کے کہے جملے آنکھوں میں ڈرامائی سین بن کر ٹک گئے تھے۔ طعنے مذاق اڑاتے لوگ ..... قہقہے لگاتی دنیا..... ان کی عزتوں کے شملے لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑے تھے۔
"اور..... اور....." مجاہد تاج بپھرے شیر کی طرح اپنی جگہ سے اچھلے تھے۔ وہ بے حد خون خوار تاثرات کے ساتھ ضوفی کے صوفے کی جانب بڑھے تھے۔ ضوفی غیر ارادی طور پیچھے ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ یوں چونکی جیسے اس کے جسم سے بجلی کے ننگے تار جوڑ دیے گئے ہوں۔ یہ زاہدہ کی بے حد گھٹی ہوئی آواز تھی۔ تکلیف ایسی پہنچی تھی کہ آواز گلی سے گزرتے راہ گیروں تک جاتی۔ مگر ضبط کی کوشش میں گھٹ جانے کے باوجود وہ سماعتوں کے لیے دل خراش تھی
سیکنڈز پر محیط اس پل میں جہاں ضوفی چونکی تھی کہ باپ نے اسے نہیں اس کی ماں کو مارا ہے۔
وہ ماں سے یوں لپٹی جیسے انہیں آغوش میں بھر کر چھپا لینا چاہتی ہو۔ اگلے پل اس کی چیخ نے در و بام ہلا دیے۔ تیار مکا جو زاہدہ کے لیے تھا۔ ضوفی کی پسلی اور پیٹ میں لگا تھا۔
وہ تکلیف کی شدت سے دوہری ہوگئی۔ "اوئی امی جی..... ابا..... آآآ..... ہائے" اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام لیا۔ چہرہ تکلیف کی شدت سے بگڑ گیا۔ وہ آٹے کی تھیلی کی طرح صوفے سے پھسل کر زمین بوس ہوگئی۔ پتھر کی طرح ساکت گھر کی سب عورتیں اس کے گرد جمع ہوگئی تھیں۔
گھر کے مردوں نے فرد جرم صرف ضوفی پر عائد نہیں کی تھی۔ کٹہرے میں گھر کی ہر عورت بھی شامل تھی کہ اتنا بڑا قدم اٹھالیا گیا اور کسی کو بھنک نہ پڑی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔
مجاہد تاج کے چہرے پر ایک پل کے لیے زلزلہ آیا تھا۔ بیٹی ان کی وجہ سے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ آواز اس نے داب لی تھی۔ مگر کراہیں..... اگلے ہی پل وہ بار بار کہے جملے کو دہرا رہے تھے۔ اپنی خجالت پر غیض کی چادر تان کر کہہ رہے تھے۔
"ایسی بے خبر ماں! اس (گالی) کو دوسرے دن خبر ہوئی۔ ماں تو ایک آنکھ بند کرکے اور دوسری کھول کے سوتی ہے۔ یہ (گالی) بلڈ پریشر کا بہانہ کرکے گولیاں پھانک کے سوتی رہ گئی۔ چٹکی بھر زہر نہیں ملا تھا کہ خود بھی کھاتی اور اس (گالی) کو بھی چٹا دیتی۔"
زاہدہ ضوفی کو ٹٹول رہی تھیں جو دونوں لب دانتوں میں دابے پسینہ پسینہ ضبط سے بے حال تھی۔ اسے

کہاں لگ گئی تھی کہ پل بھر میں برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی۔
"اسی (گالی) کے ساتھ نکلی ہے۔ تین دن پہلے وہ حرام کا پلا یہیں تھا نہ اب وہ خود ہے نہ اس کے ماں باپ کا پتا ہے۔"
ہانپتا مغلظات کا طوفان بکتا شکیل اندر داخل ہوا تھا۔



مرگ والے گھر کا سناٹا تھا۔ لیکن زندہ رہنے کے سب اعمال حسب معمول تھے۔ کھانا پینا نہانا دھونا لیکن یہ سب یوں تھا۔ جیسے بہت سلو موشن میں کوئی فلم چلادی جائے..... ایک ٹرانس..... ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے..... زبان بندی۔
گھر کے تینوں کرتا دھرتا مشاہد تاج، مجاہد تاج اور ساجد تاج اپنے تینوں چیلوں کے ہمراہ بیرونی کمرے میں براجمان تھے جمیل، شکیل اور عقیل.....
بے بسی کی کوکھ سے غیض کا جنم ہوتا تھا۔ ناکامی سے ہاتھ ملتی ہتھیلیاں گردن دبوچ لینے کی خواہشمند تھیں۔
مجاہد تاج کے بال بری طرح سے اجڑے ہوئے تھے جیسے کسی نے نوچ ڈالے ہوں۔ شکیل جو خبر لایا تھا۔ اس کو سن کر انہوں نے اپنا سر دیوار سے پے در پے مارا تھا۔ جب جمیل و دیگر نے انہیں بمشکل سنبھالتے ہوئے صوفے پر بٹھایا تو بے بسی کے شدید ترین احساس میں گھر کر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جیسے جڑ سے اکھاڑ لینے کی سی شدت سے نوچے تھے۔
"نکاح تو ہو چکا ہے۔ یہ خبر پکی ہے۔ یہیں ہوا ہے اور جس صبح وہ نکلی ہے اس کے پانچ گھنٹے کے اندر ہوا ہے۔ میں یو سی دفتر سے نکاح کی کاپی دیکھ کر آرہا ہوں۔"
شکیل بہت ٹھہر ٹھہر کر خبر دے رہا تھا۔
"اس کی ماں کا میکہ کراچی میں ہے۔ مگر وہ ادھر نہیں گئے ہیں۔"
"تو کدھر گئے؟" مجاہد تاج حلق کے بل چلائے
"اوئے غضب خدا کا..... اوہ میرے ربا....." چھت کی طرف دیکھ کر انہوں نے شدید عالم بے بسی میں اللہ کو پکارا۔ "میں ادھر سوتا رہ گیا اور بیٹی اپنا نکاح خود پڑھواتی رہی۔ شرطیں لکھواتی رہی۔"
"اس آدمی اس سلطان کے بارے میں ہلکا سا اندازہ ہوا ہے کہ وہ ملک سے باہر گیا ہے تین دن پہلے ..... باقی سب کہاں ہیں ابھی تک..... اور وہ....." ساجد تاج کا لہجہ سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھا۔
مشاہد تاج کے دانت بھینچنے سے ہونے والی کڑکڑاہٹ پورے کمرے میں سنی گئی۔ ضبط کی انتہا۔
یہ سب حرام زادیاں کہتی ہیں کہ انہیں کچھ خبر نہیں ..... شکیل کی آواز گھر کے کونے کونے میں سنی گئی تھی (حرام زادیوں میں گھر کی سب عورتیں چھوٹی بڑی سب شامل تھیں)
سب کی نظریں شکیل پر جم گئیں مگر ان نگاہوں میں ملامت نہیں تھی۔ وہ متفق تھے اس خطاب سے..... بلکہ اگر اس سے بھی بڑھ کر کچھ ہے تو..... ٹھیک ہے۔
"اس نکاح کی اور بعد میں جو بھی کچھ ہوا..... یعنی وہ کہاں گئے۔ کیا کیا اس سب کی خبر کسی کو نہیں۔ اس دن والی ٹھکائی کو بھی بائیک اسنیچنگ کے خانے میں ڈال دیا تھا۔ پولیس کے ریکارڈ میں بھی یہی ہے۔ وہ کاروبار کے لیے دبئی جاتے رہتے ہیں۔ ماں بیٹا بھی ساتھ جاتے ہیں۔"
"تو کیا وہ دبئی میں ہے؟" مشاہد تاج کی آواز میں کپکپاہٹ سی تھی۔ "اتنا آسان تو نہیں ہوتا ملک سے باہر جانا..... سیدھے سیدھے معاملات میں بھی دنوں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ تاباں مجاہد اتنی خود غرض نکلے گی۔ اتنی حسابی کتابی اتنی بڑی منصوبہ ساز..... جو تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ پھر قدم اٹھاتے ہیں جھول سے پاک۔"
شکیل ذرا ڈھیلا پڑا تھا۔ چھ دن کی محنت سے یہ معلومات ملی تھیں۔ لیکن سراغ کوئی نہیں" میں نے

بندے لگائے تو ہیں اب دیکھو لہ۔۔۔'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

ایک ہی بار سارے بم پھوڑ دو۔۔۔ مجھے صرف پکا پتا چاہیے۔ میں نے بندے لگائے تو ہیں' اب دیکھو۔'' مجاہد تاج نے بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

جمیل ان سارے مکالموں کے بیچ کچھ نہیں بولا تھا۔ اس نے بے حد ناگواری سے مجاہد تاج کو دیکھا پھر شکیل کو۔ پھر زبان شکیل ہی نے کھولی۔

''چھ دن کی بات کر رہے ہیں جس طریقے سے ڈھونڈنے کے لیے کہا گیا ہے۔ چھ سال لگ جائیں گے۔ خود ہی تو کہا ہے' سارا کام' ساری تلاش خاموشی سے کرنی ہے۔ اسی رازداری سے اسے گھر واپس لانا ہے۔ رازداری کی شرط نہ ہو۔۔۔ تو شام سے پہلے دونوں کو ادھر لا کر پٹخ دوں۔''

اس کے لہجے میں انتہا تھی۔ سرد مہری' قطعیت' اٹل ارادہ' دانت چبا چبا کر کہتا وہ بے حد خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

''ہاں!'' جمیل نے پہلی بار لب کھولے تھے ''راز داری کا دھیان رکھنا۔ ایک بار سراغ مل جائے تو نکاح ختم ہونے میں منٹ سے کم وقت لگے گا۔'' چٹکی بجا کر منٹ بتایا۔

''نکاح ختم ہو نہ ہو۔۔۔'' شکیل اچھل کر کھڑا ہوا اس نے بلوچی بھاری چپل پہن رکھی تھی۔ اس کی دھمک اعصاب کے لیے کڑا امتحان تھی۔ ارادہ بتاتی تھی۔ موڈ سمجھاتی تھی۔

''منکوحہ ضرور ختم ہو جائے گی اور جس سے نکاح کیا ہے ناں۔۔۔ وہ بھی۔''

☼ ☼ ☼

چونکہ صرف ایک دو بندوں کو اصل حقیقت (وہ بھی جھوٹ سچ کی آمیزش) کر کے بتائی تھی۔ سو تلاش کا کام بے حد سست روی سے آگے بڑھتا تھا۔

مگر کچھ باتیں جو واضح ہو گئیں۔ سلطان حیدر دبئی گئے تھے۔ کراچی نہیں گئے۔ جاذبہ' جاذب اور تاباں نہ تو کراچی تھے نہ دبئی۔۔۔ مگر کہاں؟؟؟

سلطان حیدر کا کاروبار ان کی حاضری و غیر حاضری کا محتاج نہیں تھا۔ بہترین اسٹاف ہر چیز کو مہارت سے چلا رہا تھا۔ گھر بند تھا۔ شکیل نے ایک بندہ مستقل نگاہ رکھنے کے لیے کھڑا کر رکھا تھا۔ مگر ادھر کوئی آمد و رفت نہیں تھی۔ ہر گزرتا پل گھنٹوں پر محیط ہوتا اور گھنٹے صدیوں پر۔۔۔ دن کیسے گزرتا تھا اور رات کیسے کٹتی تھی۔ پل صراط کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ بس اس مشکل سے کچھ ہی زیادہ ہو گا۔

بہت رازداری سے کرتے کرتے بھی بہت سے راز دار واقف حال ہو ہی گئے تھے کہ تاج ہاؤس کی ایک لڑکی گھر سے بھاگ کر نکاح کر چکی تھی اور ہنوز لاپتا تھی۔

ایک مخبر نے جاذب سلطان کو دیکھا تھا اور اس کا پیچھا کیا تھا۔ مگر آدھے راستے میں ہی جاذب کو اس پیچھے کا اندازہ ہو گیا۔ وہ بہت مہارت سے چکمہ دے گیا۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے تاج ہاؤس کے مردوں کے لیے یہ بے حد طمانیت بھری خبر تھی۔ یعنی وہ اسی شہر میں ہے۔ یعنی تاباں مجاہد اسی شہر میں تھی۔

ایک مہینہ اس عالم میں گزرا تھا جیسے کسی نے گھاس کاٹنے والے ٹوکے میں جسم پھنسا دیے ہوں اور رواں رواں کٹ کٹ کر ڈھیری بن کر گرتا ہو۔

جسم پارہ بن چکے تھے اور نجانے کہاں کہاں بکھر گئے تھے۔ ملنے والی اطلاع بے حد پکی تھی۔ پارے کے ٹکڑے آپس میں مدغم ہو کر دوبارہ ایک جسم میں ڈھل گئے اور اچھلنے لگے' گھر سے نکلنے سے لے کر۔۔۔ گھر تک پہنچنے تک۔

☼ ☼ ☼

''یہ جو دھوپ اندر آجاتی ہے نا میں اس کے لیے اس ٹھنڈ کو برداشت کر لیتی ہوں۔''

''ہاں یہ جو دھوپ۔۔۔'' مرد نے درختوں کے پتوں سے پرے چمکتے آفتاب کو دیکھا جس کی کرنیں بیڈ روم کے ہر کونے میں دھڑلے سے گھس کر بیٹھی تھیں۔

''جب تمہارے بالوں پر پڑتی ہے تو لگتا ہے ریشم کے لچھے ہوں۔''

''اس دن تم نے انہیں بھٹے کے سنہرے بالوں سے مشابہ کیا تھا۔'' اس نے یاد دلایا۔

''اونہوں۔۔۔ ٹوکو مت۔۔۔'' اس نے اپنی انگلی اس کے لبوں پر دھیرے سے رکھی۔

''اور جب تمہاری آنکھوں پر پڑتی ہے تو لگتا ہے دو سنہرے نگینے دمک رہے ہوں۔''

''مگر اس دن تو تم دو چراغ کہہ رہے تھے اور اس سے پہلے۔۔۔''

''آں ہاں۔۔۔ بس چپ۔۔۔ مجھے کچھ یاد مت کراؤ۔۔۔ میں کچھ نہیں بھولتا۔''

''اور یہ دھوپ۔۔۔''

''تو کیا یہ ساری کرامت دھوپ کی ہے؟'' سامنے ناز اٹھانے والا ہو تو لہجہ خود بخود لچک جاتا ہے' گردن اکڑ جاتی ہے۔ اس نے نروٹھے پن سے کہا تھا۔

''ارے۔۔۔!'' وہ دلکش ہنسی ہنس دیا۔ ''میں نے تمہیں چاند کی کرامت بھی بتائی تھیں۔''

''زور تو پھر چاند پر ہوا نا۔۔۔ میں تو کہیں بھی نہیں۔'' وہ خفا ہی ہو گئی۔

''تمہیں کب یقین آئے گا کہ تم ہی دراصل ہو۔ میں تو بس تمہیں ان چیزوں میں رنگ کے دیکھتا ہوں یار۔'' اس نے ذرا اسے مناتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

اس کے جملوں نے اس کی انا کو تسکین پہنچائی تھی۔ وہ گردن اکڑا کر باہر دیکھنے لگی۔

گھر کے عین سامنے چوڑا بڑا روڈ تھا پھر درختوں کی قطار اور اس کے پیچھے بہت چھوٹے پاٹ کا کھالا (صاف پانی کا نالہ۔ نہر سے چھوٹا)

''تو پھر یہ طے ہوا کہ تم آج بھی مجھے نیچے چھوڑنے نہیں آؤ گی۔'' بریف کیس اٹھاتے ہوئے وہ بولا۔

''میں ''چھوڑنے'' والے کام میں قطعاً'' دلچسپی نہیں رکھتی۔ آپ جائیے میں آپ کو اوپر سے دیکھ رہی ہوں نا۔ اس طرح آپ مجھے تب تک نظر آتے ہیں جب تک مین روڈ کراس نہ کر جائیں۔'' اس نے سچائی بیان کی اور یہ جواب وہ پہلے سے جانتا تھا۔

وہ ڈرائیو وے میں اسے دیکھتی رہی پھر گیٹ سے نکلتے اس روڈ سے مین روڈ تک جب تک گاڑی نگاہوں میں رہی۔ بلا مبالغہ تین سے چار گھنٹے وہ یہاں کھڑے ہو کر یا پھر بیٹھ کر گزار دیتی تھی۔ سردی ہو یا گرمی۔۔۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔

اسے کھلی کھڑکیاں بھاتی تھیں۔

اسے گردو پیش کے تمام مناظر ازبر تھے

تب ہی اس کی نگاہ پتھر کی بینچ کے قریب کھڑے لڑکے پر پڑی۔ وہ اسے پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔۔۔ ایک بار۔۔۔ نہیں دو بار۔۔۔ بلکہ ایک بار اس نے اسے مین روڈ کے موڑ پر بھی دیکھا تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ وہ اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکی' مگر پھر بھی وہ اسے بہت کم عمر لڑکا لگا تھا۔ وہ فقیر نہیں لگ رہا تھا۔ چہرے کی پہچان مشکل تھی مگر اس کے کھڑے ہونے یا ٹہلنے کے انداز سے ایک رکھ رکھاؤ دکھائی دیتا تھا۔

وہ گندے سندے حلیے میں بھی نہیں تھا۔ رنگ خوب صاف گندمی تھا اور بالوں کی تراش نمایاں تھی۔

وہ چونکی۔ اسے اس بار یقین ہوا کہ وہ اس کے گھر کی جانب دیکھتا ہے۔ وہ لڑکا عین اس کے گھر کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ کہیں یہ وہ لڑکا تو نہیں جو بھیدی ہوتے ہیں۔ آمد و رفت کا حساب لکھ کے مخبری کرتے ہیں اسے یک دم وہم نے گھیرا۔

پھر اس نے دل کی تسلی کے لیے گیٹ پر کھڑے مستعد چوکیدار کو دیکھا جو عادتاً'' ہاتھ گن پر رکھتا تھا۔ ہر دم تیار۔۔۔ ٹھاٹھا۔

اس نے لڑکے کو دیکھا۔ اسے احساس ہوا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بغور ٹھہر کر جیسے جانچ رہا ہو۔ پہچان رہا ہو کچھ جتا رہا ہو۔ پہلی بار دونوں کی نگاہیں ملی تھیں اس سے پہلے کہ وہ اسے اشارہ کرتی یا کچھ اور۔۔۔ وہ پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیدھا چلنے لگا۔

دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔ مین روڈ تک۔

☼ ☼ ☼

☆ ☆ ☆

پکی سڑک ختم ہوتے ہی کچا پکا سا پگڈنڈی نما راستہ دیکھ کر یہ یقین ہوتا تھا کہ راستہ کہیں نہیں جاتا اور آگے یہ ویرانہ مزید ہولناک اور بے آب و گیاہ ہوگا۔

مگر در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ بہت آگے جاکر چھوٹی پکی چار دیواری کے بیچ و بیچ کھڑی وہ دو منزلہ عمارت اندر سے اتنی پُر رونق اور زندگی سے بھرپور تھی کہ کیا رونق اور ہنسی کسی میلے میں ہو۔

آدم و حوا کو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے ساری دنیا دے دی گئی تھی اور ان دونوں کے لیے یہ ویرانہ پوری دنیا بن گیا تھا۔

بڑھاپے کی اولاد کی سیکیورٹی کے لیے سلطان حیدر نے بہت کچھ انویسٹ کیا تھا۔ وہ جو سب کے سامنے تھا' نظر آتا تھا۔ گھر' جائیداد' کاروبار اور کچھ چیزیں وہ تھیں جو سب سے پوشیدہ رکھی گئی تھیں کہ اگر وہ کل کو نہ رہیں۔ اور حالات ایسے ویسے ہوں تب بھی ان کا بیٹا تہی دست نہ ہو۔

سو یہ فارم ہاؤس دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ اس وقت تاباں مجاہد اور جاذب سلطان کی پناہ گاہ تھا۔ ایک خوابوں جیسی جگہ۔

تاباں کے لیے جاذب سلطان کا ہر عمل حیرت تھا۔ حیرت۔۔۔ حیرت اور پھر خوشی۔۔۔

اور اس وقت جب وہ تنہا تھی۔ تب بھی دل کے اندر محفل سا رنگ جما تھا۔ اس نے ابھی گھنٹہ بھر پہلے تو جاذب سلطان کو رخصت کیا تھا۔ وہ اس ویرانے میں تنہا تھی مگر خوف زدہ نہیں تھی' حالانکہ ایک ڈر سائے کی طرح ساتھ تھا۔ مگر جاذب سلطان کا دیا گیا یقین۔۔۔ محبت اور اعتماد۔۔۔ ہر شے پر حاوی تھا۔

"تم بے فکر ہو کر جاؤ۔۔۔ میری فکر نہ کرنا پھر اماں حمیداں اور دوسرے ملازمین بھی تو ہیں ناں۔۔۔!" وہ تسلی دے رہی تھی۔

"اس طرح کے حالات میں۔۔۔ میں تم کو کبھی اکیلا چھوڑ کر نہ جاتا۔ مگر پاپا کا ایکسیڈنٹ اور امی کی پریشانی۔۔۔ میری وہاں اشد ضرورت ہے تاب!"

"مجھے تم پر پورا یقین ہے جاذب! تم بے فکر ہو کر جاؤ۔"

کہتے ہوئے تاباں مجاہد کا چہرہ ایسی روشنی بکھیر رہا تھا کہ جاذب سلطان کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

وہ تصویر میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ نجانے کیا تھی ہر روز نیا روپ دکھاتی۔ حیران کرتی۔ یہ آدم و حوا کی جنت تھی اور غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ ہر بار معافی نہیں مل سکتی۔

اس انتہائی نازک وقت میں جب سلطان حیدر کی بیٹے اور بہو کے ساتھ موجودگی ناگزیر تھی۔ انہیں کچھ کاروباری امور کے سلسلے میں دبئی جانا پڑا۔ وہ اپنا کام بس دو چار روز میں نبٹا دینا چاہتے تھے اور انہوں نے کر بھی لیا لیکن دبئی کی مصروف ترین ہائی وے پر ہونے والا ایکسیڈنٹ تمام جلد بازیوں پر پانی پھیر گیا۔ جاذبہ ان دونوں کے ساتھ تھیں۔ بہت مجبوری میں وہ پیچھے روانہ ہوئیں۔

لیکن وہاں حالات اتنے ہلکے پھلکے نہیں تھے۔ جتنے کہ بتائے جا رہے تھے۔ معمولی ایکسیڈنٹ معمولی نہیں تھا۔ جاذبہ نے روتے ہوئے بتایا کہ سر کی چوٹ نے دماغ کے اندر سوجن پیدا کر دی ہے اور ڈاکٹرز نے ناامیدی ظاہر کی ہے۔

"تمہارے ڈاکومنٹس نہیں ہیں ورنہ تمہیں ساتھ لے کر جاتا۔" جاذب کو قرار نہیں تھا۔

"میں جانتی ہوں جاذب! میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی تو تم۔۔۔"

"بھاگنے کی بات مت کرو۔۔۔ اتنی محبت پاکر لوگ مرنا بھول جاتے ہیں۔ تم کہاں بھاگو گی۔۔۔ بس۔۔۔ میرا اعتبار رکھنا۔۔۔ میں تم کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ دنیا جو مرضی کہتی رہے تاب!۔۔۔ بس اپنا یقین مت ٹوٹنے دینا۔ اور اگر پھر بھی وعدہ خلافی ہو جائے تو سمجھ لینا مر گیا۔ کیونکہ جیتے جی تو۔۔۔"

"پلیز۔۔۔" تاباں نے اسے ٹوک دیا۔

اور آج اس بے فکری کے سہارے وہ اس دھوپ کو انجوائے کر رہی تھی۔

پیلے اور سبز پیراہن میں وہ موسم کا سب سے خوشنما پھول دکھائی دیتی تھی۔ جاذب سلطان نہیں تھا۔ وہ صبح ہی چلا گیا تھا۔ مگر اس کی باتیں لبوں پر مسکان بن کر چمک رہی تھیں۔ وہ محو تھی۔ فارم ہاؤس کے ملازمین کے بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ شور ہاہاکار۔۔۔ جب زیادہ ہو جاتی تھی تو وہ چونک پڑتی اور پھر سنبھل کر اپنے خیالوں میں کھو جاتی۔ اب بھی اپنی چوٹی کے بل کھول رہی تھی۔ جب شور کی زیادتی نے سوچوں کا تسلسل توڑا۔ وہ چونکی۔

بچوں کی گیند شاید احاطے کے اندر آگئی تھی۔ دھڑ دھڑ قدم۔۔۔ ابھی نگران اماں حمیداں چلائیں گی اور بچے انہیں چڑاتے ہوئے بھاگیں گے۔ احاطے سے آتی قدموں کی دھمک اس کے کمرے کے باہر تک آنے لگی۔ گیند اندر تو نہیں آسکتی۔ وہ چونک کر کھڑی ہوئی اور اس سے پہلے کہ دروازہ کھولنے آگے بڑھتی۔ وہ خود بخود دھاڑ کی سی آواز میں کھل گیا۔ اس کی حیران آنکھوں میں خوف اترا اور وہ انتہائی حد تک پھٹ پڑیں۔

سامنے' سامنے۔۔۔ جمیل بھائی تھے اور شکیل اور ساجد چاچا' عقیل اور۔۔۔ ہاہ۔۔۔ اللہ۔۔۔ مجاہد تاج۔

اسے چیخ مارنے تک کی مہلت نہ ملی۔ وہ بس دو قدم پیچھے سرکی تھی۔ اس کی حفاظت پر مامور بندے نہ جانے کہاں تھے۔

جمیل بھائی نے اس کا ہاتھ کھینچا۔

ساجد چاچا کے تھپڑ نے اس کا منہ گھما دیا۔ وہ رکوع کی سی حالت میں جھکی تو چوٹی شکیل کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کا دوپٹا پیروں میں رل گیا۔ شکیل نے اپنا گھٹنا اوپر کی جانب اٹھایا تھا تب تک مجاہد تاج اس کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے بال سر کے عین بیچ میں سے مٹھی میں بھر لیے تھے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی گردن پیچھے ڈھلک گئی تھی اور چہرے پر تابڑ توڑ تھپڑ تھے۔

اس دھما چوکڑی اور چیخوں پر پچھلے آنگن میں مرغیوں کو دانہ ڈالتی اماں حمیداں چونکی تھیں۔ ایک ماہ سے زائد عرصے سے جس خدشے میں سب جی رہے تھے۔ وہ یقینا" عملی روپ دھار چکا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگتی آئی تھیں۔

تب تاباں زمین پر بیٹھی تھی اور شکیل و عقیل اس کے بازو تھامے اسے کھینچ رہے تھے۔ اماں حمیداں نے تاباں کی بغلوں میں پشت سے ہاتھ ڈال کر اسے آگے گھسٹنے سے روکنے کی سعی کی تھی (سعی لاحاصل)

مجاہد تاج اور ساجد تاج کی آنکھوں میں خون اتر آیا جمیل بھائی کے ہاتھ میں پستول تھی۔ جس کے وار سے اماں زمین پر اوندھی گر گئی تھیں۔ ماتھے سے خون کی لکیر بہنے لگی۔ تاباں نے مڑ کر انہیں پکارنا چاہا تھا۔ مگر شکیل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"وہ حرام زادہ نہیں ہے' میں نے سارا گھر دیکھ لیا ہے۔" عقیل نے پھولی سانسوں کے بیچ کہا تھا۔

تاباں بن جل مچھلی کی طرح مچل رہی تھی۔ اماں حمیداں کو پکار رہی تھی اور جاذب کو بھی۔۔۔ مگر منہ سے غوں غاں برآمد ہو رہی تھی۔

کرکٹ کھیلتے بچوں کا میچ ختم ہو گیا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی' مگر سامنے کا منظر دیکھ کر ایسی ہولناک خاموشی چھا گئی کہ سوئی گرے تو آواز آئے وہ پہلے ساکت رہے اور دم بخود دیکھتے رہے پھر جب گاڑی اتنی دور نکل گئی کہ دھول بھی بیٹھ گئی تو وہ سب کے سب ہولے ہولے چلتے سڑک پر آگئے اور اس راستے کو دیکھنے لگے۔ جہاں وہ گاڑی گئی تھی۔

اوندھے منہ گری اماں حمیداں بمشکل ٹیلی فون تک پہنچی تھیں انہیں شہر میں منیجر صاحب کو اس واقعے کی اطلاع دینا تھی۔

نگران کے بولنے سے پہلے منیجر صاحب نے بتایا۔

"حیدر سلطان کوما میں چلے گئے ہیں۔"

کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی اور وہ اپنی عزت کو واپس گھر لے آئے۔ وہ سب فاتحانہ گھر لوٹے تھے۔ اس رات سب کو بہت سکون کی نیند آئی۔

گھسٹنے اور دھکم پیل کے دوران اس کا دوپٹا نجانے کب اور کہاں گرا وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھتی تھی اسے دھکیل کر آگے کیا جا رہا تھا۔

سارے مرد جتھا بنا کر جاتے تھے۔ ہر بار جوش و خروش ہوتا تھا مگر واپسی پر ناکامی کا سارا نزلہ عورتوں پر گرتا۔

گاڑی کی آواز پر سب ہی چونکی تھیں اور تاباں کو دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں داب لی تھیں اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اجڑے بال... کپڑوں کی حالت دگر گوں...

فاتحانہ چمک و زعم سے مردوں نے عورتوں کو دیکھا تھا اور لڑکیوں کو جتایا تھا کہ... دیکھی ہماری کرنی...

اسے دھکے دے کر اوپر والے اندرونی کمرے میں بند کر دیا گیا تھا جو مچل مچل جاتی تھی۔ سارے مرد فتح کے نشے میں چور تھے۔ صبح اٹھے۔ ایک نئی فکر عود کر آئی اور سارا نشہ ہرن کر گئی۔ منصوبہ پہلے مرحلہ پر کامیاب تھا، مگر دوسرے مرحلے میں ایک فاش غلطی نے سامنے آکر دوبارہ زیرو پر پہنچا دیا۔

"آدھا کام کیا تم لوگوں نے... جاذب کا انتظار کرنا تھا۔ واپس وہیں آتا وہ۔ بندوق کی نال لگا تا کنپٹی پر... پکا کاغذ لکھواتے۔" مشاہد تاج کہہ رہے تھے۔

"تو اب لکھوالیں گے، یہ کون سا مشکل کام ہے۔" شکیل و عقیل کا اعتماد عروج پر تھا۔ اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہیے جتنی جلدی وہ کاغذ لکھ کر دیتا اتنی جلدی دوسری جگہ نکاح کرنے میں آسانی ہوتی۔

"طلاق کے بعد عدت بھی تو کرنا ہوگی نا۔" تائی جی گہری سوچ سے ابھری تھیں۔

سب کے سر پر آسمان گرا۔ چہرے اتنے برے طریقے سے بگڑے۔ تائی ہراساں ہو گئیں۔

"میرا مطلب ہے، وہ خوف زدہ سی ہو گئیں۔ "سوا مہینہ کی... شادی... شدہ... زندگی گزار کے... آئی ہے نا تو... عدت تو بنتی ہے شرعاً"۔ "انہوں نے اٹکتے اٹکتے جملے کو تیزی سے پورا کر کے سانسیں بحال کی تھیں۔

"بھابھی جی کا خون تو سیدھی بات کرتے ہوئے خشک ہو رہا ہے۔" چاچی جی کے چہرے پر تلخ استہزائیہ مسکان آن ٹھہری تھی۔ "الٹی بات نہ کسی نے سوچی نہ کسی کے دھیان میں اب تک آئی۔" اتنی گمبھیر صورت حال میں چاچی جی کے چہرے کی مزہ لیتی مسکان اچنبھا تھی سب متوجہ ہوئے تھے تو انہوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کر لیا۔

"پہلے طلاق دلوانے کا مرحلہ... کہ کل کی ہوتی آج ہو... اور آج کی ہوتی ابھی، تب کہیں عدت کے سوا چار ماہ شروع ہوں گے پھر اگلے نکاح کا مرحلہ... میں تو بس دعا کر رہی ہوں، عدت چار ماہ دس دن کی ہی ہو... اگر جو عدت ہو گئی نو ماہ پر محیط... تو...؟"

جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ کر مراقبے میں چلی گئی تھیں۔ اور اس بار زمین پیروں تلے سے کھسکی تھی۔ چاچی جی کے جملے کا مطلب سمجھ میں آیا تو مجاہد تاج بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔

"کیا مطلب؟" بلا ارادہ منہ سے نکلا تھا۔

"مطلب کیا... بات تو وہی بھابھی جی والی... سوا مہینہ کی شادی شدہ زندگی کا نتیجہ۔"

"چپ کرو تم..." ساجد تاج دھچکے سے سنبھلے۔ بیوی کو گھورا۔

"لڑکی اب گھر میں ہے، ہماری دسترس کے اندر... اس لیے میرے نزدیک کوئی مسئلہ مسئلہ ہے ہی نہیں۔"

ساجد تاج نے بے حد پتے کی بات کہی۔ جملے میں ایسا تیقن اور بے فکری تھی کہ سب کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ساکت و جامد دروازے سے لگی زاہدہ کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔

تاباں مجاہد... نام، پہچان سے گئی اب فقط ایک لڑکی رہ گئی تھی۔

"جلد از جلد لڑکے کا پتا کرو، اسے پکڑو۔ طلاق نامے پر سائن کرواؤ پھر آگے کے سارے کام گھر کے ہیں جیسے کرنے ہوں، کریں گے۔"

"ایسے... اس طرح سے... میرا مطلب ہے کہ شرعاً" ایسے زبردستی طلاق ہو جاتی ہے کیا؟" تائی جی نے ہچکچا کر سوال کر دیا تھا۔

"بالکل...!" ساجد تاج نے دانت بھینچے تھے۔ "جب ایسے نکاح ہو جاتے ہیں تو طلاقیں بھی ہو جاتی ہیں کرنے کا منہ ہونا چاہیے بس۔"

یہ وہ لوگ کہہ رہے تھے جو خود کو شریعت کا محافظ سمجھتے تھے۔



کھیل ایک جانب سے ہاتھ میں تھا، مگر دوسری جانب تھی بپھری تاباں جاذب سلطان... تین دن تو وہ کسی حد تک نیم بے ہوشی کے عالم میں رہی تھی، گالوں پر پڑنے والے تھپڑ... بال گویا جڑ سے اکھڑ گئے تھے۔ اس کی کلائیوں پر سخت شکنجے نے نیل ڈال دیے تھے اور اندر ہڈیاں تک دکھتی تھیں۔ شکیل کا اوپر اٹھایا جانے والا گھٹنا پیٹ میں نجانے کہاں لگا تھا پسلی تک میں درد گھس گیا تھا۔

وہ سب گھر والوں سے دور الگ تھلگ کمرے میں تھی۔ بس ناشتہ پانی رکھنے کے لیے تالا کھلتا تھا جو ویسے کا ویسا واپس آ رہا تھا۔

ضوفی اس کے پاس جانے کو بے قرار تھی۔ زاہدہ تڑپ رہی تھیں۔ نازاں، افشاں واپسی کا سن کر ملنے کو بے چین تھیں، مگر عجلت میں اچانک آمد ساس کو ہشیار کر دیتی۔

اسی سانپ سونگھی کیفیت میں اچانک دھڑ دھڑ بجتا دروازہ جو دونوں ہاتھوں سے لگاتار پیٹا جا رہا تھا پھر شاید چیزیں اٹھا اٹھا کر ماری جانے لگیں، ساتھ تاباں کی مسلسل پکاریں "کھولو دروازہ کھولو کھول دو... مجھے جانے دو... مجھے یہاں نہیں رہنا، نکالو مجھے... میں... پنکھے سے لٹک کر جان دے دوں گی۔ نکالو مجھے۔ کھولو دروازہ..." دھڑ دھڑ دھڑ...

وہ کسی جنون کی سی کیفیت میں دروازہ بجاتی تھی۔ اس کے جینے مرنے سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا مگر اس کا شور اگر کسی باہر والے کے کانوں میں پڑ گیا تو سب کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

"چپ کرواؤ اسے..." مجاہد تاج بہت ضبط سے بولتے بولتے بھی چلائے تھے اور ماجدہ جیسے اشارے کی منتظر تھی۔ وہ سرپٹ دوڑی تو دبے قدموں سے سب اس کے پیچھے تھیں۔

تاباں ماجدہ کے بازوؤں میں مچل رہی تھی اور کسی طور قابو میں نہ آتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو، منہ سے جھاگ اور زبان سے مسلسل الفاظ نکل رہے تھے۔ دفعتاً" وہ ٹھٹک کر رک سی گئی۔ اس نے ضوفی کو دیکھا تھا جو بہت کھوجتی مگر سہمی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری نگاہ زاہدہ بیگم پر پڑی جو بے حد خوف زدگی سے اندر جھانک رہی تھیں۔

شور اتنا ہو گیا تھا کہ چاچی جی بھی "کیا ہوا... کیا ہوا" کی گردان کرتی آ گئیں اور پھر چند لمحوں میں سب کے سب اکٹھے ہو گئے۔

اپنی بات کہنے میں تاباں مجاہد کبھی نہیں گھبرائی تھی، مگر اب تو جیسے اسے کسی کا بھی خوف نہیں رہا تھا۔ وہ مسلسل بولے چلی جا رہی تھی۔

گھر کی سب عورتیں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ایک وقت ایسا آ گیا کہ وہ ساجد تاج سے منہ در منہ ہو گئی۔

"یہ تو تایا جی نے کہہ دیا کہ زندہ سلامت گھر لاتا ہے ورنہ وہیں گاڑ دیتا۔" متحمل مزاج جمیل بھائی کے منہ سے انگارہ سا نکلا۔ "لیکن میں اتنی سننے والا نہیں۔ یہ کام اب بھی کر سکتا ہوں۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی اپنی انگلیوں سے جیسے مسل ڈالی۔

"ہاں تو مجھے مار کر خاموش کروایا جا سکتا ہے۔ نفرت ہے مجھے اس گھر کے مردوں سے... سب سے..."

"تو جس (گالی) سے محبت کی ہے، وہ بھگوڑا غائب ہے۔" ساجد چاچا کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ پڑا۔ "مگر کب تک بھاگے گا۔ یہیں سامنے بٹھا کر

طلاق کے کاغذ پر سائن کر دے گا۔"

"نہ تو وہ بھگوڑا ہے اور طلاق کا کاغذ۔۔۔ ہنہ۔۔۔ کسی بھول میں مت رہیے گا۔ وہ کبھی ی ی ی۔۔۔ کبھی ی ی ی۔۔۔ ایسا کوئی کام نہیں کرے گا۔" وہ زور دے کر بولی۔

"مر جائے گا مگر آپ کی خواہش پوری نہیں کرے گا۔ آپ لوگ اسے جانتے ہی نہیں۔" وہ روتے چہرے کے بیچ طنزیہ ہنسی ہنس دی۔

"تو بس پھر اس کی موت کی اطلاع تمہیں عنقریب مل جائے گی۔ تم۔۔۔ ساجد! باہر آؤ۔۔۔" مشاہد تاج کی آواز کی خطرناک سنجیدگی نے سب کو چونکایا ساجد چاچا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ الٹے قدموں باہر کو نکلے تھے۔

"اس کے منہ مت لگو۔۔۔ لڑکی منہ زور ہو چکی ہے اسے اپنی جان کی پرواہ نہیں رہی۔ تو پھر کسی کی عزت کی کیا خاک فکر کرے گی۔ تمہیں۔۔۔ ہمیں جو کرنا ہے وہ ہم طے کر چکے ہیں پھر بحث کے کیا معنی۔۔۔"

"اس نے محبت کا دعوا نہیں کیا تھا۔ اس نے عزت دی جو یہاں پہ۔۔۔" اندر تاباں مسلسل بول رہی تھی۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا، مگر جمیل بھائی نے سن لیا تھا۔ شدید ترین اشتعال میں انہوں نے اپنا الٹا ہاتھ گھمایا تو وہ بیڈ پر گری اور بیڈ کا کونہ ماتھے کے اندر کھب گیا۔ اس نے تڑپ کر اپنا ہاتھ ماتھے پر نکایا تو اگلے پل انگلیوں کی درزوں سے خون رسنے لگا۔

"تاباں۔۔۔" زاہدہ تڑپ کر اس کی جانب بڑھی تھیں۔

تاباں نے خود کو ماں سے چھڑایا تھا۔

"یاد رکھیں۔۔۔ آخری سانس تک یاد رکھیے گا۔ جمیل بھائی۔۔۔! میں بیوہ تو ہو سکتی ہوں مگر مطلقہ کبھی نہیں۔ کسی بھول میں مت رہیے گا۔ آپ اسے جانتے نہیں ہیں، وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔" (ایک ماہ کے ساتھ نے اتنا پختہ یقین کیسے دلوا دیا؟ سب ہی نے ٹھٹک کر سوچا ضرور تھا)

"تاباں۔۔۔!" مجاہد تاج کے لہجے میں کچھ تھا کہ تاباں ٹھٹکی اور یک دم خاموش ہو گئی۔

"اب ایک لفظ اور کہا۔۔۔ تو میں گلا گھونٹ دوں گا۔۔۔ تمہیں مار دوں گا یا خود کو۔۔۔ مجھے ان دونوں میں سے ایک کام فوراً" کر لینا چاہیے تھا مگر شاید میں بزدل ہوں۔۔۔ نہ مر سکا۔۔۔ نہ مار سکا۔ میرے ضبط کی حد نہ آزماؤ۔ مجھے اپنی صدیوں کی کمائی عزت کو بچانا ہے۔"

تاباں نے بے ساختہ سر اٹھایا تھا۔ اس نے بے خوفی سے مجاہد تاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آنکھوں میں آنے والے تاثر عجیب سے تھے۔ طنزیہ، استہزائیہ۔ جتاتے ہوئے۔ مضحکہ اڑاتے ہوئے۔ پھر اس نے "اونہہ!" کہہ کر منہ پھیر لیا تھا۔ مجاہد تاج تیزی سے باہر نکلے۔

☼ ☼ ☼

"جب ایک چیز طے کر لی تھی کہ کھڑے ہاتھوں طلاق دلوانی ہے تو چوک کیوں ہو گئی؟" مشاہد تاج نے ہزار بار کا کہا جملہ دہرایا۔

"ہو گئی غلطی۔۔۔ اتنی بار خواری کاٹی۔ دس جگہ چھاپے مارے مگر ناکامی ہوئی۔ جہاں سے یہ ملی، وہاں تو بس یونہی اندازے سے گئے تھے کہ شاید مل جائے۔ کچی پکی اطلاع تھی، مگر جب اسے دیکھا تو اسے جلد از جلد گھر لانے کی کی تھی۔"

سب خاموش ہو گئے۔ سب اپنی سوچوں میں گم ہو گئے تھے۔ اس معاملے کو جلد از جلد نبٹا دینا سب کے لیے بہتر تھا، مگر کیسے۔۔۔ کدھر تھا جاذب سلطان۔۔۔

"ایسا نہ کریں خلع لے لیں۔ ایک کاغذ ہی تو سائن کروانا ہوگا اس سے۔ وہ میں ایک منٹ میں کروا لوں گا۔"

"بلکہ میں تو کہتا ہوں۔ اغوا کا مقدمہ درج کرواتے ہیں کہ اس نطفہ ناتصدیق نے لڑکی کو اغوا کیا جبراً" نکاح کیا۔ اغوا کا مقدمہ بنے گا۔ زنا بالجبر اور سب سے اہم یہ بھی لکھوائیں گے کہ نکاح پر نکاح کیا گیا ہے۔ ساری شرعی حدیں لگ جائیں گی، زندگی بھر بھگتتا رہے گا سال پہلے کا نکاح نامہ ہمراہ شکیل میں دو دن میں بنوا لاؤں گا۔" گولڈن آئیڈیا جمیل کے دماغ میں آیا تو زبان

سے تڑ تڑ جو ہر پھوٹنے لگے۔

ساجد تاج نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ہمیں بھی آتے ہیں یہ سارے آئیڈیے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مگر اس صورت میں گھر کی بات گھر میں رہے گی؟ اخبار ٹی وی والے جھنڈے پر چڑھا کر لہرا دیں گے۔ دنیا تماشا دیکھے گی۔ قبر بھی منہ چھپانے میں ناکام ہو جائے گی اس سارے معاملے کا اہم ترین پہلو ہے رازداری فقط رازداری۔"

جمیل بری طرح چونکا پھر اوہ کہہ کر سر ہاتھ پر گرا لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اجڑی بکھری عجیب لٹے پٹے دگرگوں حال میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی سسکیاں ماحول کا ارتعاش تھیں تائی جی، ماجدہ، مائدہ۔۔۔ زاہدہ بیگم اور ضوفشاں اسے پلک جھپکائے بنا دیکھتی تھیں۔ ان کی نگاہیں تاثرات کا مجموعہ تھیں جن میں ترحم سب سے نمایاں تھا کبھی غصیلا پن چھلک جاتا حیرت و افسوس۔۔۔

اس کا پیلا لباس بے حد میلا تھا۔ بال بکھرے، آنکھوں پر سوجن تھی ضوفی نے بڑھ کر ماتھے کا زخم ٹٹولنا چاہا تو اس نے سخت درشتی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ اس نے خون آلودہ ہاتھ اپنی قمیص سے رگڑ لیا تھا۔

"یہ تم نے کیا کر لیا تاباں۔۔۔ کیا کر دیا؟" زاہدہ کی آواز نوحہ تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آئیں اور اسے خود سے لگا لیا وہ ٹس سے مس بیٹھی رہی۔

"اللہ نے تندرست و توانا خوب صورت و خوب سیرت اولاد سے نوازا۔۔۔ مگر تم سب سے الگ تھیں تاباں۔۔۔ بیٹے کی خواہش میں بہت شوق سے پوچھا تھا۔ ڈاکٹر بتائیں! لڑکا ہے کہ لڑکی۔۔۔ اس نے کہا لڑکی۔۔۔ میری آنکھ کا پانی بن گئیں تاباں۔۔۔ آخر کے تین مہینے تک چھلک چھلک جاتی تھیں، مگر جب تمہیں دیکھا تو سارے دکھ بھول گئی۔ اتنی چاند جیسی بیٹی پھر تمہارا حسن آنکھ میں آنسو بن کر ٹھہر گیا۔ شکر کے آنسو۔۔۔

حیرانگی کی نمی۔۔۔ ساری اولاد کے لیے ہر پل دعا مانگی مگر تمہارے لیے کچھ الفاظ ہمیشہ علیحدہ ہی رہے میں نے سن رکھا تھا بہت حسین عورت بہت بد قسمت بھی ہوتی ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ تمہارے لیے کی گئی دعائیں پوری نہ ہوئیں۔ دینے والا تمہیں حسن کم دے دیتا۔۔۔ قسمت زیادہ۔۔۔ مگر میں۔۔۔ ہوتی کون ہوں اسے مشورہ دینے والی۔"

وہ اتنا طویل لایعنی سا پیرا بول کر انت میں نڈھال ہو کر رونے لگی تھیں ان کے جملوں نے سب کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا اور تاباں کی آنکھوں کو خشک۔۔۔ وہ بہت عجیب سے انداز میں ماں کو دیکھ رہی تھی۔

"کس نے کہہ دیا۔ آپ کی دعائیں بے اثر ہو گئیں۔ نہیں امی! ساری کی ساری مجھے لگ گئی ہیں آپ نے اسے دیکھا نہیں ہے نا۔ اور میں نے اسے دیکھ بھی لیا اور جان بھی لیا۔ مت کریں شکوہ۔ آپ کو کچھ پتا نہیں کہ وہ کیا ہے۔"

ماں کو ڈپٹ کر دلاسا دیتے ہوئے وہ کسی اور کے تصور میں ڈوبی تو چہرہ اتنا رنگین و شفاف ہو گیا کہ سوا مہینے کا پل پل دکھائی دینے لگا اور یہ منظر سب کے لیے حیران کن تھا ذرا سی تکلیف پر شور مچانے والی ماتھے کے زخم کو ہاتھ سے دبائے بیٹھی تھی ذرا جو پریشان ہو۔ وہ جیسے سانس روکے اسے سن رہی تھیں، دیکھ رہی تھیں، دفعتاً" تائی جی چیل کی طرح اس پر جھپٹیں زاہدہ کو دھکا سا لگا۔ وہ پیچھے گر گئیں۔

"بے شرم! ایک لمحے کو خیال نہ آیا۔ باپ کی عزت پیروں میں رولتے ہوئے اس کے شملے کو راستے پر ڈالتے ہوئے ایک بار بھی کسی کا نہ سوچا۔ ماں، باپ، بہن بھائی، عزیز رشتے دار اس قدم سے۔۔۔" ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ "گھر سے نکلتے سمے ایک بار تیرے قدم نہ کانپے تاباں۔۔۔" انہوں نے اسے دوہتھڑ رسید کیا تھا اور اگلے پل زمین پر بیٹھ کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔

"کیسے کانپتے قدم۔۔۔" وہ حلق کے بل چلائی ساتھ ہی ماتھے سے ٹیس اٹھی تو کراہ کر رہ گئی۔

"میں تو مرنے کے لیے جارہی تھی۔ ہمیشہ کے لیے... میں تو جسم سے پتھر باندھ کر دریا میں کودنے کے لیے نکلی تھی غرق ہونے اور جو اپنی جان پر کھیلنے نکلتے ہیں نہ ان کے قدم کانپتے ہیں نہ دل لرزتے ہیں۔ میرے پاس یہی ایک حل تھا اور میں چاہتی تھی' مرنے کے بعد مجھے اس گھر کا کوئی شخص ہاتھ بھی نہ لگائے۔ میں ان سب کے کندھوں پر چڑھ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ ڈھونڈتے رہیں یہ سب زندگی بھر... قیاس کے گھوڑے دوڑاتے رہیں زندگی بھر .... ایک پل کو سکون میسر نہ ہو' پلک سے پلک بھی نہ جڑے۔"

"اتنی نفرت... تاباں... وجہ؟" مائدہ نے پہلی بار لب کھولے۔

"یہی تو اصل بات ہے مائدہ مشاہد... !کہ سب وجہ پوچھتے لاعلمی ظاہر کرتے جبکہ سب کے سب وجہ تھے۔ وجہ ہیں۔

مرجانے کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اپنی جان دینا آسان نہیں ہوتا تائی جی! اور وہ بھی مجھ جیسی لڑکی جو زندگی سے اتنا پیار کرتی ہو' لیکن وہ زندگی جو اب میرے پاس بچی تھی۔ وہ فقط ذلت تھی بے یقینی اور بدصورتی۔ عدم اعتماد اور شک۔

میں کیا کرتی ایسی زندگی کا... سو بہت اطمینان سے موت کو گلے لگانے چلی تھی۔ گھر سے بھاگنے والیاں زیور کپڑے پر ہاتھ صاف کرکے جاتی ہیں زادراہ کے طور... میں خالی ہاتھ نکلی تھی۔"

اس نے دونوں ہتھیلیاں سیدھی سامنے کردیں۔

"میں نہیں کہتی کہ کھڑکی سے باہر کھڑے اس انجان شخص نے مجھے متوجہ نہیں کیا تھا۔ کیا تھا بہت بار کیا تھا' میں نے اسے ہزار بار اگنور کیا تھا۔ میں کھڑکی سے ایسے دور رہتی تھی جیسے اس میں کرنٹ دوڑتا ہو' وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا تھا۔"

ضوفشاں کا دل بند ہونے لگا' تاباں کے انکشافات نجانے وہ کیا کیا کہنے والی تھی اور باقی سب خواتین ناسمجھی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتی تھیں۔ وہ کھڑکی کے باہر کھڑا ہوتا تھا' مگر کب اور کیسے... اور گھر میں کسی کو خبر نہ ہوئی اور... اور تاباں کو کیسے ہوگئی؟ ان سب کے سر پر بم پھٹا تھا۔

"ایک طرف شکیل ساجد ہو اور دوسری جانب جاذب سلطان تو... لڑکی اندھی بہری گونگی ہو تب بھی... ہوش و حواس سے بے گانہ ہو تب بھی۔ جاذب سلطان ہی کا نام لے۔ مجھے شکیل ساجد نہیں چاہیے تھا تو میں نے جاذب سلطان کی بھی طلب نہیں کی تھی حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اسے وظیفے کرکے' چلے کاٹ کر مانگا جائے یا پھر چھین لیا جائے۔"

وہ ایک بار پھر کھو سی گئی۔ جاذب سلطان کا ذکر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کردیتا تھا اور وہ جیسے کسی اور جہان میں پہنچ جاتی تھی۔

"وہ اتنے خوب صورت لفظ لکھتا تھا کہ وہ الفاظ مجھے کبھی زمین کے لگے ہی نہیں۔

چاچی جی نے کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے "مجھے شکیل ساجد نہیں چاہیے تھا۔" سنا تھا۔ باقی کے لفظ سننے کے لیے ان کے قدم ساکت ہوگئے تھے۔ تاباں کے اگلے جملے نے سب کے پیروں سے زمین کھینچ لی تھی تو وہ رقعے بھی لکھتا تھا۔ یعنی تاباں مجاہد کی اس شخص سے رقعے بازی چل رہی تھی تو پھر تو سب ٹھیک ہوا ایسے ہی تو لڑکا دیوانہ نہیں ہوا نا؟ یعنی...

گمان' اندیشے' بے یقینی شکوک پل بھر کے اندر یقین میں ڈھل گئے۔ وہ بس اپنی ہی کہے جارہی تھی۔

"پھر بھی میں ثابت قدم رہی۔ مجھے اپنی حدود ہمیشہ یاد رہیں۔ اپنی عزت و وقار... اپنا مقام مجھے جیسا میری ماں نے بنایا تھا یا بنانا چاہا تھا میں ویسی ہی تھی۔ مگر پھر میں ویسی ہوگئی جیسا سب گھر والے مجھے مل کر بنا رہے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت آپ سب لوگوں کے لیے نفرت تھی' باہر کھڑے شخص کے لیے اجنبیت... مگر یونہی دھیان پلٹا' خیال آیا... جو سردھڑ کی بازی لگا کر... دماغ کو بھلا کر فقط دل کی باتیں کرتا ہے' جو سب کی نظروں میں ہے مگر خود ایک نظر کا حسرت زدہ... مرنے سے پہلے ایک بار اسے بھی تو آزما کر دیکھ لوں کہ کتنے پانی میں ہے۔

وہ اس برفاب موسم میں ساری رات یہاں گزار کر واپس جارہا تھا۔ ابھی صبح کا اجالا نہیں پھیلا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ وہ ہار کے جارہا تھا اس کے خوب صورت الفاظ بے کار گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا ایک بلاوجہ کی خواری پر شرمسار لگتا تھا سب سے مگر سب سے بڑھ کے خود سے۔ وہ کسی فیصلہ کن کیفیت میں تھا کہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا جب میں اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا۔ "تم محبت کے دعوے دار ہو... عشق کرنے کا کہتے ہو محبت میں مرنے کی بات کرتے ہو۔ یہ بتاؤ محبت میں زندہ رہنے کے لیے کیا کروگے؟"

وہ ایسے مجھے دیکھتا تھا جیسے خواب میں گرفتار ہو اس نے گردن موڑ کر تاج ہاؤس کو دیکھا تھا اور بند کھڑکی کو وہاں کوئی نہیں تھا جس کی لگن میں وہ کھڑکی کو دیکھتا تھا جس کی کھوج میں وہ خوار ہو رہا تھا وہ تو اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"تم زمین پر کیسے آگئیں؟"

"پیروں سے چل کر۔"

"کہاں جانے لگی ہو؟"

"نکلی تو مرنے کے لیے ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ "مگر تمہیں اس لیے پکار لیا کہ تم بہت آسانی سے مرجانے کا دعوا کرتے ہو۔ میں نے سوچا' تمہیں معلوم ہو کہ میں مرنے جارہی ہوں... کیا تم بھی چلوگے؟"

پتا ہے وہ کیا بولا۔ "جب تم سامنے آگئی ہو تو مرنا کیسا... مرنا تمہارے نہ ہونے کی صورت میں تھا جب تم ہو زندگی بھی ہے۔"

اسے یقین نہیں آتا تھا کہ میں سامنے اس کے دوبدو کھڑی ہوں اس سے ہمکلام ہوں۔ وہ بار بار مڑ کر کھڑکی کو دیکھتا تھا۔

"میں... میں تمہیں چھو لوں... مجھے یقین نہیں آرہا۔" اس کی فرمائش میں جھجک تھی اور خوف تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس پر شادی مرگ طاری ہوگئی اس کی آنکھیں جھلملا اٹھی تھیں وہ بولا تو آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آؤگی... میں ایک پل کو بھی بے یقین نہیں ہوا تھا' مگر آج مجھے بس یونہی خیال آیا۔ شاید میں تم پر جبر کی طرح مسلط ہو رہا ہوں۔ مجھے تمہیں فیصلے کے لیے آزاد چھوڑنا چاہیے سو واپسی کے لیے مڑا ہوں اور تم سامنے ہو۔"

میں بے خوفی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"محبت کتنی خوب صورت ہے' میں نہیں جانتی۔ مگر زندگی کتنی خوب صورت ہے۔ مجھے اچھی طرح علم ہے اور زندگی کی اصل خوب صورتی عزت میں ہے۔ اگر وہ ہے تمہارے پاس... تو پھر چلو... اور یاد رکھو میں مرنے کے لیے نکلی ہوں... زندگی عزت کے ساتھ نہ ملی تو عزت کے لیے موت کو اپنا لوں گی۔ مرجاؤں گی... (وہ کھلی بے یقین آنکھوں سے بس مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا وہ مجھے سن نہیں رہا) یا... ماردوں گی۔" (مگر وہ مجھے سن رہا تھا بغور حرف بہ حرف)

"مجھے منظور ہے۔"

اور

وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔

اور محض تین گھنٹے بعد میں تاباں مجاہد سے تاباں جاذب سلطان بن چکی تھی۔ میں نے ان سب سے کہا تھا۔ "واپسی کا راستہ نہیں ہے۔ میں دریا میں کودنے نکلی تھی۔"

"میں تمہیں کبھی ڈوبنے نہ دیتا۔"

"میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ضوفی... پہلی بار اسے سنا تھا۔ اس نے کہا۔ وہ مجھے گھر واپس لے کر جائے گا اور سب کو سمجھائے گا کہ وہ پوری عزت اور دیانت داری سے اس رشتے کو اپنائے گا اور امی... !وہ چھپنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ وہیں اپنے گھر میں رہ کر سب کا سامنا کرنے کو تیار تھا مگر... مگر میں نے اسے مجبور کیا۔ چاچی جی... میں نے اسے بتایا کہ پہلے مجھے موت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا اور پھر... جاذب سلطان کی بیوی بن جانے کے بعد مجھے زندگی کے سوا کچھ چاہیے نہیں

تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہاں سب جنگلی ہیں اور مجھے اس کی جان بہت پیاری ہے۔ وہ میرے مجبور کرنے پر اس ویرانے میں جاکر بیٹھا تھا۔ اور وہ اب بھی چپ نہیں بیٹھے گا۔ بھول ہے سب کی آپ سب۔۔۔" وہ ہاتھ نچانچا کر چاچی جی سے براہ راست ہمکلام تھی۔

"ایسی ماؤں ہی کی بیٹیاں چاند چڑھاتی ہیں کیسے مزے سے عشق و محبت کے قصے سن رہی ہیں۔ بولنے والی زبان پر تو فالج نہ گرا۔۔۔ ان سننے والیوں کے جیسکے کوئی آکر دیکھے۔ نکلو۔۔۔ نکلو ماجدہ ادھر سے۔ کم از کم میری بہو۔۔۔ تو ایسی بے شرمی کے قصوں سے کانوں کو دور رکھے اور بھابھی جی! آپ کو بھی سکتہ ہو گیا ہے۔ ہیر رانجھے کی داستان سن کر۔۔۔ وہ سسی تھی جو زمین میں جاکر دفن ہو گئی عزت پر حرف نہ آیا۔ نکالیں اس مائدہ کو بھی ادھر سے۔ کنواری لڑکیوں پر ویسے ہی ایسے واقعے جلدی اثر ڈالتے ہیں۔ خاندان سے باہر ہی جانا ہے اسے۔ یہ ضوفی البتہ سنے بہن کے تجربات سے سبق سیکھے۔ خیر سے ذہین تو سب سے زیادہ ہے ہی۔"

چاچی کے جملے نمک مرچ کا پانی تھے جو زخموں پر چھڑکا جا رہا تھا۔

"پہلے تھا ہمارا خیال۔۔۔ کہ گھر کی عزت گھر ہی میں ڈھک لیں گے، لیکن میری توبہ۔۔۔"

چاچی جی نے تیزی سے دونوں گال پیٹے پھر کان پکڑے اور آخر میں زمین پر جھک کر دونوں ہاتھ سے فرش چھو کر اپنی ناک پر رگڑ لیے توبہ توبہ۔۔۔

"ایسی بے شرمی۔۔۔ نہ شرمساری نہ خوف۔۔۔ اور ظاہر ہے ہو بھی کیسے۔۔۔ جب سننے والے اتنے شوقین ہوں تو محفل سجا کر داستان سنانے کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔"

چاچی جی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ماجدہ پیچھے تھی۔ زاہدہ کی سسکیاں ایک بار پھر نمایاں تھیں۔

تاباں کے منہ سے سنی اصلیت کو اب چاچی جی نے بیٹوں کے سامنے رکھا اور اس میں اپنی مرضی سے وہ اضافے کیے کہ سن کر دنگ رہا جاتا۔ حیرت منہ کھول دیتی تھی اور غیرت دماغ کو کھولا دیتی تھی۔

"میں تو صاف کہہ آئی 'خود ہی سنبھالیں اس گند کی پوٹ کو۔ مجھے نہیں گھسانی ایسی غلاظت اپنے گھر میں میرے اپنے گھر میں کچے ذہنوں کی چھوٹی بچیاں ہیں جب ان کی اپنی اولاد باپ کی عزت کو نہیں سنبھال سکی تو میری اولاد نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور کوئی تم سے کوئی سوال و جواب کرے نا تو بھی صاف کہہ دینا کہ جی ہمارا کیا تعلق۔ تایا کا الگ گھر اور طریقے۔ اب رشتے داری تو اللہ نے بنا کر بھیج دی ہے۔ اس سے انکار نہیں مگر وہ اپنے عمل کے ذمہ دار اور ہم اپنے۔ اس حوالے سے کوئی رائے نہیں دینا۔ سمجھے اور رات ہی نکالتی ہوں ان سب کو اس خوش فہمی سے کہ میری طرف سے اور میرے بیٹے کی طرف سے سات سلام۔۔۔ ہمیں تو معاف ہی رکھیں۔"

"نہیں اماں!" شکیل کی پرسوچ نگاہوں میں بڑی گہری مسکراہٹ آن رکی۔

"تایا کی عزت کو سنبھالنا میرا ہی فرض بنتا ہے۔ نکاح تو میں ضرور کروں گا اتنی آسانی سے معافی۔۔۔ میرا نام ساتھ لیا گیا تھا۔ ذرا "ساتھ" کا مزہ بھی تو لے نا۔"

بیٹے کے مسکراتے جملوں سے زہر کی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔ چاچی جی نے آنکھیں چندھی کر کے لخت جگر کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہ بخار میں پھنک رہی ہے۔ ڈاک۔۔۔ ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔" زاہدہ نے جتنی دقتوں سے سوچ بچار کے بعد مجاہد تاج سے کہا تھا۔ انہوں نے اتنی ہی تیزی اور برجستگی سے جواب دیا تھا۔

"کیوں! میرے ماتھے پر کہاں لکھا نظر آ گیا کہ میں پاگل ہوں۔"

"جی!" زاہدہ کے خاک پلے نہ پڑا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں تاکہ وہ پھر چکمہ دے جائے۔ دے دو گھر ہی سے کوئی بروفن پیناڈول۔۔۔"

"دی تھی۔ مگر کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔"

"اتر جائے گا اپنی مدت پوری کر کے ہی بخار اترتے ہیں۔"

"وہ تو۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ آج کل۔۔۔ ڈینگی وغیرہ کی وبا بھی ہے تو۔۔۔ کہیں وہ" زاہدہ نے اٹک اٹک کر بمشکل کہا تھا۔

"وبا تو پھر نہ کہو۔۔۔ اگر وہی ہو جاتا ہے تو خس کم جہاں پاک۔۔۔ سارے مسائل پلک جھپکتے حل ہو جائیں گے۔ سب کچھ پہلے کی طرح۔۔۔" مجاہد تاج کے چہرے پر تصور ہی سے سکون پھیل گیا تھا۔ زاہدہ کا دل کسی نے چبا ڈالا۔ وہ ہونٹ کچلتی باہر آئی تھیں۔

ٹھنڈی پٹیاں رکھتی ضوفی نے ماں کے قدموں کی چاپ ہی سے اندازہ لگا لیا کہ کیا جواب لائی ہیں۔ ضوفی نے کچھ نہیں پوچھا مگر وہ روتے ہوئے خود ہی سوال و جواب بتانے لگیں۔ ضوفی ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ پٹی بدلنے لگی۔ سرخ چہرے کے ساتھ بھاپ کا انجن بنی تاباں نے سب سنا تھا اور سمجھا بھی تھا۔ وہ ہوش و بے ہوش میں اب صرف ایک ہی نام لیتی تھی امی۔۔۔ اماں۔۔۔ ہائے اللہ جی۔۔۔ یوں لگتا تھا اسے جاذب سلطان بھول گیا ہے اور باقی سب کچھ بھی۔۔۔ جو کچھ اس عرصے میں اس پر بیتا۔۔۔ اچھا برا سب۔۔۔

اور سب کو بھی یہی لگتا جیسے وہ خالی آنکھوں سے اب خاموش رہتی تھی اور کچھ نہیں بولتی تھی ویسے ہی جس کے بل پر اتنا اچھل رہی تھی وہ بھی اسے بھول چکا ہے وہ ہنوز غائب تھا۔ اس کا غائب ہونا ایک جانب باعث طمانیت تھا تو دوسری طرف غیرت و عزت کے اوپر تازیانہ۔ تاباں کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی جیسے ایک سکون بخش احساس۔

اس کے لیے سخت ترین ہدایت تھی کہ وہ اپنے کمرے کی حدود سے باہر نہ نکلے اور گھر کے مردوں کی نظروں میں تو قطعاً" نہ آئے۔ شروع میں وہ کھانے کے برتن یونہی لوٹا دیتی تھی مگر پاپی پیٹ اپنی طلب کے آگے ساری ضد توڑ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ زاہدہ یا ضوفی جب اس کے لیے ٹرے سجا کر لے کر جاتیں تو باقی دیکھنے والوں کی زبانیں زہر اگلنے لگتیں۔

"ہاں ہاں لے کر جاؤ۔ بی محاذ سے لوٹی ہے۔ ثواب کما کر آئی ہے۔ کرو خدمتیں۔"

مائدہ اور ماجدہ نے اسے دیکھ کر کترانا شروع کر دیا تھا۔ رانیہ سونیا کا تو پکا داخلہ بند ہو چکا تھا۔ مشاہد تایا کے حافظ بیٹوں نے چھٹیوں میں آکر اپنے ہی گھر کے کھانے پینے کو حرام قرار دیا جہاں تاباں ملعونہ رہتی ہے چاچی جی نے سب کچھ تفصیل سے بتایا تھا۔

تاباں ابا اور تایا کی موجودگی میں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ مگر وہ دن کے کسی حصے میں خاموشی سے اپنے لیے چائے بنانے یا روٹی ڈالنے کچن میں آیا کرتی تھی۔ اسے دسترخوان پر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ گھر کا حصہ نہیں رہی تھی جیسے وہ لڑکیوں والے کمرے میں نہیں رہتی تھی۔ اسے گھر کا اندرونی کمرہ دیا گیا تھا جو سب کی نگاہوں کے سامنے تھا اور جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔

وہ اپنے لیے روٹی ڈال رہی تھی جب تائی جی اندر داخل ہوئیں وہ راشد کے لیے روٹی بنانے کی جلدی میں تھیں۔

"میں ڈال دیتی ہوں۔" تاباں نے ان کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"آں۔۔۔ تم۔۔۔ اچھا ڈال دو۔ میں تب تک سلاد بنا دیتی ہوں۔ دوستوں کے ساتھ کہیں جانے کا کہہ رہا ہے۔ سارا سال تو مدرسے میں رہتے ہیں مگر یہاں آکر محلے کی دوستیاں تازہ دم ہو جاتی ہیں۔"

وہ خود کلامی کرتے ہوئے تیزی سے سلاد کا سامان نکال رہی تھیں۔

"امی جی! جلدی کریں پہلے ہی دیر۔۔۔" وہ بولتا ہوا اندر آیا تھا۔

اس نے تاباں کو روٹیاں دسترخوان میں لپیٹتے دیکھا وہ تیزی سے سالن نکال رہی تھی۔ اس نے دونوں چیزیں ٹیبل پر رکھیں۔ پانی کی بوتل۔

"بس بیٹا شروع کر دے۔ یہ سلاد بھی بس تیار ہے تاباں! دو گھونٹ چائے بھی رکھ دے بیٹا!"

تائی جی نے عجلت سے کہا تھا۔ تاباں کچھ کہے بنا

...سالن بین میں پانی ڈالنے گی۔ راشد نے منٹ کے اندر صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس نے مگن ماں کو دیکھا پتی ڈالتی تاباں کو۔۔۔ پھر حیران چہرے کے تاثرات بدلے اور چہرہ غضب ناکی کی تصویر بن گیا۔ اس کے اگلے عمل نے غضب کی شدت کو ثابت کیا تھا۔

"آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اس کے ہاتھ کا چھوا کھانا کھالوں گا۔ اور اس کی ہمت دیکھیے۔ کیسے بے شرم بن کر کھڑی ہے۔ نکالیں اسے باہر۔۔۔ نکلو ادھر سے۔"

وہ جارحانہ عزائم لیے آگے ہوا اور دونوں کے کچھ بھی سمجھنے سے پہلے چنگیر اٹھا کر دے ماری۔ سالن اڑتا ہوا سامنے دیوار سے جا کر چپک گیا۔ گلاس چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ اس کے ہاتھ کی جنبش سے قہوہ دور دیوار پر نقش و نگار بنا گیا۔ گرم کھولتا پانی تاباں کے پیروں پر گرا تھا۔ مگر اسے ہوش نہیں تھا۔

راشد تو اسے باجی کہتا تھا۔ کاشان تو بہت بعد میں آیا تھا' وہ دونوں تایا زاد ہی کو اپنا بھائی کہتی تھی۔ وہ اس کے ذریعے اپنی فرمائش ماں باپ تک پہنچاتا تھا وہ تو۔۔۔ اور۔۔۔

"نکلو ادھر سے۔۔۔" راشد نے اسے ہاتھ سے گھسیٹ کر کچن سے باہر کردیا تھا۔ اس کی روٹی وہیں رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ خواب دیکھتا تھا۔ میں نے تو صرف تعبیر کے لیے راہ ہموار کی۔"

تاباں مجاہد کے لایعنی جملے۔ بے فکری اور عجیب سی مسکراہٹ اس شام کسی کے بھی پلے نہیں پڑے تھے۔

"تو پھر وہ تمہیں اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا۔ یا پھر وہی کہ دور۔ ناقابل دسترس چیز کو حاصل کرلیا تو کشش ختم ہوگئی۔ تم ہو کس نشے میں۔" ماجدہ کو اس کی طمانیت نے کھول دیا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔"

اور یہ یقین سب کو پاگل پن' خام خیالی' خوش فہمی لگا تھا۔ مگر۔ مگر۔

وہ صبح۔ وہ صبح گمان سے پرے تھی۔ خدشات سے بہت دور۔

یہ عدالت کی جانب سے بھیجا جانے والا سمن تھا۔ جاذب سلطان نے کیس فائل کردیا تھا۔

جاذب سلطان کی بیوی کو اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والے اغوا کر کے لے گئے۔ میری والدہ کے سر میں شدید ضرب لگائی تھی جس کے باعث وہ بے ہوش ہوگئیں۔ املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ مشاہد تاج۔ مجاہد تاج۔ ساجد تاج اور تینوں بیٹوں کے نام درج تھے۔ یہ شہر کے سب سے بہترین وکیل کی مدعیت میں درج کیا جانے والا مقدمہ تھا۔ جس میں عائد کیے جانے والے ہر الزام کی قانونی باریکیوں اور نزاکتوں کو پیش نظر رکھ کر جملے ترتیب دیے گئے تھے۔

اغوا' مار کٹائی' حبس بے جا' نکاح' عاقل و بالغ' قانونی' شرعی بیوی جیسے الفاظ کی بھرمار سے سجا وہ ہلکا پھلکا کاغذ۔ ہزار بار پڑھنے کی صورت میں بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خواہ ہاتھ میں لغت لے کر بیٹھ جاتے۔

سو ضروری تھا کہ کسی ایسے بندے سے رابطہ کیا جائے اور ایسا بندہ ایک وکیل ہی ہو سکتا تھا۔ کہاوت ہے ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔

مگر یہاں کسی کو سوجھ نہیں پا رہا تھا کہ چھپانا تو نہیں چاہیے مگر بتانا کیسے چاہیے۔ وہ سب بڑے گھاگ تھے کاروباری۔ زمانہ شناس۔ کاروباری معاملات کے حوالے سے وکیلوں کے منہ دیکھے تھے۔ مگر اس بار۔ ساکت و صامت جہاں کے تہاں رہ گئے تھے۔



دفعتاً" مجاہد تاج تیز ترین قدموں سے گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھے۔ وہ غیض کی تصویر تھے۔ غضب کا نشان۔ ان کے منہ سے مغلظات کا طوفان نکل رہا تھا۔

اور اب تاباں مجاہد۔ مجاہد تاج کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہی تھی۔ اس کے ریشمی بال گدی کی جانب سے ان کے سخت ہاتھوں میں تھے اور وہ اسے پیٹ رہے تھے۔ اس کا گلا گھونٹ دینے والے تھے۔ مگر گھر کی کچھ عورتیں تاباں سے چپک گئیں اور اس کو مجاہد تاج سے دور رکھا۔ مائدہ ماجدہ۔ اور تائی جی مجاہد سے لپٹ چکی تھیں۔

نیچے گیم کھیلتا کاشان بھی اوپر آگیا تھا۔ وہ نیم مردہ تاباں سے بھی لپٹتا تھا اور پھر خیال آنے پر مجاہد تاج کی جانب پلٹتا تھا۔ جو ہذیان بک رہے تھے۔

سب کے سب اس اچانک اشتعال کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ کیا ہو گیا۔

جمیل بھائی نے بہت مختصر الفاظ میں بتایا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ہونٹ سے بہتے خون کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتی تاباں کو ایک الٹے ہاتھ کا جھانپڑ بھی رسید کیا تھا۔ ان کے مختصر الفاظ میں گالیوں کی بہتات تھی۔ تاباں مجاہد کے چہرے پر شادی مرگ سی طاری ہو گئی تھی۔ وہ جیسے سارے ماحول سے کٹ کر صرف جمیل بھائی کے جملوں کو سن رہی تھی۔ جیسے اچانک اندھیرے غار کے منہ پر پڑا پتھر کھسکنے لگے۔ روشنی' ہوا' تازگی اور باقی سب کی دنیا اندھیر ہو گئی۔

تاباں کے چہرے پر آئی مسکان اور آنکھوں کی بے پناہ چمک کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہی۔ بے خوفی اور بے فکری۔ خاتمے کا خیال۔ ہنسی اور خوشی۔ طمانیت کی لہریں۔

جمیل بھائی کے پے درپے تھپڑوں نے اسے زمین پر گرادیا۔ خون تھوکنے اور مٹی چاٹنے پر مجبور کردیا۔ کمرے میں قیامت صغریٰ تھی کوئی مجاہد تاج کو سنبھال رہا تھا۔ کوئی ماجدہ کو ٹٹول رہا تھا۔ ایک جانب زاہدہ ہوش و خرد سے بے گانہ پڑی تھیں۔ دھکا لگنے سے وہ دیوار سے جا ٹکرائی تھیں۔ صوفی ان کے گال تھپتھپا رہی تھی۔

تاباں کی پسلیوں میں جمیل کے جوتے کی نوک جیسے دھنس گئی تھی وہ اوندھی پڑی تھی۔ اس کے کولہے اور رانوں پر بھی ٹھوکریں تھیں۔

اب کسی میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ تاباں کو بچاتا یا جمیل کو روک پاتا۔

☼ ☼ ☼

"اس میں اتنی پریشانی والی تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔" وہ ڈرے' جھجکے' نپے تلے ہر لفظ کو بولنے سے پہلے وہ نگاہیں جھکا لیتے تھے۔ یا چرا لیتے تھے۔ وکیل نے ان سب کو بغور دیکھا۔ وہ دن رات ہر طرح کے لوگوں سے ملتا تھا۔ عمر گزاری تھی اس دشت کی سیاہی میں۔

ساجد تاج دو جملے بولتے تھے اور وکیل آگے کی صورت حال خود بتانے لگتا تھا۔ جیسے وہ وہیں موجود تھا۔ جب سب کچھ ہوا۔

"ایک بات آپ کلیئر کرلیں۔ لڑکی اپنی مرضی سے گھر سے نکل کر گئی۔" وہ بہت طمانیت سے اپنی گھومنے والی کرسی پر جھول رہا تھا۔ کہنیاں کرسی کی ہتھیلیوں پر ٹکی تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں ہی کو دیکھتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔

"یا۔ اسے اغوا کر کے زبردستی نکاح کیا گیا۔ دونوں صورتوں میں بات ثابت کرنی پڑے گی۔ اور پردہ پوشی کی فرمائش یا خواہش بے معنی ہے' بے وقوفی ہے۔"

وکیل صاحب نے ایک نظر ان تینوں پر ڈالی۔

"بات اس وقت گھر سے باہر نکل دنیا کی ہو گئی تھی۔ جب لڑکی نے گھر سے باہر قدم نکالے۔ دوسرے یہ ہے کہ جیسا کیس آپ کہیں گے بنا دیا جائے گا۔ سچا اور جھوٹا۔"

"میں چاہتا ہوں اسے ایسا سبق سکھایا جائے کہ رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے۔" شکیل نے جبڑے بھینچ کر ٹیبل پر مکا برسایا تھا۔

"بالکل سکھایا جاسکتا ہے۔" وکیل نے آگے ہو کر کہنیاں ٹیبل پر ٹکائیں۔ اس نے شکیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پھر اگلے جملوں سے پہلے سب کو باری باری دیکھا۔

"مگر پھر رہتی دنیا کو یہ بھی یاد رہے گا کہ سبق کیوں سکھایا گیا۔ اور جبکہ آپ سب کی سب سے اہم ترین فرمائش و خواہش یہی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور میں معذرت سے کہوں گا کہ اب ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

"لڑکی کو نابالغ قرار دے دیں۔ اور یہ بھی کہہ دیں کہ نکاح پر نکاح کیا گیا۔ اغوا کر کے زبردستی۔ زنا بالجبر۔ اور۔ اس طرح کے الزامات اگر عائد کیے جائیں۔"

شکیل نے حرف حرف کو سنا تھا مگر سمجھا نہیں تھا۔ وہ تصور کی آنکھ سے جاذب سلطان پر حد شرعی نافذ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ فقط ایسا سوچنے ہی سے دل کو اتنی تسکین مل رہی تھی اگر ہو جائے تو کتنا مزہ آجائے۔

وکیل نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر انداز نشست تبدیل کر لیا۔ وہ اب مزید آرام دہ حالت میں کرسی کی بیک سے سر ٹکائے ہلکا جھولنے لگے تھے۔ ہاتھ لمبا کر کے ٹیبل پر رکھے پین کو گھمانے لگا۔ چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ جس سے شکیل کا سینہ چوڑا ہوا۔

اس کا آئیڈیا وکیل صاحب کو پسند آگیا تھا۔

"بلوغت کے لیے میڈیکل ہو جاتا ہے۔ لڑکی انٹر کے پیپرز دے چکی ہے۔ نکاح پر نکاح کو ثابت بھی کردیں گے۔ تو باقی کی ساری فرمائشیں پوری ہو جائیں گی۔ حدیں بھی لگیں گی۔ شرعی و قانونی سب۔ اس لڑکے کو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

سب کے چہروں پر طمانیت پھیلی۔ ہونہار سپوت وکیل کو صائب مشورے دے رہا تھا۔ بہت خوب۔ ماشاءاللہ۔

"مگر۔" وکیل صاحب نے پین کو زور سے گھمایا اور پھر یکدم چھوڑ دیا۔ پین ذرا سا ناچ کر پھر دھیما ہوتے ہوتے لہرا کر رُک گیا۔

"مگر اس کے بعد یہ سارے واقعات اپنی سچائی کے ساتھ اور جھوٹ سچ کے پلندوں کے ساتھ ہر نیوز چینل کی پٹی کا حصہ بن جائیں گے۔ اخبارات کی شہ سرخی۔ ڈھیر ساری این جی اوز جو ایسے معاملات کی تاک میں رہتی ہیں کہ اپنا کاروبار چمکا سکیں۔ سو کالڈ ویمنز ایشوز کو لے کر فنڈ ریزنگ کرتی ہیں۔ وہ ناکوں چنے چبوا دیں گی۔ بڑے بڑے نیوز چینلز کی اوبی وینز سایہ بن جائے گی۔ دن میں سورج کا سایہ، رات میں بلبوں کے سہارے۔ ایسی بدحالی پڑے گی میاں صاحبزادے کہ باقی کی زندگی میں روشنی سے نفرت کرنے لگیں گے آپ۔"

وکیل صاحب کا بے تاثر لہجہ شکیل کو مخاطب کر کے طنز سے بھرپور ہو گیا۔

وکیل صاحب جملہ مکمل کر کے بالکل خاموش ہو گئے۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وکیل کی منظر کشی نے دل کو دہلا دیا تھا۔

"تم چپ کرو شکیل!" مشاہد تاج ہی سب سے پہلے ہولناک تصور سے ابھرے اور شکیل کو بری طرح سے جھڑکا۔ "اب ایک لفظ نہ بولنا۔"

"وکیل صاحب۔!" وہ بولے۔ "آپ درست فرماتے ہیں۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آئے ہیں سب صورت حال آپ کو بتادی ہے۔ اب آپ بتائیں۔"

"تو پھر آپ کے لیے سب سے آسان جلد نتیجہ دینے والا سب سے بہترین اور آزمودہ مشورہ یہ ہے کہ آپ لڑکی کو منائیں کہ وہ جج کے سامنے آپ کے حق میں بیان دے دے۔"

"یعنی۔" ساجد تاج نے وکیل صاحب کو درمیان ہی میں ٹوک کر اپنا بے تابانہ یعنی۔ ٹھوک دیا۔

"یعنی یہ کہ۔ وہ جج سے کہے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں اپنے والد ہی کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔"

"تو اس سے کیا ہوگا؟" اس بار عجلت کا مظاہرہ مجاہد تاج نے کیا تھا۔

"اس سے یہ ہوگا کہ فیصلہ آپ کے حق میں ہوگا لڑکی آپ کے ہمراہ جائے گی۔ اور لڑکا مجرم ٹھہرے گا، اغوا کا، زبردستی نکاح کا، زنا بالجبر کا۔ بس اہم یہ ہے کہ لڑکی شرمندہ ہو اور آپ کے کہنے پر چلے۔ لڑکی ہی۔"

"وہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اس کی اتنی جرات کہ وہ جج کے سامنے۔" مجاہد تاج نے ٹیبل پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ اس پر پڑی ہر شے جھنجھنا اٹھی۔ وکیل صاحب نے بغور سے مجاہد تاج کو دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ۔" مجاہد تاج کے چہرے پر خجالت پھیلی۔

"میں آپ کے سب مطلب سمجھ رہا ہوں تاج صاحب۔" وکیل صاحب کے چہرے پر ناقابل فہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ کہنا چاہتے ہیں اور کرنا چاہتے ہوں گے کہ۔ زور زبردستی۔ ڈر خوف، دھونس اور تشدد کے ذریعے لڑکی کو اپنی پسند کا بیان دلوانے پر مجبور کریں گے۔"

"لیکن۔" وکیل نے شعوری توقف کیا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ مار کٹائی، تشدد، ڈانٹ پھٹکار، گالم گلوچ۔ یہ سب نہیں چلے گا۔" سب بری طرح چونکے اور منہ کھول کر دیکھنے لگے۔

"صرف اور صرف۔ پیار، محبت، لگاوٹ کا مظاہرہ من پسند بیان دلوائے گا۔ آپ کا تشدد جارحانہ رویہ اسے مزید باغی کر دے گا اور جو رہا ہے بر ہانڈی پھوٹ جائے گی۔ اسے یقین دلائیں کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی اسے وہ سب دیا جائے گا زندگی میں جو وہ چاہتی ہے۔ مگر اس راہ میں کانٹے ہیں اور سراسر بے عزتی۔ اور اس رویے میں سب شامل ہوں گے۔" (شکیل کو بغور دیکھا تھا)

وکیل صاحب نے دستی گھڑی کو دیکھا۔ ضرورت سے زیادہ ٹائم دے دیا گیا تھا۔

"اب اصل صورت حال کچھ یوں ہے کہ۔" وہ فائنل نوٹس دینے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

عدالت میں پیشی کے لیے اتنے دن نہیں تھے۔ مگر دو سرکاری چھٹیوں کے ساتھ اتوار مل گیا۔ اور اگلے روز گیس اور بجلی کی بے حد لوڈ شیڈنگ کے خلاف احتجاج بگڑ کر خطرناک صورت حال اختیار کر گیا کہ پولیس کی مداخلت کے بعد آدھا شہر تین دن کے لیے بالکل ہی بند ہو گیا۔

سو اگلی پیشی تک کے لیے اللہ کی طرف سے جیسے وقت مل گیا۔ تاباں مجاہد کو پچکارنے سمجھانے کے لیے۔

کہاں تو وہ اکیلی بیٹھی زخم چاٹ رہی تھی۔ اور منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہ گئی تھی۔ وہ اسی خون آلود، بدبودار ملگجے لباس میں تھی۔ سسکتی، تڑپتی، دم توڑتی۔ اور اب ضوفی نے مرہم پٹی بھی کر دی اور سنکائی بھی۔ اس کے پپڑی زدہ ہونٹوں سے آہ بھی نہ نکلتی تھی۔ ماجدہ بمشکل سوپ کا چمچ ہونٹوں سے لگا پاتی۔ گھونٹ گھونٹ زندگی۔ بہت چاہ سے خریدا جانے والا موٹے بٹنوں والا اوپن شرٹ سوٹ۔ زاہدہ نے جیسے اسے خود ہی نہلایا ہو۔ اس کے جسم میں ذرہ بھر بھی سکت نہیں تھی۔

بہت عرصے بعد تائی جی نے اس سے پہلے کی طرح لاڈ کیا۔ وہ ہمیشہ ان کی گود میں سر رکھ کر زبردستی لاڈ اٹھوایا کرتی تھی۔ وہ لاکھ چیختیں۔ ارے میری بوڑھی ہڈیوں میں گودی لینے کا دم نہیں۔ ارے من بھر کا تربوز (سر) ناتواں ٹانگوں پر رکھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اب اسے خود ہی لے کر کانوں میں کچھ نہ کچھ پھونکتی رہتیں۔

"صحرا میں بھٹک جانے والے کی چھاگل میں جو دو گھونٹ پانی ہوتا ہے نا۔ اگر ریت پر جا گرے تو کیسے سیکنڈ سے کم وقت میں غائب ہو جاتا ہے کہ نشان تک نہیں رہتا کہ ادھر کبھی پانی گرا تھا۔

باپ کی عزت بھی اس دو گھونٹ پانی کی طرح ہوتی ہے۔ جسے بیٹیاں ہی سنبھال کر رکھتی ہیں۔ تو نے کیوں ہاتھ ڈھیلے کر دیے۔ لیکن ابھی تو صرف چھاگل کا منہ ہی کھلا ہے۔ پانی گرنے نہ دینا بچی۔ سب تیرے اختیار میں ہے۔ ہو جاتی ہے غلطی۔ شیطان سے بھی ہوئی تھی۔ مگر وہ شرمسار ہونے کے بجائے ہٹ دھرمی سے

ڈٹا رہا تو مردود ملعون کہلایا۔ کوئی بات نہیں۔ ہو جاتی ہے غلطی اور پھر تو تو ہے بھی اتنی معصوم آ گئی باتوں میں۔ مگر دیکھ۔ اب جو باپ کہے وہی کرنا۔"

"خاندان کی عزت اور بہن بھائیوں کا مستقبل داؤ پر لگ جائے گا تاباں! اور۔ اور تیری جان۔ اور میں نے تو ہمیشہ اپنی اولاد کے جان و مال کی حفاظت مانگی ہے تاباں۔! مجھے اپنی اولاد کی زندگی بھی پیاری ہے اور عزت بھی۔"

زاہدہ پہلے بھی لمبی بات نہیں کرتی تھیں۔ اب تو چند جملوں کو ترتیب دینا بھی جوکھم لگتا۔

"جو مرضی ہو گیا ہو مگر چچا کہہ رہے تھے۔ بہر حال شکیل اور تاباں کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ وہ بہت دیکھ بھال کر تاباں کا رشتہ کریں گے۔" ماڈہ نے مجاہد تاج کی نئی سوچ سے آگاہ کیا۔

"ہاں اور ابو بھی کہہ رہے تھے کہ چاچی جی کا رویہ درست نہیں ہے۔ انہیں ہمیشہ ہی کی پرخاش ہے تاباں سے۔ تو پھر ان ہی کی بہو کیسے بنا دیں۔" ماجدہ کے پاس بھی لیٹسٹ اپ ڈیٹ تھیں۔

راشدہ باجی۔ اور نازاں، افشاں بھی بلا لی گئی تھیں۔ شادی کی تیاریوں کا بہانہ کام آ گیا۔ سب سمجھا رہے تھے کبھی محبت یاد دلاتے، کبھی دنیا سے ڈراتے، کبھی عزت کا خوف۔

مشاہد تایا خود ان کے کمرے میں آئے (تاباں کو اس کے پرانے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا) وہ نقاہت زدہ۔ پیلی پھٹک بے حد خالی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ تائی جی نے خود ہی دوپٹہ سر پر دے کر کانوں کے پیچھے اڑس کر اسے مودب کر کے تکیوں کے سہارے بٹھا دیا۔ اسے خاموش رہنے اور سب سننے کی تلقین کی۔ سمجھنے اور مان لینے کی تادیب کے ہمراہ۔

تایا جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر گال پر تھپتھپایا۔ وہ بہت کچھ بولتے جا رہے تھے۔ نکلتے وقت اس کا شانہ تھپکا۔ وہ سب سن رہی تھی اور کسی بھی سوچ کے بغیر اثبات میں سر ہلاتی تھی۔

سب خواتین ایسے میں کمرے کے اندر آجاتی تھیں اور بہت خوف زدہ متوقع نگاہوں سے اسے دیکھتی تھیں۔ تایا جی کے بعض جملوں پر اس کی آنکھیں پٹپٹانے لگتی تھیں۔

ایک اچھی امید افزا ملاقات۔ سب کو سب اچھا ہوتا نظر آنے لگا۔

"دھلواؤ میرے ہاتھ۔ اس (گالیاں) کو ہاتھ لگا کر آیا ہوں۔" باہر نکلتے ہی مشاہد تایا کی بے حد بھنچی مگر کراہت سے بھرپور آواز سب کے چودہ طبق روشن کر گئی۔

کھلے چہرے سہم گئے۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا اور پتا نہیں تاباں نے نرم لہجے میں شہد جیسے میٹھے جملوں کو سن کر کیا سوچا تھا اور پتا نہیں۔ اگر اس نے تایا جی کی ہاتھ دھلوانے کی فرمائش سن لی تھی تو کیا سمجھا تھا۔

سب اس کا چہرہ کھوجتی تھیں۔ وہ سنہری تھی سونے کی طرح دمکتی تھی۔ اب پیلی دکھتی۔ پیتل کی طرح سیاہی کی جانب مائل۔ سونا اور پیتل۔ دونوں پیلے ہی کہلاتے ہیں مگر۔ نصیب کے لکھنے سے فرق ہے۔

تاباں مجاہد بہت سہج سہج قدم اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل پر بھی آ گئی۔

"تاباں! رائتے کا ڈونگا دو۔" مجاہد تاج بہت تیزی میں کھانا کھا رہے تھے۔ انہیں کہیں جانے کی جلدی تھی۔ بڑی عجلت میں تاباں کو پکارا تھا جیسے سب کچھ پہلے کی طرح ہو گیا۔ یا کبھی خراب تھا ہی نہیں۔

اس نے ڈونگا بڑھا دیا۔ مجاہد تاج نے اسے بہت سارے نوٹ پکڑا دیے۔ "ذرا حالات بہتر ہو جائیں شہر کے۔ اپنی پسند کی چیزیں..... اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ اور اگر مزید کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دینا۔"

تاباں کچھ نہ بولی۔ اس نے مٹھی بند کر لی تھی۔

"کیرم بورڈ کھیلنے کے بارے میں کیا خیال ہے ؟"

کاشان کی آواز پر وہ بری طرح چونکی۔

کتنے دنوں بعد کاشان نے اسے مخاطب کیا تھا۔ تاباں مجاہد کے دل میں کیا چل رہا تھا۔ نفرت، محبت، بیزاری، کبھی ظاہر نہ ہوئی۔ جبراً" واپسی کے بعد سے اب تک اس نے جیسے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ گھر والوں نے

اسے باقی گھر سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔

لیکن اس سب کشمکش کے بیچ بے دھیانی کے اس عالم میں بھی کاشان مجاہد اس کا دھیان تھا۔ اس کا ننھا پیارا بھائی۔ جسے زاہدہ نے صرف جنم دیا تھا۔ وہ چاروں بہنوں سے بہت چھوٹا تھا۔ زاہدہ صرف نام کی امی تھیں ویسے وہ چار اماؤں کا بیٹا تھا۔ جن میں اماں نمبر ون تاباں مجاہد تھی۔

اتنے دنوں سے اپنی سوچوں میں گم تاباں مجاہد کئی بار کاشان مجاہد کی آواز پر چونکی تھی۔ جب وہ اسکول جاتے وقت بلاوجہ کی ضد بحث کرتا، جب اونچی آواز میں کھانے پینے پر ضد کرتا۔ جب صوفی اسے ہوم ورک کروانے کے لیے پکارتی، جب وہ صدا لگاتا۔

"کھیلنے جا رہا ہوں۔"

تب تاباں کا دل مچلنے لگتا کہ وہ اس کے پیچھے جائے۔ اسے جی بھر کے تنگ کرے اور وہ زچ ہو کر پیر پٹخے تب وہ اس کے نرم گالوں کے چٹاچٹ بوسے لے، اس کی سنہری آنکھوں پر ہونٹ رکھ دے اور ناک کو شہادت کی انگلی سے چھو کر اسے چھیڑے۔

مگر کاشان مجاہد کا اس سے ملنا بند کر دیا گیا تھا۔

اور اس وقت کیرم کھیلنے کی فرمائش۔ اس کے چہرے پر بہت دنوں بعد ایک سچی مسکان آ رکی۔ وہی۔ ویسی ہی جگمگاہٹ جیسے کہ تاباں مجاہد مسکرایا کرتی تھی۔

"ہاں۔ آں۔ ہاہ اچھا خیال ہے مگر پہلے تم میرے سامنے تو آؤ۔ میرے پاس تو بیٹھو۔ اتنے دن سے کیوں نہ آئے؟"

"وہ۔ ابا نے منع کر دیا تھا ناں۔ اور سب نے کہا تھا۔ آپ نے بہت بڑی غلطی کی ہے تو آپ کو سزا مل رہی تھی۔ اور پھر آپ کہیں چلی بھی گئی تھیں۔ آپ کو میں یاد نہ آیا۔"

"صرف تم ہی یاد آئے۔" تاباں نے سلکی بال سنوارے۔

"اور آپ نے کہا تھا کہ سب سے زیادہ پیار بھی مجھ سے ہی کرتی ہیں۔"

"اب بھی کرتی ہوں۔" اس نے اس کے کان کی لو کو چھوا۔ تو اس نے گدگدی کے احساس سے شانہ اچکایا۔ "اوں ہوں۔"

"اب تو خود تایا ابا نے بھیجا ہے۔ کہنے لگے۔ باہر مت جاؤ۔ اپنی تاباں آپی کے ساتھ گھر ہی میں کھیل لو۔" وہ گوٹیوں کا ڈبا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے بولا۔

تاباں کے منہ سے "اچھا" نکلا اس کی نگاہیں کاشان کے سر پر جمی تھیں۔ اس کے بالوں کی ساخت اور رنگ ہو بہو تاباں کے جیسا تھا۔ جیسے تاباں کے بال کاٹ کر کاشان کے سر پر چپکا دیے ہوں۔

"تایا جی کہہ رہے تھے۔ اسے احساس ہونا چاہیے وہ کن چیزوں کو کھو دے گی۔ پتا نہیں وہ کس کی بات کر رہے تھے۔" کاشان گوٹیوں کو لے جا رہا تھا۔ تاباں کو پتا لگ رہا تھا وہ کن چیزوں کی بات کر رہے تھے۔ اس کے دل کو کچلے جانے کا احساس ہوا۔

"پہلی دام میری۔" کاشان نے اسٹرائیکر کو ہاتھوں میں تولا۔ تاباں نے سر ہلایا۔

کاشان نے بہت حساب کتاب سے نشانہ باندھا تھا۔ مگر گوٹ لینی تو کیا وہ گوٹیوں کو ہلا بھی نہ سکا۔ کاشان کے چہرے پر پھیلی جانے والی خفگی، مایوسی، اس کے چہرے کو بے حد معصوم بنا رہی تھی۔ اس عالم میں وہ تاباں کے دل کے اندر گھس رہا تھا۔ اس نے بالکل غلط نشانہ باندھا لیکن یہ کیا۔ گوٹیاں تتر بتر ہو گئیں۔ اور کوئن ہول میں جا چکی تھی۔

"آں.....!" ہاتھ ہونٹوں پر ٹھہر گیا۔ کاشان رونے والا ہو گیا۔

"کوئی پہلی ہی دام پر کوئن جیتتا ہے بھلا۔" اس کے شکوے میں مان تھا۔ جیسے اسے تاباں سے ایسی امید نہ ہو۔

"ہم دوبارہ گیم شروع کریں گے۔" اس نے دوبارہ گوٹیوں کا دلفریب لیول ترتیب شروع کر دیا تھا۔ کاشان کا چہرہ کھل گیا۔

"بہت دنوں بعد کھیل رہے ہیں ناں اس لیے یہ بے اصولی کر رہی ہوں اور جہاں تک پہلی دام پر کوئن

جینے کی بات ہے تو۔

"اگر میدان مارنا چاہتے ہو ناں تو پہلی دام پر ہی آخری داؤ کھیل جاؤ۔

قسمت باربار موقع نہیں دیتی۔"

کاشان نے سرہلایا' وہ بورڈ پر پاؤڈر چھڑک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ساری شام اور پھر رات گئے تک کاشان اس کے ساتھ رہا۔

تائی جی اسے گھر کے بڑے اسٹور نما کمرے میں لے کر جانا چاہتی تھیں۔ جہاں مائدہ و ماجدہ کے جہیز کا سامان اکٹھا کیا گیا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

تائی جی اسے ہر ہر ڈبہ کھول کر دکھا رہی تھیں۔ مائدہ ماجدہ موجود تھیں ہی پھر زاہدہ اور ضوفی بھی آگئیں۔ سب بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔ جیسے یہی سب سے بڑا اور اہم کام ہو اور تاباں کی رائے مسلم۔

مگر درحقیقت وہ سب تاباں کو جانچ رہی تھیں جو بہت خاموشی سے دیکھتے دیکھتے اب بصرے تک آگئی تھی۔ یہاں تک اس نے یہ بھی بتانا شروع کر دیا کہ کیا کیا چیز کم ہے یا ایسے نہیں ایسے۔

مگر اس کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ بہت کمزور اور پیلی دکھائی دیتی تھی۔ بے رنگ' اس کے لہجے کی کھنک اور بے نیازی غائب تھی۔ مگر ضوفی کو وہ قطعاً" ڈری جھجکی دکھائی نہ دی۔

جبکہ ضوفی کے خیال میں اسے سب کچھ نظر آنا چاہیے تھا مگر پرسکون ہرگز نہیں۔ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کے دل میں کیا پل رہا ہے۔ یہ کبھی پتا نہیں چلنے دیتی تھی۔ مگر جب کوئی ایسے کٹھن حالات میں پڑا ہو تو۔ کچھ شائبہ۔ کوئی لکیر۔ کوئی بدرنگا سا رنگ تو چہرے پر نمودار ہو ہی جاتا ہے مگر اتنا نارمل سا۔ فریش چہرہ۔

☼ ☼ ☼

اتنے کم وقت میں تاباں مجاہد کو سمجھانا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔

سب نے اپنے اپنے داؤ کھیلے تھے۔ اسے دنیا دکھائی تھی اور دین بتایا تھا۔

اسے وہ محبت بھی یاد کروائی تھی جو سب۔۔۔ اس سے کرتے تھے اور جو وہ ان سب سے کرتی تھی۔

اسے بہن بھائیوں کا مستقبل یاد دلایا گیا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس سے معذرت بھی کی گئی کہ جو سلوک (ناروا) اس کے ساتھ روا رکھا گیا۔ وہ اشتعال کے باعث تھا ورنہ بیٹیوں کو پھول کی چھڑی سے بھی چھونے کا خیال نہیں آیا تھا۔

وہ سر جھکا کر سب کو سن رہی تھی (جھکا سر شرمساری کے باعث تھا شاید۔) اسے اس کی غلطی کا احساس کروانے کے لیے کتنی مثالیں دی گئیں تھیں۔) سب اپنی اپنی باری پر بولتے جاتے تھے اور وہ ہونٹ کچلتی' خاموش تھی۔ اسے بولنے کے لیے نہیں بلوایا گیا تھا۔ اسے سننے سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے بلوایا گیا تھا۔

نسلوں کی عزت اب اس کے ہاتھ میں تھی۔ تایا جی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ (دھلواؤ میرے ہاتھ اس (گالی) کو ہاتھ لگا کر آرہا ہوں)۔

"چار بیٹیوں کا باپ تھا۔ مگر تمہیں تاباں! سب سے الگ رکھا۔" ابا کا دست شفقت اس کے سر پر تھا۔

(اسے گدی سے بالوں کے کھینچنے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا درد انتہا کا)

"نہیں' آپ لوگ پریشان نہ ہوں اور نہ میری بیٹی کو تنگ کریں۔" تائی جی نے اس کے گال پر انگلیاں پھیریں اور دوپٹا درست کیا۔

(اس کے گالوں کے زخم جلنے لگے)

"خدا کا لاکھ شکر کرنا چاہیے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود منڈیر کے آب خورے سے پانی پینے کے لیے آئی چڑیاں بھی لاعلم رہیں کہ۔۔۔" جمیل بھائی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"آگے بھی ہم سب سنبھال لیں گے۔ تم بس ہدایات کو یاد رکھنا۔" جمیل بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ سب نے تائیداً" سرہلائے۔

(تاباں کی پسلیاں اور کولہے کا گوشت بہت اندر تک درد کرنے لگا۔ شاید گوشت پھٹ گیا تھا)

"میرا خیال ہے' ہماری بیٹی سب سمجھ گئی ہے۔ بس بہت ہو گیا۔ ناسمجھ اور کم عمر ہے۔ اسے پتا نہیں لگا کہ کیا کر آئی مگر۔۔۔ خیر بچے غلطیاں کر ہی دیتے ہیں ہم بڑوں ہی کا کام ہے کہ انہیں معاف کریں۔ کیوں بیٹا۔۔۔ پھر سب کچھ کلیئر ہے ناکہ کل تمہیں جج صاحب کے سامنے کیا کہنا ہے۔ گھبرانا نہیں ہم سب تمہارے ساتھ ہی ہوں گے۔"

مشاہد تایا نے نشست برخاست کرتے ہوئے کہا۔

تاباں نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

"ذراسی بھی غلطی سب کیے کرائے پر پانی پھیر دے گی۔ من مانی مت کرنا نہ اپنی طرف سے جملے جوڑنا جو بڑوں نے کہا ہے نا بس وہی سب۔۔۔" چاچی جی کے مصنوعی نرم لہجے میں تضحیک کا عنصر اب بھی نمایاں تھا۔

"صحیح کہہ رہی ہیں چاچی تمہاری۔" زاہدہ نے کہا۔ "ہم سب تم سے محبت کرتے ہیں تاباں! ہم سب سے بڑھ کر تمہارا اور کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا بیٹی۔۔۔"

تاباں نے پہلی بار نگاہ اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

(میں تم سے اتنی محبت کرنے لگا ہوں کہ حیران ہوں۔ یار! کہتے ہیں۔۔۔ کوئی شے دسترس سے دور رہو تو بہت پرکشش لگتی ہے' مگر جب پالیں تو دھیرے دھیرے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر تم تو سونا لگتی ہو' ہر صبح اٹھتا ہوں تو ریٹ بڑھ جاتا ہے پہلو سے لگی ہوتی ہو' مگر دسترس سے دور۔ ایسے وہم میں کیسے جیوں۔۔۔ اجازت ہو تو چھو کر دیکھ لوں۔۔۔؟)

"مجھے سب سمجھ میں آگیا امی۔۔۔ مجھے سب یاد ہے۔۔۔ میں نے واقعی غلطی کی۔" اس نے توقف کیا۔ "مگر اب میں اور غلطی نہیں کروں گی۔"

سب کے لیے یہ اعتراف طمانیت بخش تھا۔ سب نے پرسکون سانسیں لی تھیں۔

تاباں مجاہد کے چہرے کی سوچ۔۔۔ شرمندگی۔ لہجے کا ٹوٹا پن۔ اعتراف اور آنکھ کی نمی سب کل کی جیت کی چغلی کھاتی تھیں۔

بڑے دنوں بعد ایک ایسی رات آئی تھی جب تاج ہاؤس کے مکین بڑے اطمینان سے بستر نشین ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

قصوروار اور بے قصور۔۔۔ پولیس وینز اور پولیس والے۔۔۔ کالے کوٹوں میں ملبوس مرد و زن۔۔۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں کھڑے لوگ کاغذات کی جانچ اور پڑتال کرتے ہوئے کریہہ صورت والے خرانٹ مجرم۔۔۔ جن کے چہروں پر نگاہ ڈالنے سے خوف آتا تھا۔ پژمردگی کی تصویر بنے بے بس مظلوم ہتھکڑیوں کی جھنکار۔۔۔ بعض کی پنڈلیوں پر بیڑی کے کڑے نے زخم بنا دیے تھے اور وہ ان سے بے نیاز بمشکل قدم اٹھائے چلتے تھے۔

وہ سرتاپا برقعے میں ڈھکی ہوئی تھی۔

اور ماحول کے باعث سہمی سہمی سی چلتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا سب اسے دیکھ رہے ہیں (جبکہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا) عدالتوں میں قیامت کا عالم ہوتا ہے۔

گھر کے سب ہی کرتا دھرتا ہمراہ آئے تھے مگر الگ الگ۔۔۔ کوئی پہلے نکلا اور کوئی بعد میں پہنچا' وہ مجاہد تاج اور وکیل صاحب کے ہمراہ تھی۔ عقیل ان سے بہت پیچھے تھا۔ دیکھنے والے کو پہلا تاثر یوں ملتا کہ تاباں مجاہد وکیل صاحب کے ہمراہ ہے اور مجاہد تاج ساتھ ہوتے ہوئے بھی ذرا دور ہٹ کر چلتے تھے اس۔ فاصلہ میں شعوری و لاشعور دونوں عنصر شامل تھے۔

تاباں وکیل صاحب کی تیز تیز چلتی زبان کو دیکھ رہی تھی مگر سمجھ نہیں رہی تھی وکیل صاحب بہت بااعتماد تھے۔ وہ کسی رٹو طوطے کی طرح ہزار بار کی گئی باتیں دہرا رہے تھے۔ "آپ سمجھ رہی ہو نا؟"

اور تاباں ہر بار سرہلا دیتی تھی۔

بہت دور ساجد چاچا ہمراہ شکیل تھے۔ گاڑی کے بند شیشوں کے پیچھے مشاہد تاج اور جمیل تھے۔ وہ اخبار بینی کر رہے تھے۔

اسے فقط وکیل صاحب کی بتائی ہدایات کو یاد کر کے عمل کرنا تھا۔

وہ اپنی باری کے انتظار میں ایک ایسے گوشے میں بینچ پر بیٹھی تھی جہاں کم ہی لوگوں کی نگاہ جاتی۔ مگر وہ سب کو دیکھ رہی تھی۔ ہر انسان عجلت میں دکھائی دیتا سوچوں کے خلفشار میں مبتلا حسرت و امید کے بیچ ڈولتا...

اسے اندر بڑھتا دیکھ کر تاج ہاؤس کے تمام مرد ذرا سا آگے بڑھے تھے سب ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ اجنبی سے بن کر مگر سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو تسلی دی تھی۔

ان سب کو وکیل صاحب پر اعتماد تھا اور کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ ہاں مگر ایک خوف جو سب پر حاوی تھا کہ... کہیں وہ سب دیکھ نہ لیے جائیں اور پہچانے نہ جائیں۔ آج کے دن عزرائیل نظر آجائے تو آجائے مگر کوئی شناسا نہ ملے۔

مگر تب ہی مجاہد تاج کی نگاہ ایک شخص پر پڑی اور وہ شناسا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔

مجاہد تاج کی رگوں میں خون کی جگہ کھولتا ہوا تیل دوڑنے لگا وہ جاذب سلطان تھا۔

انہوں نے اسے چھ ماہ بعد دیکھا تھا۔ وہ اس شخص کو دیکھنے سے پہلے اپنے ہاتھوں اپنی آنکھوں کو پھوڑ ڈالنا پسند کرتے۔ مگر اس وقت یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے جس نے اک سرسری نگاہ کے بعد دوبارہ دیکھنا پسند نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا وکیل تھا اور چند اور لوگ جو اندر کمرے میں بڑھنے سے پہلے جاذب سلطان سے کچھ سن رہے تھے۔

جاذب سلطان کی طمانیت نے مجاہد تاج کو جیسے برہنہ حالت میں کیلوں کے بستر پر ڈال دیا تھا۔

چھ ماہ پہلے جب وہ ان کے گھر آیا تھا تو پہلی نگاہ میں وہ انہیں بے حد اچھا لگا۔ بہت معصوم و کم عمر... سادہ...

دوسری بار کالج کے سامنے ان کی نگاہ حیرت میں ڈوبنے کے باعث کچھ اور دیکھنے جانچنے کے لیے ابھر نہ سکی اور تیسری بار جب وہ بازار سے باہر کھڑا تھا' تب وہ غصے اور انتقام میں جل رہے تھے اندھے ہو رہے تھے۔

مگر اپنی تمام تر نفرت و اشتعال کے باوجود وہ جب جب یادداشت کے پردے پر ابھرا۔

بہت کم عمر... معصوم... کم فہم... اور بے بس لگا تھا' اتنا کہ وہ اسے کسی گنتی میں ہی نہ لاتے تھے مگر آج...

وہ بے حد سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ بہت باوقار' بااعتماد' اپنی عمر سے بہت بڑا۔ وہ بہت بہادر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ بے فکر... بے خوف... اس کی طمانیت اور خود اعتمادی کو ظاہر کرنے کے لیے مجاہد تاج کو کوئی لفظ موزوں نہیں لگ رہا تھا۔ بے پرواہ...

وہ سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ سیاہ گاگلز۔ سلیقے سے جمے بال' سیاہ نئے نوک والے جوتے۔ وہ سلور گرے بڑی گاڑی سے ٹیک لگائے یوں کھڑا تھا کہ بس دو چار منٹ میں فراغت پائے اور نکل جائے۔ اس کی شیو سیون او کلاک تھی اور اس کے وجود سے اٹھتی تازگی گردوپیش پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔

وہ ایک بھرپور مرد دکھائی دیتا تھا۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار ہر کس و ناکس کو ایک بار پلٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس نے ایک پہلی نگاہ کے بعد دوبارہ انہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ عدالت کے اس کمرے کو دیکھ رہا تھا جہاں وکیل گئے تھے جبکہ مجاہد تاج شدید نفرت کے باوجود اس کو دیکھے جا رہے تھے۔

تاباں عدالت کے کمرے سے بہت دور ایک گوشے سے نکل کر جب کمرے کے دروازے پر پہنچی تو وکیل صاحب نے مجاہد تاج اور اردگرد پھیلے لوگوں کو دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ تاباں نے مجاہد تاج کے تشفی کے لیے اٹھے ہاتھ کو بغور دیکھ کر سر جھکایا تھا۔ اسے تمام سبق ازبر تھے اسے تمام واقعات و حالات بھی یاد تھے۔ وہ جانتی تھی اب غلطی کی گنجائش نہیں...

وہ وکیل صاحب کی پکار پر جب گھومی تب ہی اس

نے سامنے اس شخص کو دیکھ لیا جو اسے ہمیشہ خیالی دنیا میں رہنے والا لگا تھا۔ اس نے کبھی اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا باوجود اس کے کہ وہ باتیں دل کی دنیا کو تہہ و بالا کردیتی تھیں۔

اس نے اس سے کہا تھا۔

"وہ بے حد حقیقت پسند عملی لڑکی ہے اور ایسے خوابوں خیالوں کی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔"

"میرے خوابوں کو برا نہ کہنا۔۔۔ نہ خیال کی توہین کرنا۔ آنکھ بند کر کے من پسند خواب دیکھوں گا تو تب ہی تو جاگ کر تعبیر ڈھونڈنے کے لیے تدبیر کروں گا۔

اور جہاں تک حقیقت اور عمل کی بات ہے۔ اللہ نہ کرے کہ آزمائش آئے۔

میرے جیسا شخص جو اپنے خواب کی اتنی حفاظت کرتا ہے وہ تعبیر کو اتنی آسانی سے لٹنے نہیں دے گا۔

بے وقوف لڑکی۔۔۔!"

اور اس کی یہ بات تاباں مجاہد کے دل میں کھب گئی تھی۔ اس نے یقین کرلیا تھا۔ جاذب سلطان کی جذبے لٹاتی آنکھیں گاگلز کے پیچھے تھیں مگر اس نے تاباں کا رکنا اور دیکھنا محسوس کرلیا تھا۔ اس نے فقط اپنے بازو سینے پر لپیٹے تھے اور ٹانگوں کو قینچی کرلیا تھا یہ اس کی طمانیت کا واضح اشارا تھا۔

تاباں نے دوسری نگاہ نہیں ڈالی۔ وہ تیزی سے اندر بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیزی سے اندر بڑھتے رضوان (نازاں کا شوہر) نے مجاہد تاج کو دیکھا تھا وہ ذرا سا ٹھٹھکا۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی اور اخبار۔۔۔

کاروباری حوالے سے عدالتوں کے چکر لگ ہی جاتے تھے 'یقینا" مجاہد تاج ایسے ہی کسی معاملے میں آج یہاں ہوں گے خود وہ اپنے محلے کے ایک جھگڑے جو بڑھ کر زندگی موت کا معاملہ بن چکا تھا کے تصفیے کے چکر میں اہل محلہ کا سرغنہ بن کر آیا ہوا تھا ذرا رک کر وہ تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ (اب کون رک کر سلام دعا کرتا پھرے۔ وہ داماد کے درجے کو اچھی طرح سے استعمال کرنا جانتا تھا)

ہاں اگر وہ دیکھ کر مخاطب کرلیں گے تو خوب جھک کر سلام بھی ہوگا اور دیگر کا تعارف بھی۔ فیصلے کے بعد وہ آگے بڑھا' تب ہی بے چینی سے سگریٹ پھونکتے ساجد تاج کو دیکھا۔ وہ ٹہل رہے تھے اور چہرہ بے چینی اور گھبراہٹ کی تصویر تھا۔ ساتھ ہی جمیل و شکیل بھی تھے جو سر جوڑے بڑے رازدارانہ انداز میں ہلکی آواز مگر تیزی سے بول رہے تھے۔

معاملہ گمبھیر معلوم ہوا۔ رضوان نے سوچا ابھی ان کی پیشی میں ذرا وقت ہے پتا کرنا ہی پڑے گا۔ وہ اپنے ساتھ آئے لوگوں کو بتانے لگا کہ 'سسر صاحب نظر آرہے ہیں' ذرا معلوم کرتا ہوں کہ سب خیریت ہے نا؟

☆ ☆ ☆

رضوان جس پارٹی کی جانب تھا فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔ وہ تنی گردن اور چوڑے سینے کے ساتھ دو قدم آگے بڑھ کر چلتا تھا۔ جیت کا زعم۔

تب ہی ہلکی سی ہلچل نے سب کو چونکایا' متوجہ ہونے پر مجاہد تاج کے عین سامنے وکیل کھڑا تھا اور کچھ اجنبی چہرے۔ وکیل صاحب کے چہرے پر مایوسی' درشتی' ناگواری کا گہرا عکس تھا۔ وہ اپنے قلم کو جیب میں رکھتے ہوئے اور چشمے کو کیس میں ڈالتے ہوئے خفگی کا اظہار کر رہا تھا۔ دوسری جانب مجاہد تاج شدید بے یقینی سے وکیل کو دیکھتے ہوئے جیسے کچھ نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ وہ اچک اچک کر وکیل کے پیچھے کھڑے لوگوں کو کھوج رہے تھے۔

تاباں مجاہد کہاں تھی؟ انہوں نے وکیل ہی کے ساتھ تو اسے روانہ کیا تھا پھر کہاں رہ گئی؟ کیا کوئی نیا شوشہ۔۔۔

ساری احتیاطی تدابیر بھول کر کونوں کھدروں میں بکھرے تاج ہاؤس کے مکین تیزی سے ان کے نزدیک آنے لگے۔ رضوان ان سب کے اس طرح اکٹھا

ہونے اور سرپٹ بھاگنے پر ابھی کھل کر حیران بھی نہ ہو پایا تھا کہ مجاہد تاج کے حلق سے سیٹی کی سی آواز نکلی۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے جھکے جا رہے تھے۔ رضوان سب سے نزدیک تھا۔ وہ مجاہد تاج کا پہلا سہارا تھا۔

رضوان کے لیے باعث حیرت تھا کہ سب مجاہد تاج کو سنبھالنے کے بجائے عدالت کے ایک کمرے کے دروازے کی جانب دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی متلاشی نگاہیں بہت بے قرار تھیں عجلت و بے یقینی۔ سپاہیوں کے جلو میں سرتاپیر برقعے میں ڈھکی لڑکی۔۔۔

وہ سب سلور گرے گاڑی کے قریب جا کھڑے ہوئے تھے۔ سیاہ لباس میں مردانہ وجاہت کا شاہکار وہ لڑکا فون پر کسی سے ہم کلام تھا۔ وہ تیز قدم چل رہا تھا۔ اسے گاڑی کا دروازہ کھولنا تھا۔

"لڑکی عاقل و بالغ ہے اس نے ہمارے عائد کردہ تمام الزامات کو مسترد کرتے ہوئے کہہ دیا کہ اس نے اپنی مرضی سے برضا و رغبت۔۔۔ گواہان کی موجودگی میں تمام لوازمات و شرائط پورا کرتے ہوئے جاذب سلطان سے نکاح کیا ہے اور وہ آئندہ کی زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے بلکہ اس نے عدالت سے تحفظ کی درخواست بھی کردی ہے۔

لہٰذا اس سیدھے سیدھے کیس کا فیصلہ لڑکی کے حق میں ہوگیا۔ ہمارا دعوا خارج کردیا گیا بلکہ اگر ان دونوں کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان پہنچتا ہے تو عدالت میں ان سب کے لیے پہلے ہی سے تاج فیملی کو نامزد کیا جاچکا ہے۔

میری وکالت و قابلیت اس صورت میں کام آتی جب آپ لوگ لڑکی کو قائل و مائل کرکے لاتے۔"

وکیل نے بہت تیزی سے دریا کو کوزے میں بند کردیا تھا۔

وہ بہت بدمزہ دکھائی دیتا تھا اور کسی حد تک حیران بھی تھا۔ لڑکی بے حد ڈری سہمی دکھائی دیتی تھی۔ وکیل صاحب کو حیرت ہوئی تھی کہ اس نے گھر سے باہر قدم نکالنے سے لے کر نکاح تک کا قدم کیسے اٹھالیا تھا۔

وہ ایک قطعی مختلف لڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے جج کے روبرو تھی بااعتماد' قطعیت سے بھرپور' بے خوف' پرسکون اور فیصلہ کن۔

وکیل دامن جھاڑ کر جاسکتا تھا مگر یہ سب جاسکتے تھے؟! اپنی بہت ساری سوچوں سے پرے۔۔۔ جو آج ہوا تھا' وہ تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

غیرت پر تازیانہ بن کر لگتا ایک بے یقین منظر۔۔۔ طلسم میں جکڑا شکیل بیدار ہوا تھا۔ وہ بل فائٹنگ کے سب سے تومند اور جارح بل کی طرح اس جتھے پر جھپٹا تھا جس میں حیدر سلطان تھے دو یا تین پولیس والے' چند دوسرے لوگ (گواہان) جاذب سلطان اور تاباں جاذب سلطان۔

بل کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ بھروسا تھا۔ وہ ایک ہی ٹکر سے سامنے والوں کو چیر پھاڑ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا مگر۔۔۔

پولیس والے تیار تھے۔ بندوق کا ایک بٹ کھا کر وہ مٹی چاٹنے لگا۔ تاباں جاذب نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ شکیل کی اس حرکت نے اس کے "سیکورٹی فراہم کی جائے" والے بیان پر مہر تصدیق کردی تھی۔

عدالتوں میں ایسے تماشے روزمرہ کی بات تھے۔ ہار کا غم اور جیت کا جشن۔ ساری محتاط روی پر پیر لگ گیا۔ سب تہس نہس۔۔۔ عدالتوں میں ایسے ہی ہجوم لگتے اور چھٹتے ہیں۔ کون دے اہمیت۔۔۔ مگر۔۔۔

اسے چونکانے کی عادت تھی۔ وہ اپنا اندر کبھی ظاہر نہ کرتی تھی۔

پتا نہیں اس نے پہلے سے سب طے کر رکھا تھا یا۔۔۔ احاطے میں کھڑے جاذب سلطان کو دیکھ کر فیصلہ بدلا تھا۔

ہاں جاذب سلطان وہ شخص تھا جس کو دیکھ کر فیصلے بدل دیے جائیں۔

قانون توڑ دیا جائے۔ آئین پھاڑ دیا جائے۔۔۔ اور پھر اگر آگے تاباں مجاہد ہو تو۔۔۔

آں۔۔۔ ہاں۔ تاباں مجاہد نہیں۔۔۔ تاباں جاذب سلطان۔

☆ ☆ ☆

بے حد طمانیت بخش' بے فکر زندگی میں یہ عجیب سی ہلچل۔۔۔ دن رات کے سکون کو گویا تہہ و بالا کر گئی۔ آج وہ دنیا کو خاطر میں نہ لاتی تھی' مگر دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

پہلے دل یقین پر بھی نہیں گھبراتا تھا۔ آج وہم پر بھی کپکپانے کی روش اپنالی۔

اسے اپنی اس کم ہمتی پر خود پر خوب تاؤ آتا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

وہ کیسے بتائے اور کیسے کہ سامنے کھڑا ہونے والا لڑکا اب اس کے پیچھے بھی آنے لگا ہے۔ اس دن بازار میں کاسمیٹک کی دکان میں۔۔۔ جبکہ وہ فیملی کے ہمراہ ہی تھی۔ وہ سب بازار میں خوب گھومے تھے۔ بے فکروں کی طرح۔۔۔ تب ایک بار بھی نظر نہ آیا اور پھر جیسے ہی وہ تنہا ہوئی تو وہ۔۔۔ سامنے آگیا اور پھر جب وہ اسے کھوجنے لگی تو کہیں نہ ملا۔

اتنی پر سکون زندگی میں ایک بار پھر تلاطم۔۔۔ (کیا وہ جھیل پائے گی زندگی میں "زندگی" ایک بار ملتی ہے اور موت بھی ایک بار۔۔۔ اسی طرح زندگی میں اس طرح کا طوفان بھی ایک بار۔۔۔ ہی کافی ہے۔ بار بار۔۔۔ نہیں کبھی نہیں۔۔۔)

سوچوں نے اسے نڈھال کر دیا۔

زندگی میں محبت تھی۔ خوشیاں تھیں۔ آسائش تھی۔ شوہر' اولاد' ہنسی' بے فکری مگر اعصاب میں وہ پہلے سی مضبوطی نہیں رہی تھی کہ سب کچھ جھیل کر بھی ڈٹی رہے۔

☼ ☼ ☼

"مجھ سے اپنے آپ کو چھپالو گی ایسا وہم بھی کیسے پال لیا دل میں۔۔۔ پریشان لگتی ہو' خوف زدہ بھی' گھبرائی سی۔۔۔ حالانکہ میں نے تمہیں ہمیشہ یقین دلایا ہے کہ میں تمہارا بھروسا ہوں۔۔۔ ہم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں پھر پردہ پوشی کا کیا مقصد۔۔۔ یونہی وقت کا ضیاع۔ معمولی نزلہ زکام میں ایسا حال تو نہیں ہوتا۔"

"میں کچھ نہیں چھپا رہی۔"

"اوں ہوں۔۔۔ تم کچھ نہیں بتا رہیں۔" وہ ترنت جواب دے کر کھڑکی کے پٹ کھولنے لگا۔ دھوپ اس وقت بیڈ پر اس طرح پڑتی کہ وہ دھوپ میں نہا جاتی نزلے میں خاصا افاقہ ہوتا۔

"آں۔۔۔ ایک منٹ کھڑکی مت کھولو۔۔۔" وہ جو نیم دراز تھی۔ بہت تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے پردے سمیٹتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے بے حد اچنبھے سے اس کی عجلت کو دیکھا تھا۔

"مم۔۔۔ میرا مطلب ہے ہوا۔۔۔ ہوا بہت ٹھنڈی ہے میرے۔۔۔ میرے۔۔۔ سر میں درد ہو جائے گا۔"

"ہوا تو سرد ہے مگر یہ جو دھوپ۔۔۔" اس نے بیڈ پر آئی دھوپ کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں دھوپ اچھی ہے مگر بس۔۔۔" وہ تھکے انداز سے بیڈ پر ڈھے گئی آنکھیں موند لیں جیسے اب کچھ نہ بولے گی۔

"ہم بنا کہے ایک دوسرے کو جان لیتے ہیں۔ تم بتانا نہیں چاہتیں تو میں پوچھوں گا بھی نہیں مگر بس۔۔۔" وہ کھڑکی سے باہر تاحد نگاہ دیکھ رہا تھا۔ دھوپ نے نہر کے پانی کو پیلا رنگ دے رکھا تھا' یوں لگتا نہر میں پانی نہیں پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہو۔

"تم پر یہ جو اداسی کی لہر۔ خاموشی۔۔۔ بے کلی چھا جاتی ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ خاص طور پر جب مجھے علم ہو کہ میں کچھ کر نہیں سکتا کہ تم اس سے ابھر سکو۔"

وہ اپنی مجبوری بتا رہا تھا اور اتنا بے بس لگ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح ایمان لے آئی۔ اس نے اس پر ہمیشہ یقین کیا تھا۔ خود سے بھی زیادہ۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔ آنکھ بند کر کے۔

☼ ☼ ☼

ساری دنیا سے کٹ کر رہتے ہوئے الگ بسائی جانے والی اس دنیا میں سکون اور بے فکری تھی۔ ایک دوسرے میں مگن۔۔۔ خوشیاں اور غم بس اس گھر کے اندر۔۔۔ مگر انسان تبدیلی کا خواہش مند رہتا ہے۔

اس کی قنوطیت وہ برداشت نہ کر سکا۔ مری جانے کے لیے ٹکٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے وہ خوش تھا۔ بہت دنوں بعد وہ مسکرائی۔ آنکھوں میں اطمینان ہلکورے لینے لگا۔

نئے گرم کپڑے اور جوتے' ہوٹل' سیر کا پورا پلان۔ ہر بار وہ پروگرام ترتیب دیتا تھا۔ اس بار وہ بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اسے سن رہا تھا۔

وہ اداس ہوتی تھی تو یوں لگتا۔ شام طاری ہو گئی ہو۔

خاموش دھیان کرواتی تھی۔ اتنا گہرا سناٹا کائنات پر طاری ہو گیا ہے کہ اگر اس سے پھول کھلے تو پتیوں کی انگڑائیاں اور ٹوٹتی سانسیں صاف سنائی دیں گی۔

وہ مسکرا رہی تھی اور اس عالم میں اس کے حسن کو بتانے کے لیے وہ چیخ چیخ کر لفظوں کی کمیابی کا رونا روتا تھا۔

اور اب۔۔۔ جبکہ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ بول رہی تھی۔ تب۔۔۔

اسے اپنی قوت گویائی چھن جانے کا احساس ہوا۔

وہ خوب صورت تھی' وہ یہ بات ہمیشہ سے جانتا تھا۔

وہ اتنی زیادہ خوب صورت ہے۔ اسے ہر روز یہ بات جیسے نئے سرے سے پتا لگتی۔ نئے سرے سے حیران کرتی تھی۔

وہ اس کی تیاری کے جوش و خروش کو بڑی تسلی سے دیکھ رہا تھا۔ دنیا میں غم روزگار نہ ہوتا نا۔۔۔ تو وہ ساری عمر ایسے گزار دیتا مگر۔۔۔

آہ۔۔۔ یہ پاپی پیٹ۔۔۔

☼ ☼ ☼

ایک دوسرے پر برف پھینکتے ہوئے۔ سنو مین بناتے ہوئے بلند آہنگ قہقہے لگاتے ہوئے یوں لگتا جیسے زندگی نام ہے فقط۔۔۔ خوشی ہنسی فراغت اور محبت کا۔۔۔

اسے لگا' وہ بھی سب کچھ بھول بھال کر بس زندگی سے لطف اٹھا رہی ہے۔ دن گزار کے جب تھکے ٹوٹے جسموں کو گرم بستر میں ڈالتے تب فقط نیند کا خیال آتا پھر بھی اسے اس کا دھیان آجاتا۔

"کیا وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی کھڑکی کو گھورنے آتا ہو گا۔۔۔ کیا خبر۔۔۔ وہ مجھے جانتا ہی نہ ہو اور یہ سب میرا وہم ہو کہ پہلے بھی تو۔۔۔

کتنی عجیب بات تھی۔ وہ اس کی موجودگی سے۔۔۔ موجودگی کے خیال سے۔ خوف زدہ تھی اور حیران تھی۔ پتا نہیں حیرت کا عنصر زیادہ تھا یا خوف کا؟ لیکن اسے اس سے جان کا خوف نہیں تھا۔

مال کا خوف بھی جاتا رہا۔

اسے اس کی موجودگی کبھی اپنی عزت کے لیے بھی خطرہ نہیں لگی تھی۔

پھر یہ کیسا خوف تھا؟ (کیسا اطمینان تھا؟) مگر ایسے جارح خیالات سے پتا نہیں وہ خود کیوں ڈر جاتی تھی۔ وہ اس کے لیے قطعاً "اجنبی تھا' مگر کچھ آشنائی کا خیال۔۔۔

وہ باز پرس پر کیا جواب دے گا۔۔۔ اسے اس جواب سے ڈر لگا۔۔۔ نجانے کیسا جواب؟

مری سے واپس لوٹی تو گھر کے عین سامنے گاڑی رکنے اور گیٹ کھلنے کے مرحلے تک اس نے گردن گھما گھما کر خوب تسلی کر لیتی وہاں کوئی نہیں تھا اس کے دل میں سکون کی لہریں ہلکورے لینے لگیں۔ گھر میں اماں حمیداں موجود تھیں' مگر وہ بہت کچھ دیکھتی بھالتی جب اپنے کمرے تک آئی۔ ہر شے اپنی جگہ پر تھی۔ اس کے لبوں پر مسکان ابھر آئی۔

"اپنا گھر پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ دنیا جہاں کی خوب صورتی ایک طرف اور گھر کی خوب صورتی ایک طرف جو سکھ یہاں آکر ملا' وہ اتنا سفر کر کے اور پیسہ خرچ کر کے بھی نہیں ملا اور پھر تم۔۔۔"

وہ بھی خوش گوار موڈ میں اندر آیا تھا اور اسے مسکراتا دیکھ کر بشاش ہو گیا۔ اس نے آگے ڈالے بال

پیچھے پھینکے تب وہ اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ اوٹ سے منہ نکال کر بالوں سے اٹھتی بھینی بھینی مہک کو اندر اتارتے ہوئے آئینے میں خود کو اور اسے دیکھنے لگا۔
"تمہاری یہ حالت میرے لیے عذاب کی طرح ہے اور مجھے قصوروار بتاتی ہے۔ تب میرا جی چاہتا ہے میں خود کو ختم کرلوں اور ..... کہ سب دکھوں کا کارن شاید میں ہی۔" اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ جملے کا گلا گھٹ گیا۔
"ایسا مت کہو۔ میری حالت کو کچھ نہیں ہوا اور اگر ایسا کچھ ہے بھی۔۔۔ تو اس سب میں تم بہرحال کہیں نہیں ہو۔ میرے مجرم کوئی اور لوگ ہیں۔"
دونوں کے مکالمے نے ماحول پر چھایا فسوں توڑ دیا۔ دونوں ہی کو احساس ہوا۔
"اوں ہوں ..... اب موڈ مت بدلو اپنی بات کرو اور میری۔۔۔ بس میں ہوں نا اور تم بھی ہو بس کافی ہے۔"
اس کی یقین دہانی پر اس نے آنکھیں موند کر اس کے شانے پر سر ٹکایا تو وہ اسے لیے آگے بڑھنے لگا۔
ٹھنڈی ہوا نے اس کے جسم کو چھوا تو جسم میں پھریری سی دوڑی۔ وہ چونکی۔
"ارے ہٹو' کوئی دیکھ لے گا۔" وہ گھبرائی اور کسمسائی۔
"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔" وہ مسکرایا تھا۔
"وہ تو مجھے معلوم ہے ہی۔" وہ ہنسی تھی' مگر آواز گھٹ گئی۔ اس نے کسی کے دیکھ لینے کا خدشہ یونہی "تناز" میں کہا تھا۔ سب کچھ فراموش کرکے۔۔۔ مگر۔۔۔
واقعی۔۔۔ اس کا خدشہ حقیقت کا روپ دھار گیا تھا۔ "کسی نے دیکھ لیا تھا اور وہ "کسی" کون تھا؟ اس کے پورے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔ شدید سردی میں بھی اسے لگا کہ اس کے جسم سے پسینہ پھوٹتا ہے۔
تینوں کی نظریں باہم ٹکرائی تھیں۔ "اوہ" وہ اسے ذرا سا خود سے دور کرتے ہوئے کھڑکی کے پٹ بند کرنے لگا۔ اس کی شدید گھبراہٹ اور فق رنگ کو اس نے "کسی کے دیکھ لیے" جانے سے تعبیر کیا تھا۔ وہ اس سے الگ ہو کر بیڈ پر جا بیٹھی اور ہانپنے لگی۔
پٹ بند کرتے ہوئے اس نے سامنے موجود شخص کو سرسری سا دیکھا تھا جو بینچ پر بیٹھا کتاب بینی کر رہا تھا اور ایک بار پھر سر جھک گیا تھا۔ کوئی پڑھنے کا شائق' پرسکون ماحول کا خواہش مند۔
"کم آن یار۔۔۔ بیوی ہی سے رومانس کر رہا تھا۔" وہ اسے گدگدانے لگا۔
"ڈرتی کیوں ہو؟"
وہ ذرا شانت نہ ہوئی۔ روشن دن میں وہ بہت دور تھا' مگر اس کی آنکھوں کی سرد مہری نے اس کے وجود کو ٹھٹھرا دیا تھا۔
خوف کا ایک کارن۔۔۔ اسے وہ آنکھیں اجنبی نہیں لگی تھیں اور پہلے ہاں پہلے اسے وہ ناک اجنبی نہ لگی تھی اور اب۔۔۔
"تم تو بالکل یخ ہو گئی ہو۔ میں تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر لاتا ہوں۔ بے وقوف۔" وہ اس کے سر پر چپت لگاتا باہر کو نکلا تھا۔



پڑ جایا کرتے تھے اسے ایسے قنوطیت کے دورے۔۔۔ جب وہ ہر شے سے بے زار دن رات کی ترتیب بھول جاتی تھی۔ پریشان حال۔۔۔ خاموش۔۔۔ چڑچڑی۔۔۔ یا پھر خالی آنکھوں سے گردوپیش کو اجنبیت سے تکتی۔ ایسے حال میں اسے اپنی کوکھ سے پیدا کیے بچے تک بھول جاتے۔
اور جب بھی وہ ان حالوں میں ہوتی وہ اسے قطعاً" نہ چھیڑتا۔ تاوقتیکہ وہ خود ہی نہ ابھر جائے۔ سوچوں کا اژدہام' ملال' یاد۔۔۔ دکھ۔۔۔ اور نم آنکھیں۔۔۔ نہ وہ نظریں چراتا تھا نہ جھاڑتا تھا اور نہ ہی تسلی کے لیے آراستہ جملوں کا ڈھیر لگا دیتا۔ بس اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے گرم جوش ہاتھوں میں بھینچ کر انہیں تھپکنا شروع کر دیتا اور نگاہوں کی زبان سے یقین دلاتا تو وہ دھیرے دھیرے شانت ہونا شروع ہو جاتی۔

اور اب تو کتنے عرصے سے وہ ایسے ہی کسی موڈ کے زیراثر تھی اور پہلے سے زیادہ پریشان دکھائی دیتی تھی۔ کسی ادھیڑبن کا شکار اس کا برتاؤ عجیب سا ہو گیا تھا۔ وہ تحمل سے وقت کے گزرنے کا انتظار کرتا تھا' مگر اس بار سچویشن کچھ اور تھی۔
"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ہم اس شادی میں ضرور چلیں گے۔ میں سب سے کہہ چکا ہوں پلیز۔۔۔" بزنس پارٹنر کے بچوں کی شادی تھی۔ وہ کہیں آنا جانا پسند نہیں کرتی تھی' مگر اس نے خود ہی جوش کا مظاہرہ کیا تھا اور تیاری کی تھی "عرصہ ہی ہو گیا کوئی اچھی سی شادی اٹینڈ کیے ہوئے۔"
"تم بچوں کو لے جاؤ۔"
"جائیں گے تو سب ورنہ۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔" اس کا جملہ ضدی تھا' مگر لہجہ اور تاثرات نارمل۔ وہ جبراً" مسکرا دی۔
"اچھا' میں چلوں گی۔۔۔" اس نے سر ہلا دیا۔ لہجے میں بشاشت پیدا کی تھی۔
"اوکے۔۔۔" وہ بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ شادی میں جانا اتنا اہم نہیں تھا' مگر وہ چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اپنے خول سے باہر نکلے' کچھ لوگوں سے ملے' بات کرے' خوشی محسوس کرے۔
تیاری تو اس نے بہت پہلے سے مکمل کر رکھی تھی۔ بہت عرصے بعد کہیں جانے کا اتنا مزہ آیا تھا۔
بیڈ پر اس کے سنگھار کے تمام لوازمات پڑے تھے۔
لباس' میک اپ بکس' زیور جوتے۔ خوشبو۔ پھول۔
اس نے سارے بالوں کو سختی سے جوڑے میں کس کے سر کے عین اوپر چھوڑ دیا تھا کہ جاتے سمے برش لگا کر کھلا چھوڑ دے گی۔
زیورات کے کھلے ڈبوں میں سے اس نے بہت قدیم ڈیزائن کے بھاری سونے کے جھمکے پسند کیے جس کے دنئی بڑے کٹوروں پر سرخ موتی لٹک رہے تھے۔
وہ ایک ڈبیا کھول کر کچھ نکال رہی تھی۔
"یار! کیا تم یہ ایک ٹاپس پہنو گی؟" وہ مکمل تیار تھا اور آرام کرسی پر بہت آرام دہ حالت میں بیٹھا نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
وہ آج بھی ساحرہ تھی جس کے منتر کا مارا پانی مانگنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ ایڑیاں رگڑتا ہے۔ اور موت دور کھڑی ہاتھ ہلاتی ہے۔
مگر وہ بڑا سخت جان تھا۔ جلا ڈالو۔ پھونک دو مگر بس سامنے رہو۔ رہنے دو۔
"یہ جھمکے اچھے لگیں گے۔ یہ ٹاپس تو بہت چھوٹا ہے' دکھائی ہی نہ دے گا۔" اس نے آگے بڑھ کر کچھ حیرت سے سوال کیا تھا۔
"ہائیں؟" وہ چونکی اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ میں موجود ڈبیا کو۔ اس پر چہرے کا استعجاب۔ وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس دی اور ہنستی چلی گئی۔ وہ سوال بھول کر اسے ہنستا دیکھنے لگا۔ کتنے دنوں بعد وہ ایسے ہنسی تھی۔ کبھی تو اسے یوں ہی گمان ہوتا تھا کہ شاید وہ ہنسنا بھول گئی ہو۔
ایسی بے خود ہنسی۔
"یہ ٹاپس نہیں ہے۔" اس نے ڈبیا لے لی۔ "یہ ناک کی لونگ ہے۔"
"اتنی بڑی لونگ۔ ناک سے بھی بڑی۔" اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔
"آج کل فیشن میں ہے حضور۔!" وہ اپنی ناک کی بے حد نازک ڈائمنڈ لونگ اتار رہی تھی۔ "کیا بری لگے گی۔"
"تم پر کوئی شے بری لگ سکتی ہے بھلا۔؟" وہ دوبارہ نیم دراز ہو کر اپنے مشغلے میں مصروف ہو گیا۔ (اسے دیکھنے' نثار ہونے کے)
لونگ اتارتے وہ شل ہو گئی اور جب لونگ اتر گئی۔ تو ناک سرخ سرخ ہو چکی تھی۔
"اچھا پتا نہیں یہ نارمل حالت میں کب آئے گی۔" اس نے آئینے میں ناک کو دیکھ کر سوچا۔
وہ ناک کو سہلانے لگی۔ دفعتاً" اسے بہت عجیب

سا احساس ہوا۔ آئینے سے جھانکتی آنکھیں اوران میں آئی درشتی اس نے کہیں دیکھ رکھی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے۔ اس نے بھنویں مزید سکوڑیں اور شعوراً" چہرے پر سرد مہری سی طاری کی۔ منہ سے خارج ہوتا سانس کہیں حلق میں اٹکا رہ گیا۔ اس نے بہت عجلت بھرے چونکتے انداز میں اپنی ناک کو چھوا۔

(جیسے پھولوں کے کنج سے۔ ببر شیر اچک کر نکلا ہو) وہ اچھل پڑی۔ اس کا بے حد خوف زدہ ہو کر وہ پیچھے کی جانب سرکنا اسے خود بری طرح محسوس ہوا۔ اس نے کسی دیوانے کی طرح اپنے خدوخال کو ٹٹولا۔ انکشاف۔ اس نے اپنی ناک کو چھوا۔ سیدھی تیکھی مغرور ناک۔ بہت خوب صورت ناک۔

(وہ بے ساختہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر نفی میں سرہلانے لگی۔ اسے آئینے میں اپنا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے کسی اور کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

ایک آشنا چہرہ۔

اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی آنکھوں کو دیکھنا شروع کر دیا اور اپنی چیخ کو روک نہ پائی اس کی وہ زور زور سے نفی میں گردن ہلانے لگی اور وہ جو اسے نثار ہوتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بری طرح چونکا۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کس اذیت اور تکلیف میں یکدم مبتلا ہو گئی تھی۔ ایسی روح کھینچ لینے والی تکلیف۔ اسے اچانک کیا ہو گیا تھا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس تک آیا تھا وہ اسے تھام کر شانت کرنا چاہتا تھا حالانکہ خود بولایا ہوا تھا۔ کیا ہوا۔ کیا ہو گیا تمہیں کیا ہوا۔

ریلیکس۔

وہ جتنا شانتی کا درس دے رہا تھا وہ بپھری جاتی تھی جیسے اس کے پیروں کے نیچے پانی ہو اور پانی میں کرنٹ چھوڑ دیا ہو۔ وہ خود کو چھڑا کر پھر ایک بار خود کو دیکھنے لگی۔

اپنی آنکھوں کو۔ اور۔ اور۔ اپنی ناک کو۔ بے حد خوب صورت ناک اس نے کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنی ناک کو چڑھا کر دیکھا۔

وہ تیر کی سی تیزی سے کھڑکی تک آئی اس نے اتنی زور سے پٹ کھولا تھا کہ چھناکے کی آواز سے شیشہ گر کے چکنا چور ہو گیا۔ وہاں سامنے نہر کے کنارے پر وہ۔ وہ موجود تھا۔

اس کی چیخیں اور پورے وجود کی کپکپاہٹ۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بھاگی تھی۔

اس کے شانے پر سیاہ اسکارف تھا۔ ننگے پیر اس نے بیڈ روم کا دروازہ دھاڑ کی آواز سے کھولا تھا۔ وہ کاریڈور سے بھاگی۔ وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتری۔ گرتے اسکارف کو اب ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

وہ اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر۔ وہ اسے پکار رہا تھا جو کچھ نہیں سن رہی تھی۔ بھاگی جارہی تھی۔ وہ گھر کے اندرونی دروازے سے نکل کر ڈرائیو وے میں بھاگ رہی تھی۔ اس کا بھاگنا اور بے تحاشا رونا چوکیدار مین کے لیے شدید ترین اچنبھے کا باعث تھا۔ اور پیچھے بھاگتا صاحب۔

وہ روڈ کراس کر چکی تھی۔ اس کے بال کھل کر بکھر گئے تھے۔ اس نے کچی زمین پر جہاں کہیں کہیں لمبی گھاس تھی پاؤں رکھ دیئے تھے۔ وہ سامنے تھا۔ اس کی رفتار تھم گئی اور وہ پھٹی آنکھوں سے سامنے موجود شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ آنسو تھے..... دکھ تھا۔ اور خوشی بھی تھی۔ مگر سب سے حاوی تھا شدید ترین بے یقینی کا احساس۔

ایک ساکت پل یوں تھا جیسے کائنات کا ہر ذی روح بے روح ہو گیا ہو۔

اور بس وہ دو انسان زندہ ہوں۔

وہ یکدم کسی جنونی کی طرح آگے بڑھی تھی۔

اس نے جیکٹ کا الٹا کالر گرا دیا تھا۔ اس نے کن ٹوپ اتار کر پھینک دیا۔ سلکی بالوں والا سر برہنہ ہو گیا تھا۔

اور وہ سرد آنکھیں۔

اور وہ بہت خوب صورت ناک۔
اس نے آگے ہو کر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے اور یہ ساری حرکت اس کی جانب سے تھی۔
وہ بس ایک بت کی طرح ساکت تھا۔ جیسے اس نے خود کو اس کے اوپر چھوڑ دیا تھا۔
برداشت کی حد ختم ہو گئی۔ صبر کا خاتمہ۔ وہ ٹوٹی شاخ کی طرح اس پر گری تھی۔ اس سے لپٹی تھی۔ لپٹے لپٹے گھوم گئی۔
وہ اسے چوم رہی تھی۔ اس میں سما جانا چاہتی تھی۔ اسے خود میں سمو لینا چاہتی تھی۔
اس کی آنکھوں سے اتنا پانی بہہ رہا تھا جتنا کہ سامنے کھالے (نہر) میں بھی نہیں تھا۔
وہ اتنا چیخ رہی تھی کہ صبح دم چلاتی چڑیاں بھی ہار مان لیں۔
وہ اسے یوں ٹٹول رہی تھی۔ جیسے ریت کے ٹیلے پر گرا آنسو ڈھونڈتا ہو۔ وہ اسے پکار رہی تھی۔
"کاشان۔ کاشی۔ کاشان۔ میرے بھائی! میرے منے۔ میرے لاڈلے۔ میرے گڈے کاشان۔ میرے سوہنے شہزادے۔" وہ چلاتی جاتی تھی۔
"میرے پالے گڈے۔ میری بچے۔" اس نے اپنے نم ہونٹ اس کے گال پر جوڑ دیے وہ اسے بے تحاشا چوم رہی تھی۔ ان گالوں پر ہلکا سنہرا رواں تھا اور ہونٹوں کے اوپر بھی۔ وہ کسی بھی شرارت کے بعد جب بھاگتا آتا تھا اور اس سے چپکتا تھا تب اس کا سر اس کے پیٹ سے ٹکراتا تھا۔ پھر جب اس نے ذرا قد نکالا تو وہ اس کے سینے میں سما جاتا تھا۔
آج اس کا منہ چومنے کے لیے اسے ایڑیاں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔
چھ سال میں اتنا فرق تو آ ہی جاتا ہے ناں۔
اس کے پیچھے بھاگ کر آتا جاذب سلطان وہیں رک گیا تھا۔ پھر وہ رخ پھیر گیا۔
ہوتا ہے بعض اوقات کائنات اس پل کو بھی دیکھتی ہے جب جانداروں کے اژدہام میں صرف دو انسان زندہ ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیسی ضد ہے کاشان... تین گھنٹے کی مشقت۔" اس کا جسم تکان تکان چیخ رہا تھا۔ وہ ہر بار نیا جملہ سجا کر اسے پہلے سے کہیں زیادہ دل گیر' منت بھرا' شکست خوردہ رو دینے والا کہتی تھی۔
مگر جواب میں ایک لفظ "نہیں"
وہ گردن کو ہر بار نفی میں ہلا دیتا تھا۔ ایسے جیسے اس کے علاوہ اور کچھ حرکت جانتا ہی نہ ہو۔
اور اس پر بے پناہ بے تاثر چہرہ... اس کے رونے چیخنے' پیٹنے لپٹ جانے چومنے کے باوجود وہ کسی پتھر کے بت کی طرح ایستادہ رہا تھا۔
کہاں کی تقریب ولیمہ اور اس کا بناؤ سنگھار... جانے کی جلدی و جوش وہ سب بھلائے تین گھنٹے سے اس کی منتیں کرتی تھی جو جنبش کا بھی روادار نہیں تھا۔
ایک بے حد ٹھنڈی برف جیسی شام جو رات میں ڈھلنے لگی تھی۔
"تم اتنے ضدی تو کبھی نہیں تھے۔ دیکھو' سردی کتنی بڑھ گئی ہے اور رات سر پر پڑنے کو ہے۔" اماں حمیداں اسے جاذب سلطان کی ہدایت پر کب سے گرم شال دے گئی تھیں۔
جاذب سلطان بڑے دنوں سے تاباں کے حالات دیکھ رہا تھا۔ اس کا کھویا کھویا پن' اس کی الجھن اور ان چھ سالوں میں اس پر کئی بار ایسے دورے سے پڑ جایا کرتے تھے جب وہ خاموش ہو جاتی تھی۔ راتوں کو جاگا کرتی یا رو رو کر پوٹے سجا لیتی تھی اور دنوں لگ جاتے تھے ابھرنے میں نارمل ہونے میں... ایسے میں وہ اسے چھیڑتا نہیں تھا۔ اسے پوری سپورٹ دیتا کہ وہ خود ہی اس کیفیت سے نکلے کہ اس جنونی محبت و عشق کی سچائی کے باوجود... تمام تلخیوں اور حقیقتوں کے باوجود... کون مجرم اور کون بے قصور۔ اس بحث سے پرے وہ ان سب جدائیوں کا ایک سبب ضرور تھا۔
یہاں تک کہ وہ خود نارمل ہو کر زندگی گزارنے لگتی اور جیسے سب بھول کر "حال" میں مگن ہو جاتی۔

لیکن اس بار وہ سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر وہ بتا دیتی وہ کھڑکی میں کھڑے شخص سے خوف زدہ ہے تو وہ فوراً" جاتا اور ایک پنچ مار کے اس شخص کو مٹی چاٹنے پر مجبور کر دیتا مگر تاباں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں کوئی چیز اسے روکتی تھی۔
لیکن تین گھنٹے پہلے جب وہ حواس باختہ' ننگے سر ننگے پیر اندھا دھند نیچے بھاگی تھی تب وہ اس کے پیچھے تھا اور پھر جب وہ اس سے لپٹی اور زارو قطار رونے لگی اور اسے پکارنے لگی تو وہ اس کے نام کی پکار سے پہلے اسے پہچان چکا تھا اس نے چھ سال پہلے اس نو سال کے بچے کو بارہا تاج ہاؤس کے باہر دیکھا تھا۔
وہ بنا بنایا تاباں مجاہد تھا۔ ویسے ہی بال... آنکھیں اور ناک...
تاباں اس سے لپٹی اور بکھرے بگڑے جملوں میں مسلسل کچھ کہتی جاتی تھی۔
تاباں اس کی جند جان... وہ دونوں اس پوری دنیا میں ایک دوسرے کے لیے تھے۔ چھ سالوں میں اس نے ایک پل کے لیے بھی اسے خود سے جدا نہیں کیا تھا۔
ماسوائے وہ دس روز جب وہ حیدر سلطان حیدر کے کوما میں ان کے ساتھ تھا اور وہ دس دن کیسے عذاب بن کر ان پر ٹوٹے تھے۔
مگر اس پل اسے لگا' وہ ان دونوں کے بیچ کہیں نہیں ہے اس منظر میں جاذب سلطان کی کہیں جگہ نہیں تھی وہ خاموشی سے روڈ کراس کر کے گھر کی طرف پلٹ گیا اس نے گیٹ مین کی شدید مستعجب نگاہوں کو دکھ سے دیکھا اور سر جھکائے لان چیئر پر براجمان ہو گیا اس نے گیٹ کو کھلا رکھنے کا کہا تھا۔
سرمئی شام نے جب رات کا سیاہ لبادہ اوڑھا تب وہ دونوں فقط سایہ نظر آنے لگے۔ مگر جاذب سلطان کی نگاہیں اندھیرے سے مانوس تھیں اور پھر یہ بھی کہ اس کے لیے جہاں تاباں ہوتی تھی روشنی خود بخود ہو جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کاشان! سنتے کیوں نہیں...!" وہ بینچ پر اس کے

برابر سی تھی۔ اس نے ہنستے تو دھیرے سے پوچھا۔

"رات ہو گئی شانی... سردی بڑھ گئی... اندر چلو ناں..." وہ رو دینے کو تھی۔

"رات..." اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر گردوپیش کو دیکھا پھر عجیب سی مسکراہٹ سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ "رات تو چھ سال پہلے ہو گئی تھی۔ ایسی رات جسے سویرا نصیب نہیں۔"

"اور ٹھنڈ..." اس کا لہجہ اذیت سے پر ہو گیا۔

"اب کوئی شے اثر نہیں کرتی آپا... اب کسی شے سے ڈر نہیں لگتا۔" اس نے ٹھنڈا سانس لینے کو منہ کھول دیا۔ بھاپ کا ایک مرغولہ سا ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

"شانی...! نہیں۔" تاباں ایک بار پھر بے حد و بے حساب رونے لگی تھی۔ اس کے جملے اور لہجے کا ٹھہراؤ اس کے لیے حیران کن تھا۔

وہ جو بات بے بات ضد کرتا تھا اور اپنی منواتا تھا اور اس کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ آج کیسے بے حس و حرکت پڑا تھا۔

"جب مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔ پہچان گئے تھے تو پکارا کیوں نہیں... اندر کیوں نہیں آئے؟ ٹھہرے کیوں نہیں؟ آواز کیوں نہیں دی تاباں آپا!"

وہ ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ گردن گھما کر اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔

"جب اندر نہیں آنا تھا، ملنا نہیں تھا تو آتے ہی کیوں تھے۔ کیوں آئے آج بھی...؟" اس نے یک دم اپنا بڑا پن جتاتے ہوئے ڈپٹا تھا۔ اسی مان و انداز سے جب وہ بہت چھوٹا سا تھا پیارا سا گپلو... سنہرا سنہرا سا...

"کس نے کہا کہ میں اندر آنے کے لیے یہاں آ کر کھڑا ہو جاتا تھا؟" اس نے الٹا سوال کر دیا تو اس کے لہجے میں آنے والی تضحیک پر وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"مجھے تو بس اس طرح آ کر کھڑا ہونا تھا کہ کھڑکی سے نظر آ جاؤں۔ نظر آتا رہوں۔"

وہ بہت نرمی سے، بہت اہتمام سے تیار کردہ جملہ کہہ رہا تھا۔ تاباں خاک نہ سمجھی۔

"کیا مطلب... کیا کہہ رہے ہو۔"

وہ اس کے چہرے پر گہری نگاہ ڈال کر کھڑا ہو گیا، رخ پھیر لیا۔ وہ نہر کے شانیے کی صورت دکھائی دیتے پانی کو دیکھنے کی سعی میں تھا۔ اس نے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور نہر کے پانیوں میں دے مارا۔

چھپاکے کی آواز ابھری معدوم ہوئی اور پھر شانتی...

"کھڑکی سے باہر نظر آتے ایک شخص کو دیکھ کر آپ نے وہ فیصلہ کیا تھا۔ صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کھڑا دیکھ کر آپ کیا فیصلہ کریں گی؟ اس کی بے چینی، ثابت قدمی، بے خوف خطر ہونا آپ کو اتنا بھایا کہ آپ ہر شے کو بھول کر اس کے ساتھ چلی گئیں... اب آپ کے سامنے وہی صورت حال ہے۔ اب آپ کا فیصلہ کیا ہے؟"

کاشان مجاہد کو اپنے تمام جملے یاد تھے۔ اس نے جیسے سالوں کی محنت سے یہ سوال نامہ اور آپشن ترتیب دیے تھے اور تاباں سکتے میں آ گئی تھی۔ وقت نے اس کے سامنے ہمیشہ مشکل سوال رکھے تھے۔

"پانچ ماہ سے دن رات موسم و حالات کی تفریق کیے بنا یہاں آ کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ دیکھوں آپ میرے لیے کیا کر سکتی ہیں... مگر... آہ... (وہ طنزیہ مسکرایا خود پر) آپ تو پہچان ہی نہ سکیں۔"

"میں نے پہچان لیا تھا شانی!" اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔

"کھڑکی سے باہر کھڑے ایک اجنبی شخص پر اتنا یقین آ گیا کہ ماں باپ کی عزتوں پر پیر رکھ کے نکل پڑیں اس کی محبت اور ثابت قدمی نے سب اپنوں کی محبتوں پر پانی پھیر دیا۔

میں نے وہی چلن اختیار کیا... جو اس نے کیا تھا۔ اس نے محبت مانگی آپ نے دے دی۔ میں عزت مانگنے آیا ہوں آپا... دیں گی؟ دے سکیں گی؟ بہت پسند آیا تھا آپ کو جاذب سلطان کا طریقہ۔" وہ سر پر ہاتھ رکھ کے رونے لگا۔

میں نہیں جانتا، محبت کے بغیر زندگی کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ عزت کے بغیر زندگی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔" وہ اپنی لہو رنگ آنکھیں اس پر گاڑ کر بول رہا تھا۔ "کیونکہ ہم سب اس اذیت کو ہر پل جھیلتے ہیں۔"

"ایسا نہیں تھا کاشان! ایسا بالکل نہیں تھا۔ تم کچھ نہیں جانتے۔" وہ ہارے قدموں سے بینچ پر گری تھی۔

"کھڑکی سے باہر کھڑے ایک شخص پر آپ نے عزت لٹا دی۔ کھڑکی سے باہر کھڑے دوسرے شخص کو آپ عزت لوٹا سکتی ہیں؟"

"میں نے کھڑکی سے باہر کھڑے شخص کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کاشان!" وہ کراہی۔

"اور صرف ایک باپ یا بھائی کی دشمن نہیں تھیں آپ... آپ نے سب کی زندگیوں کو، خوابوں کو، خوشیوں کو لوٹ لیا دولت گئی... عزت گئی... اور نام بھی... ہم میں سے کچھ جیتے جی مر گئے اور کچھ سچ مچ دنیا سے اٹھ گئے اور آپ..."

"ک... کون...؟" تاباں کا رواں رواں کھڑا ہو گیا اسے بس آخری لفظ یاد رہے تھے۔ "مجھے بتاؤ شانی کون...؟"

"میری امی مر گئیں آپا...! میری امی... اور میرے ابا جی..." وہ ایسی بین ڈالنے والی آواز میں چلایا جیسے ابھی ابھی جنازہ اٹھا ہو۔

"امی... اللہ!"

اس کا چہرہ اتنا سفید ہو گیا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ دونوں ہاتھوں سے ہونٹ ڈھانپ کر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کاشان کو دیکھ رہی تھی جو نجانے آج کیا کیا کہنے والا تھا۔

"اور... اور اس غلط فہمی کا شکار مت ہوئیے گا کہ آپ کی جدائی نے انہیں بے حال کر دیا تھا۔ آپ کے ہجر نے انہیں موت سے ہمکنار کر دیا، نہیں... مر جانے کے لیے دوسری بہت سی باتیں تھیں اور اتنی ساری تھیں کہ انہیں زندگی سے بڑھ کر موت اچھی لگنے لگی۔

آپ کو پتا ہے جب جب رضوان بھائی اور عمران بھائی باہر سے کسی سے بھی آپ کا ذکر سن کر آتے تھے تب نازاں اور افشاں باجی... تھپڑوں، گھونسوں ٹھوکروں پر دھری جاتیں۔ رضوان بھائی نازاں آپا کو اتنے طعنے دیتے تھے اتنے طعنے کہ ان کا جگر چھلنی ہو گیا وہ دل کی مریض بن گئیں۔ امی ان کی اور وہ دونوں امی کی صورت دیکھنے کو ترس گئیں۔

ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب امی نازاں باجی کا حال پوچھنے چلی گئیں تو خالہ نے دروازہ نہیں کھولا، کہا رضوان عمران کے آنے سے پہلے چلی جاؤ... اگر جو انہیں خبر ہو گئی تو حشر اٹھا دیں گے اور انہوں نے کہا کہ اگر یہ دونوں... تاج ہاؤس کے کسی بھی فرد سے ملیں تو اسی وقت اس پر طلاق لاگو ہو جائے گی۔

آپ کو پتا ہے، ضوفشاں آپی نے پورے کالج میں ٹاپ کیا۔ انہیں اعزازی شیلڈ سے نوازا گیا۔ ان کی محنت اور دعائیں رنگ لے آئیں۔ اخباری نمائندے گھر تک آئے تھے، نگران سے کہہ دیا گیا، وہ شہر سے باہر ہے۔ ابا نے گیٹ پر تالا ڈلوا دیا۔

اور وہ جو حقوق و فرائض کی باتیں کرتی تھیں، بولنا بھول گئی تھیں، مگر ہمت کر کے گئی تھیں ابا کے پاس... اور انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا اور ابا کا جواب ایک تھپڑ تھا۔ آپ کے ہر عمل کا انہیں شریک ٹھہرایا گیا۔ وہ رو رو کر کہتی تھیں ابا میں جھوٹ نہیں بولتی... ابا میرا اعتبار کریں۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

ابا نے کچن میں جا کر دونوں چولہے ایک ساتھ جلائے اور وہ موٹی موٹی کتابیں جن کے حرف حرف آپی کو ازبر تھے۔ چولہے کے اوپر رکھتے جاتے تھے۔

"یہ بنے گی ڈاکٹر، اسے بنائیں ہم ڈاکٹر... تاکہ یہ نیا چاند چڑھائے۔"

پتا ہے نا وہ کیسی مدلل اور دوٹوک بات کرتی تھیں۔ اپنی رائے پر کاربند... وہ صحیح ہیں تو یہ کافی ہے۔ اب اسے کوئی انچ سرکا کر دکھائے۔ وہ جانتی تھیں کہ کوئی نہیں مانے گا، مگر ہر روز صبح نئے عزم سے اپنی

درخواست لے کر پہنچ جاتی تھیں۔ ان کی درخواست میں ہر روز نئے جملے ہوتے تھے جیسے ہر رات وحی اترتی ہو..... مگر آگے سب کے دلوں پر مہر لگ گئی تھی۔ کوئی نہیں سنتا تھا۔ اندھے بہرے گونگے لوگ.....

اور اب وہ شکیل بھائی کے سامنے تین حرفی جملہ بھی نہیں بول پاتیں ان کی زبان میں لکنت سی آ گئی ہے۔ وہ یہ تک نہیں پوچھ سکتیں کہ آج کیا سبزی بنائی ہے یا بچوں کو دوا دلوا دیں اور بچوں کا بھی کیا ذکر، وہ بیٹے کو ساتھ لگائے پھرتے ہیں اور بیٹیوں کو یوں دیکھتے ہیں جیسے برہمن پجاری اچھوتوں سے کنی کترا کر گزرتا ہے۔"

"شش..... شکیل کا کیا ذکر..... ضوفی کی بات میں..... کس کی بیٹیاں؟" کاشان کا ہر نیا انکشاف سر پر تلوار کی کاری ضرب بن کر لگتا تھا۔ یہ پہلی بار ہوا کہ بلبلا کر چلائی تھی۔

"شکیل کا ذکر....." کاشان کے چہرے پر اذیت رقم ہو گئی۔ اس نے آسمان کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی اسکرین پر دل پہ ہاتھ رکھ کے گرے مجاہد تاج کو ایک دنیا نے دیکھا تھا۔ ناآشناؤں نے بھی اور آشناؤں نے بھی..... ہر بندے نے اس قیامت کو اپنے حساب سے جھیلا تھا اور جواب دیے تھے۔ شکیل نے جمیل کی شادی کا بتاتے وقت اپنے نکاح کا بھی بتایا تھا۔ دوستوں نے پوچھا۔

"تایا کی وہ بیٹی تو نہیں نکلی ناں جو تیرے نام کی تھی؟" اس نے صاف انکار کیا اور بات کو ثابت کرنے کے لیے بے حد ناپسندیدگی، نفرت کے باوجود ضوفشاں مجاہد سے شادی کا اعلان کر دیا۔

اسے اپنی عزت بچانی تھی اور تاباں مجاہد کی بہن سے بیاہ کر کے اپنے اندر کے انتقام اور ہتک کے احساس کو شانت کرنے کی سعی کی تھی (سعی لاحاصل..... اس مشقت نے ضوفشاں کو ختم کر دیا تھا۔ عزت شاید بچ گئی۔ ضوفی نہ بچی..... انتقام ہر نئی صبح کی طرح تازہ دم طلوع ہوتا تھا)

وہ اس کی ٹھوکروں کی زد میں رہتی..... اس کے طنز کے تیر سہتی..... اسے بولنے کی آزادی نہیں تھی۔ باتیں کیا خاک کرتی۔ رائے دیتی، اختلاف کرتی یا فیصلہ دیتی۔ وہ تو سب خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ اور کوئی نہیں تھا جو اسے روک سکے..... بازپرس کر سکے۔ وہ اسے جوتی کی نوک پر رکھتا روتی تو چپ رہنے کی تادیب کرتا۔ چپ رہتی تو رلاتا (ہر حربے سے)

وہ اذیت پرست ہو چکا تھا اور ضوفشاں مجاہد اذیت پسند.....

رانیہ، سونیا کو میٹرک بمشکل کرنے دیا گیا۔ شکیل رات ایک بجے اٹھ کر ان کا دروازہ بجائے بغیر اندر گھس جاتا اور بیگ کھولنے لگتا۔ کاپیوں کتابوں کے ورق پھڑپھڑاتا ان کے تہہ شدہ کپڑے زمین پر پٹخ دیتا اور جھاڑتا کہ کوئی کاغذ..... رقعہ..... کوئی پوشیدہ چیز..... عقیل ہمراہ ہوتا اور باقی سب کی چپ تائید کی مظہر..... اس گھر کی لڑکیاں اسی سلوک کی مستحق تھیں۔

ضوفشاں پانچ سالہ شذرا اور چار سالہ خضری کو ابھی تک اسکول میں داخل نہ کروا سکی تھی۔ وہ شکیل ساجد سے کیسے کہہ پاتی..... زبان کھولنے کے احساس ہی سے جسم کی ہڈیاں درد کرنے لگتی تھیں۔

لکنت زدہ..... گھبرائی..... سراسیمہ..... چھائیوں بھرے چہرے والی ضوفشاں ساجد کو دیکھ کر کوئی یقین نہ کرتا، یہ وہی ضوفشاں مجاہد ہے۔ جو حق بات ببانگ دہل کہا کرتی تھی اس نے سچ کہہ دیا ہے اور وہ ایک انچ نہ سرکے گی۔

اور ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والا منظر اور مسلسل چلنے والی پٹی مائدہ مشاہد کے منگیتر اور سسرال والوں کی نظروں سے بھی گزری تھی۔

امتحان میں وہ بھی پڑ گئے تھے۔ مگر ان کے پاس نکل جانے کی ایک آسان صورت تھی۔ انہوں نے راستہ بدل لیا — کارڈ بٹ چکے تھے۔ فرنیچر و دیگر اشیا بک کروائی جا چکی تھیں۔ بہترین کھانے کے لیے ایڈوانس دیے جا چکے تھے۔ پیچھے ہٹنے کو کوئی صورت نہیں..... سو تازہ تازہ رنڈوے تین بچوں کے دوگنی عمر کے شخص

سے مائدہ مشاہد کو بیاہ دیا۔ جو ہر پل پوچھتا تھا۔

"منگیتر یاد تو آتا ہو گا، یہ سارے لباس جو تم پہنے پھرتی ہو خریدتے وقت اسی کی سراہتی نگاہوں کو ذہن میں رکھا ہو گا۔ مجھے تم پھر کیسے اچھی لگو؟"

ایک عذاب، ایک تباہی، ایک مسلسل بربادی۔

مائدہ مشاہد سلائی کی ماہر تھی۔ سینے ادھیڑنے کے فن میں طاق..... مگر وہ کپڑے کو ادھیڑنے سے واقف تھی۔ مگر لوگ روح کو ادھیڑنا بھی جانتے تھے۔

اور تایا جی کو مائدہ مشاہد کا غم لے ڈوبا۔ داماد نامی وہ بلا..... کسی عفریت کی طرح لپٹی تھی۔ وہ جوان سب کے سامنے کچھ بھی کہنے سننے میں پاس نہ رکھتا تھا تنہائی میں تو.....

مسجد میں باجماعت نمازیں ادا کرنے والے مجاہد تاج پھر کبھی مسجد نہ گئے۔

جن مجالس میں وہ فیصلہ ساز تھے، وہاں ان کا ذکر اب بھی ہوتا مگر اب وہاں وہ صرف تاباں مجاہد کے باپ کے نام سے جانے جاتے تھے۔

جب دونوں بھائیوں نے کاروبار پر توجہ کم کی تو وہ ٹھپ ہونے لگا۔ جمیل اور شکیل اب کرتا دھرتا۔

اور آپ کو پتا ہے، مجھے اپنی عزت کتنی پیاری تھی اور کمتری کا کسی قسم کا احساس میرے لیے موت جیسا تھا، میں لفظ ہار کی ذلت نہیں سہہ سکتا تھا۔

بہت بچپن سے ابا جیسا بننا چاہتا تھا۔ سب مجھے سلام کریں، صرف سلام نہیں میں اپنے کام بھی اچھے رکھتا تھا۔

دوستوں کے گروپ میں ہمیشہ لیڈر تھا اور سب کو میری بات ماننا ہو گی اور کوئی میرے فیصلوں سے منع نہیں کرتا تھا۔

اور آپ کو پتا ہے پھر لڑکے مجھے دیکھ کر سرگوشیاں کرتے تھے۔

آپ کو پتا ہے، مجھے اپنا گھر کتنا پیارا لگتا تھا۔ گلی کا سب سے اونچا خوب صورت گھر..... اور پھر میں وہاں سے بھاگا پھرا۔ ہوسٹل کی چھٹی بھی ہوتا تو گھر نہیں جاتا جاؤں بھی کیوں؟ وہاں اب ہے ہی کون۔ نہ ماں ہے

اور باپ بھی نہیں ہے اور ضوفی آپی..... میں شکیل بھائی کا رویہ برداشت کر ہی نہیں پاتا اور ضوفی آپی کو دیکھ نہیں پاتا اور چھٹیوں کے سارے دن گھر کے اندر بند رہ کر گزار دیتا ہوں۔

امتحان میں فرسٹ آنے کا بھی دل نہیں کرتا آپا.....!"

اس نے اتنی دل گیری سے کہا کہ اس کے لہجے کی کرچیاں تاباں کے پیروں کو زخمی کر گئیں۔

"اب بتائیے، آپ میرے لیے کیا کر سکتی ہیں..... میرے درد کا علاج ہے..... میری سائیکل کی چین نہیں اتری آپا..... زندگی کی چین اتر گئی ہے..... لگا دیں..... ایک قدم آگے نہیں بڑھ پاتا۔

میرا قصور کیا تھا آپا.....؟" تاباں نے جنبش بھی نہ کی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات آ رکے تھے۔

"اور میرا قصور کاشان.....؟ میرا کیا قصور تھا؟ کیا کیا تھا میں نے؟ کچھ بھی تو نہیں..... میں بے قصور تھی شانی.....!"

کاشان کو بچھو کا ڈنک لگا۔ وہ گیلے گالوں کو پونچھنا بھول کر تاباں کو دیکھنے لگا یعنی کہ وہ اب بھی لاعلم تھی یا ہٹ دھرم (بے شرم)

"مجھے ایک لڑکے نے پسند کر لیا۔ میں نے پسند نہیں کیا تھا، میں بے خبر تھی۔ اس نے سیدھا راستہ اپنا کر رشتہ بھیج دیا، میں لاعلم تھی۔ اسے انکار ہو گیا، میں نہیں جانتی تھی وہ میرا پیچھا کرنے لگا۔ بھلے سے کرتا رہتا۔ وہ غیر برادری سے تھا، میں کیا کروں..... میرے لیے فیصلہ کرنے والے بڑے تھے ناں وہ جو مرضی کرتے۔ میں اپنی زندگی میں مگن و مطمئن تھی۔

وہ شخص اپنے ہر عمل کے لیے آزاد تھا جو مرضی کرتا پھرے۔ میں تو اپنے گھر میں اپنے بہن بھائی کے ہمراہ مزے سے رہتی تھی۔ ہنستی کھلکھلاتی تھی۔ اچھے لباس پہنتی تھی۔ میری تو دنیا ہی الگ تھی۔ ضوفی نے کہا تھا۔ راستہ میں کتا پیچھے پڑ جائے تو پتھر کتے کو مارتے ہیں نہ کہ خوف کھانے والے کو۔

مائدہ، ضوفی، رانیہ، سونیا اور بچیوں کا حال بتا کر تم مجھے رحم کھانے کا کہہ رہے ہو۔ گھر کے مردوں کی بے عزتی بتا کر شرم سار کرنا چاہتے ہو، نہیں آتی مجھے شرم۔ مجھے نفرت ہو رہی ہے گھر والوں سے، انہوں نے بے قصور لوگوں کو سزا دی کیا یہ انصاف تھا؟ یاد رکھو جہاں انصاف نہیں ہوتا وہاں صرف بربادی ہوتی ہے۔ وہ معاشرے، وہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔

جاذب سلطان اپنے ہر عمل میں یک طرفہ تھا۔ میری بلا سے...... میں اپنی گھر کے اندر بے فکر تھی۔ مگر میرے لیے گھر کے اندر زندگی کس نے تنگ کی۔ میرے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے پر تنقید کی جانے لگی۔ مجھ سے باز پرس کرنے لگے جبکہ مجھے کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

ضوفشاں کو ڈاکٹر بنا رہے تھے۔ ماجدہ کے لیے جمیل ...... مائدہ کے لیے افسر اور میرے لیے وہ زمانے بھر کا نکما شکیل...... کیوں؟

پیچھا کرتے ایک شخص کو مار پیٹ کر آگئے اور اس شکیل نے متوقع رشتہ کا سن کر جب حق جتانا شروع کر دیا۔ عجیب سی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتا تھا۔ کیوں؟ جمیل بھائی نے تو نکاح ہونے کی باوجود ماجدہ کے ساتھ یوں نہ کیا حد فاصلہ برقرار رکھی۔"

تاباں کی آنکھیں بہنے لگیں۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

"اس نے کیوں میرے بالوں کی لٹ کو اپنی انگلی پر لپیٹا تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی "اور وہ کیوں مجھے ذو معنی جملے کہنے لگا تھا۔

گھر کے باہر پیچھا کرتا ایک شخص ابا کی غیرت پر ضرب لگا رہا تھا۔ گھر کے اندر ہوتی یہ کارروائی کس نام سے پکاری جائے گی؟

تم سچ کہنے آئے ہو تو سچ سننے کا بھی حوصلہ رکھنا میں آج ایک لفظ برابر کا جھوٹ بھی نہ بولوں گی شانی......"

اس نے ہتھیلی کی پشت سی آنکھیں رگڑی تھیں۔ "کھڑکی سے باہر کھڑے طلبگار شخص کو دیکھ کر اور پھر اس کی پتا سن کر خواہش ابھری تھی ایک بار اس کی صورت ہی دیکھ لوں۔ مگر مجھے اپنی حدود یاد تھیں۔ عزت۔ ذات۔ خاندان۔ شرافت۔ نجابت۔

میں جھوٹ نہیں کہتی۔ اس کے رقعے راتوں کی نیند اڑا دیتے تھے۔ مگر میں نے کوئی بے عقلی نہ کی۔

مرد جس غیرت و عزت کا راگ الاپتے ہیں۔ وہ عورت کی کل متاع ہوتی ہے۔ اور ذرا سا ہوش آنے پر ہی وہ سب سے پہلے بھانپ لیتی ہے۔ تو کیا مجھے اپنی عزت کا پاس نہ ہوتا۔ کس نے بتایا تھا رضوان، عمران بھائی کو سارا قصہ...... یہ کہ ہماری لڑکی کے پیچھے لڑکا آنے لگا ہے...... ایسی باتیں فخریہ بتاتے ہیں کہ پی جاتے ہیں؟

ڈھکی چھپی بات کو اچھالنے والے شکیل و عقیل اور چاچی جی تھیں۔ کسی نے مجھے اس سے آنکھ مٹکا کرتے دیکھا تھا یا خفیہ ملاقاتیں کرتی میں پکڑی گئی تھی ؟؟؟ میں اپنے گھر کے اندر تھی شانی...... گھر گھر سمجھتے ہو ناں تحفظ عزت مگر......

مگر گھر والوں نے مجھ سے یہی چھین لیا تو زندگی مجھ پر تنگ ہو گئی۔

گھر والوں کی بے اعتباری نے، بے یقینی نے، شکوک نے مجھے جیسے چوک پر برہنہ کر دیا تھا انہیں اپنے خون پر اعتبار نہ تھا۔

مجھے درمیان سے نکال کر دیکھو کاشان!

کیا ہوا تھا۔ غیر زبان و برادری سے رشتہ ہی آیا تھا ناں؟ شریعت کو جاننے کا دعویٰ کرنے والے اس وقت شریعت بھول گئے۔ اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے رسم و رواج اور حد بندیاں یاد رہیں۔ وہ شخص کافر تو نہیں تھا آوارہ یا نکھٹو بھی نہیں تھا۔ کسی کبیرہ گناہ میں بھی مبتلا نہیں تھا۔ نیکی اور تقویٰ ایک بیٹی کا رشتہ کرتے ہوئے یہی دیکھنے کا حکم ہے نا۔ ذات برادری کا تو ذکر کہیں نہیں ہے۔

تم اس مذہب کو مانتے ہو نا جہاں لڑکی کو باپ کے کیے نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ قبیلے اور خاندان تو پہچان کے لیے بنائے گئے ہیں ناں...... اعلیٰ و

اسے کوئی تو کوئی ہے ناں ..... انکار کا کوئی جواز تو ہوتا۔ جاذب سلطان ایک ایسا پرپوزل تھا۔ جس کے لیے دعائیں مانگی جائیں اور یہ میں نے نہیں ضوفی نے امی سے کہا تھا اور امی نے تائید کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ اب تاباں کے لیے اس سے کم پر کم از کم ان کا دل تو راضی نہ ہو گا پھر شکیل ساجد کو مجھ پر کیوں مسلط کیا گیا

میں جاذب سلطان کی سمت میں گھر سے نکلی تھی۔ نہیں قطعاً" نہیں میں گھر والوں کی خود سے نفرت' حقارت دیکھ کر اپنی زندگی ختم کرنے نکلی تھی پھر وہ راستے میں ٹکرا گیا اور میں نے حرام موت سے منہ موڑ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔"

وہ یکدم چپ کر گئی۔ تو فضا میں بھی سناٹا بولنے لگا اور کاشان مجاہد ششدر تھا۔ وہ الزامات لگانے آیا تھا۔ وہ تاباں مجاہد کو جملوں کی مار مارنا چاہتا تھا۔ شرمسار دیکھنا چاہتا تھا۔ ایسی کہ زندگی بھر زخم چاٹتی رہے۔ مگر.....

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک محبت پا کر میں ساری محبتیں بھول گئی ہوں مجھے بھی سب لوگ یاد آتے ہیں۔ وہ گھر یاد آتا ہے۔ جس کے دروازے مجھ پر بند کر دیے گئے مجھے کوئی یاد نہیں آ رہا تھا۔

شانی جب کچھ اور وقت گزرا۔ تب پچھتاوے شروع ہونے لگے۔ یہ میں نے کیا کر دیا؟؟؟ اور ہر روز یہ احساس نئے روپ سے آ کر ایسے کچوکے لگانے لگا کہ میری سانسیں رکنے لگیں۔

چھ سال سے میں پچھتاوں کی آگ میں جل رہی تھی۔ مگر آج جیسے آرام میں آ گئی ہوں۔

مجھے الزام دیتے ہو؟؟؟ باپ کی سزا بیٹی کو نہیں ملتی ہر فرد اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہوتا ہے اس خاندان کی سفارش کرتے ہو؟؟؟ جسے اللہ کا یہ قانون یاد نہیں ہے آج تمہارے منہ سے سنا کہ اس گھر میں پیدا ہونے والی ہر لڑکی کے لیے کیا فیصلے کیے گئے۔ تو اپنا فیصلہ درست لگنے لگا۔ سب سے نفرت ہو رہی ہے۔ مجھے نہ جیت سکے تو باقی سب کو مار دیا؟"

اس نے اپنے لب کچل ڈالے۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو چکی تھیں۔ ناک آنکھ اور منہ سے پانی نکل رہا تھا۔

اور کیا تھا یہ سب ..... ایک انتہا پسندانہ سوچ ..... ایک غرور تکبر اور تعصب کہانی سیدھی ہو سکتی تھی زندگی آسان ہو جاتی۔ اگر میانہ روی اختیار کر لیتے بن بیاہی لڑکیوں کا ڈھیر اکٹھا کر کے بیٹھے ہیں۔ ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں سب کو..... بھائیوں اور بھابیوں کے در پر پڑی ہیں۔ مفت خوری کا طعنہ سنتی ہیں۔ بڑھاپے کے عالم میں کوئی درد آشنا نہیں۔ کوئی ہمدم ہمراز نہیں ..... اولاد نہیں کہ دو بوند پانی ٹپکا دے۔

اور صرف ہماری نسل میں نہیں ..... ہماری ماؤں اور نانیوں کے نسل میں بھی ..... گھر بھر لیے لڑکیوں سے.....

کیا نہ اچھا ہوتا کہ شریف ..... دو وقت کی روٹی عزت سے کھلانے والے کو دیکھ بھال کے ان سب کو بیاہ دیا جاتا؟

تمہیں تو یاد بھی نہ ہو گا۔ مگر مجھے یاد ہیں پھپھو کی نند..... دو دن تک اپنے کمرے میں مردہ پڑی رہیں اور بھرے پرے گھر میں سے کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔

جو شخص میرے قابل نہیں تھا۔ اسے ضوفی جیسی لڑکی دے دی گئی۔" بہت دیر بعد وہ بولی تو اب ضوفشاں مجاہد کا غم اسے رلانے لگا۔ "کتنی قابل اور با اعتماد تھی ضوفی ..... ایک بار ابا کا دل نہ کانپا کہ وہ ضوفی کے ساتھ کتنا برا کر رہے ہیں۔ کیا یہ ناانصافی نہیں؟ ظلم نہیں؟ ایک بار سوال ان سے بھی کرنا تھا ناں؟

گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی لڑکیوں کو ہمیشہ سکھ نہیں ملتا زیادہ تر وہ برباد ہی ہوتی ہیں۔ شوہر بھی شک کرتے ہیں اور سسرال میں بھی عزت نہیں ملتی مگر لڑکیاں یہ کیوں کرتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں سوچا۔

تم مجھ سے جواب دہی کے لیے چھ سال تک سوال نامہ بناتے رہے۔ تمہارا ہوم ورک مکمل ہے شانی! اور میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ..... لیکن یہ بتاؤ۔ کیا تمہارے پاس میرے سوالوں کے جواب ہیں؟

تم میرے پاس عزت' مقام' رتبہ مانگنے آئے ہو' میں بھی تو اسی عزت' مقام کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ میں تمہیں خوش نظر آتی ہوں لیکن میں خوش نہیں ہوں۔ اتنے رشتے کھو کر ایک رشتہ پایا ہے؟ وہ ان سب کا نعم البدل تو نہیں ہے لیکن ان سب سے بہتر ضرور ہے۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ سچے تھے حق بجانب ..... زیادتی دونوں کے ساتھ ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے مجرم تھے۔

"ہاں میں اپنی تمام تر باتوں میں حق بجانب ..... مگر پھر بھی زیادتی کر گئی۔ میری وجہ سے۔" اس کی آنسو ٹپکا ٹپکا کر تھکی آنکھوں سے ایک آنسو لڑھکا "لیکن میں نے ایسا اب سوچا تھا۔ بس ہو گیا۔ تھی تو میں بھی ان ہی کی بیٹی ..... وہی خون اور سوچ ..... انتقام اور منصوبہ سازی میں ان سے کمتر کیسے ہو جاتی' لیکن ..... یہ دل بہت اندر کیوں کٹتا ہے۔ جسے میں قصوروار ..... آل ..... نہیں مگر....."

اور کاشان مجاہد ہارا ہوا سا' تھکا نڈھال بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بدحالی کا نمونہ تھا۔

بہت خیال تھے۔ وہ اسے ذلیل و خوار کرے گا اور زندگی بھر کے لیے سوالیہ نشان چھوڑ آئے گا کہ اس نے کیا کر دیا تھا۔ سب کے ساتھ اور اس کے ساتھ؟

سوالوں کے جواب سے تشفی ہوئی نہ ہوئی۔ سوچ کے نئے در وا ضرور ہوئے۔ ایسے پہلو جو نظروں سے اوجھل تھے اور کسی نے بتائے بھی نہیں ..... چھ سال کے حساب کتاب کو شاید دوبارہ جانچنا ہو گا۔ کچھ اصولوں کی نئی ترتیب ..... کچھ نظریات کی تبدیلی.....

ہم خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں تو اس کے بنائے اصول و ضوابط کیوں نہیں؟ یہ خود ساختہ روایتیں کب تک؟ دیوار پر چڑھ کر تماشا دیکھتی چاندنی ..... دھیرے دھیرے بے آواز سرکتے ہوئے ان دونوں کے بیچ میں آ بیٹھی تھی۔

دونوں ساکت و صامت تھے۔ جیسے مجسمے ..... مگر ہلکی سی سسکی ..... تاباں بری طرح چونکی۔ کاشان مجاہد کے دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے اور ان پر ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ پتا نہیں کس چیز کو رو رہا تھا۔

تاباں بے تابی سے اٹھی تھی۔ اس کی تیزی کو دیکھ کاشان مجاہد نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ تاباں نے ہاتھ بڑھائے تھے۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ کاشان نے اپنے بازو تاباں کے گرد پھیلا دیے تھے۔ کاشان کے کان میں سرگوشی ابھری۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور تم میرے لیے کچھ نہیں کر پاؤ گے۔"

کسی بھی عدالت' منصف اور وکیل کے بغیر ان دونوں نے اپنا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاباں تسلیم کر چکی تھی۔

بعض مقدمات کا انجام فقط شکست ہی ہوتا ہے۔ مگر گلے اس لیے ملتے ہیں کہ چلو ایک انجام تک تو پہنچے۔



عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا ناکہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۲۳—
تیئسویں قسط



کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ اتنی خاموشی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ بلال سلطان ان کی ریسپشنسٹ رائنہ' رازی' تینوں دم بخود نظر آ رہے تھے۔ رائنہ اور رازی اس لیے دم بخود تھے کہ باس کے سامنے انہوں نے کبھی کسی کو یوں بلند آواز میں بڑھ بڑھ کر بولتے نہیں سنا تھا۔

دونوں اپنے باس کے مزاج سے بخوبی واقف تھے اور وہ چھٹانک بھر کی لڑکی جس انداز میں باس کو ڈپٹ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو نیم بے ہوش کر دینے کے لیے کافی تھا۔

"رائنہ! رازی!" پھر اس خاموشی میں باس کی آواز ابھری۔

"Both of you leave the office" (تم دونوں دفتر سے باہر جا سکتے ہو)

مقام حیرت تھا' باس اس لڑکی کو کک آؤٹ کرنے کا حکم سناتے سناتے رائنہ اور رازی کو آفس سے باہر چلے جانے کا حکم دے رہا تھا۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے واپس جانے کے لیے مڑے۔

"اینڈ مائنڈ یو!" پیچھے سے باس کی آواز آئی۔ "نو گوسپ اؤٹ سائیڈ۔" دوسرا حکم جاری ہوا "رازی! تم گھر جاؤ فوراً" اور ضوفی کے ساتھ بیٹھ کر آج کا ڈنر پلان کرو' ایک اسپیشل اور پرلطف ڈنر۔"

"لیکن سر' آج کا ڈنر ملانشین قونصلیٹ۔" رائنہ نے کہنا چاہا۔

"کیا میں نے تمہیں کچھ بولنے کے لیے کہا؟" بلال سلطان نے تحکمانہ انداز میں سوال کیا۔

"سوری سر! آئی ایم سوری!" رائنہ گڑبڑا گئی اور اس گھبراہٹ میں بھی ایک زہر خند نظر ماہ نور پر ڈالتی آفس سے باہر نکل گئی۔

"ڈنر کو ایکس کلیوز (exclusive) اور scramprous ہونا چاہیے رازی؟" باہر نکلتے رازی کے کان تک ایک اور ہدایت آئی۔

"کتنے مہمانوں کے لیے سر؟" رازی نے رک کر پیچھے دیکھے بغیر پوچھا۔

"ایک۔" باس کی آواز آئی "صرف ایک۔"

☼ ☼ ☼

"مجھے تمہاری کہانی سن کر حیرت نہیں ہوئی۔" دودن زادے نے اپنی جیکٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر انہیں اپنے منہ کے آگے رکھ کر اپنی گرم سانسوں سے گرما کر آپس میں رگڑا "مجھے یقین تھا کہ تمہارے پیچھے کوئی ایسی کہانی ہے' جو غیر معمولی اور انوکھی ہے۔"

"اکیلے میرے پیچھے ہی نہیں ہر انسان کے پیچھے ایک غیر معمولی اور انوکھی کہانی ہوتی ہے۔" سعد نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنی کہانی کو غیر معمولی قرار دیا جانا اسے پسند نہ آیا ہو۔

"تمہارا یہ خیال غلط ہے۔" دودن زادے نے سر ہلایا "بہت کم لوگوں کے پیچھے غیر معمولی اور انوکھی کہانیاں ہوا کرتی ہیں' دنیا بھر میں شاید ایسے صرف پچیس فی صد لوگ ہوتے ہیں۔"

"اور باقی پچھتر فی صد کیسے لوگ ہوتے ہیں؟" سعد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ سامنے تیز سورج اس کی نظروں کے سامنے چمک رہا تھا اور اس کے چاروں طرف برف کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ اس سکی انگ رنگ کے بلند ترین مقام پر پہنچ چکے تھے اور کچھ دیر ستانے کو کھڑے تھے۔

"وہ میرے جیسے ہوتے ہیں' جن کے پیچھے کوئی لمبی چوڑی کہانی نہیں ہوتی اور جو آنکھیں بند کیے کنوؤں کے مینڈکوں کی سی زندگیاں گزارے چلے جاتے ہیں اور ایک دن موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' دنیا کے پچھتر فی صد لوگ ایرانی النسل امریکی ہوتے ہیں اور دنیا بھر کی خواتین سے مایوس ہو کر سال بھر بعد کہیں نہ کہیں سکی انگ کرنے پہنچ جاتے ہیں۔" سعد نے کہا' اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تم کیسے غمگین ہو رہے تھے اپنے والد کی مہم جوئی سے بھرپور زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے' اپنی

والدہ کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے' اس چارکول آرٹسٹ کے دکھ کا اندازہ کرتے ہوئے جسے تمہارے والد نے دھوکا دیا اور جو تمہارے والد کی سفاکی کی وجہ سے اپنا بچہ بس اسٹینڈ پر چھوڑ آئی' تمہیں اس بچے کے بارے میں سوچ کر بھی کتنا دکھ ہو رہا تھا کہ نجانے وہ زندہ بھی ہو گا یا نہیں' تمہیں کتنا دکھ ہو رہا تھا یہ بات بتاتے ہوئے کہ تمہاری زندگی کے کتنے کردار تمہارے باپ کی خود غرضی کی بھینٹ چڑھ گئے اور سب سے بڑھ کر تم اس لڑکی کو یاد کر کے کتنے دکھی ہو رہے تھے جس سے تم محبت کرتے ہو اور جس سے بوجوہ تم اظہار محبت نہ کر سکے۔" دودن زادے نے سعد کی شرارت بھری مسکراہٹ کو دیکھ کر کہا۔

"اور اب تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ تمہاری اپنے مخاطب کو مات دینے والی رگ پھڑکنے لگی ہے۔ سچ ہے سعد سلطان؟" دودن نے توصیفی نظروں سے سعد کو دیکھا "تم میری زندگی کا سب سے دلچسپ تجربہ ہو۔"

"میں ایک جان دار انسان ہوں دودن زادے! بے جان تجربہ نہیں۔" سعد نے اپنی سکی اسٹکس تھامتے ہوئے کہا۔

"انسان بھی کسی تجربے سے کم نہیں ہوتے۔" دودن زادے نے اپنے الفاظ کا دفاع کیا "میں ہر نئے انسان سے ملاقات کو ایک نیا تجربہ ہی گردانتا ہوں۔"

"چلو' پھر اگلے ہدف تک پہنچنے کے لیے سکی (Ski) کرتے ہیں۔" سعد نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آگے دھوپ اور بھی تیز ہے' اس کی شعاعوں کا براہ راست سفید برف سے ٹکراؤ بصارت کو دھوکا دے سکتا ہے' میرا خیال ہے۔ آگے جانے کے لیے ہمیں بادلوں سے ڈھکے آسمان والے دن تک کا انتظار کر لینا چاہیے۔" دودن زادے نے نرمی سے کہا۔

"انتظار! دنیا کی سب سے بری کیفیت ہے' میں اب اس سے گزرنے کا قائل نہیں رہا۔" سعد نے اپنے سر پر جمے ہیلمٹ کا زاویہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"سعد! میرا مشورہ ہے کہ میری بات مان لو۔" دودن نے قریب سے گزرتے اسکیٹ بورڈ سرفرز کی ایک ٹولی کو دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں ابھی اندازہ نہیں کہ یہ شعاعیں نظر کو کیسے دھوکا دیتی ہیں۔"

"تم نے دیکھا نہیں' یہ سب لوگ آگے جا رہے ہیں۔" سعد نے سکی آسٹک سے آگے جانے والوں کی ٹولی کی طرف اشارہ کیا "اور وہ پیشہ ور سکیٹ بورڈز ہیں۔"

"مگر تم پیشہ ور سکیٹر نہیں ہو سعد۔" دودن زادے نے متانت سے کہا "چلو ابھی نیچے جانے والی لفٹ تیار ہے' واپس چلتے ہیں۔"

سعد' دودن زادے کی بات سنتے ہوئے متذبذب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کانجی کے دو گھونٹ پینے کی چور ہوئی تھی میری بہن' پل کی پل میں یہ حال ہو گیا جو نظر آ رہا ہے۔"

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ نہایت اثر انگیز زہر ایسا جو سیکنڈوں میں خون میں شامل ہو کر جسم بھر میں دوڑنے لگے' پلایا گیا ہے۔"

"ہائے سکینہ! تیرا بیڑا اتر جائے' میں تو پہلے ہی خوف زدہ تھی' بہتیرا منع کیا تھا نہ پیو وہ اللہ ماری کانجی' سکینہ طیفے لاڑکی ایجنٹ ہے۔ یونہی نہیں پکڑا گئی بوتل بھر کانجی' مگر مجھے ہی جھڑکنے لگی۔ ہر کسی پر شک کرلی ہو' لولے لو شک نہ کرنے کا صلہ۔ ہائے میرے مولا' سارا جسم آبلوں سے بھر گیا' حلق تک میں آبلے ابھر آئے' آواز نکلتی ہے نہ بات ہوتی ہے' کیسی بے بسی کی تصویر بنی پڑی ہے میری بہن' ہائے وے طیفیا تیرا ککھ کنڈا نہ رہے کم بختا' ظالما' چھری سے گلا کاٹنے آیا تھا۔ وہ نہیں کٹا تو زہر دے کے مارنے کو آ گیا ہائے خانہ خرابا' تجھے اگلی گھڑی سے پہلے موت آ جائے۔"

"آواز آہستہ رکھو رابعہ بی بی! یہ ہسپتال ہے۔ تمہارا محلہ نہیں' مریض ڈسٹرب ہوتے ہیں' مت بین کرو اس

طرح۔"

"ارے تم کیسے دولہا ہو اس کے' جو یوں سکون سے کھڑے اس کا چہرہ ایک ٹک دیکھے چلے جا رہے ہو' ہائے میری بہن کا شہزادیوں جیسا حسین چہرہ' پریوں جیسا معصوم حسن' ہاتھ لگانے سے میلا ہو جانے والا گورا رنگ' ہائے میں مر کیوں نہ گئی اس کا یہ جلا' مٹا' آبلوں سے بھرا چہرہ دیکھنے سے پہلے' ارے دیکھو تو صرف آنکھیں بچی ہیں' باقی چہرے کا کوئی حصہ ایسا نہیں' جو بچ گیا ہو اس کم بخت زہر کے اثر سے۔"

"ہاتھ مت لگاؤ رابعہ بی بی! ہاتھ لگانے سے منع کیا ہے ڈاکٹروں نے انفیکشن ہو جائے گا۔"

"میں تم سے پوچھتی ہوں دولہا بھائی! کیسے جگرا لاتے ہو اس کم نصیب کا یہ حال دیکھنے کا' تم تو اس موہنی صورت کے پروانے تھے اور اس کی کھنکتی آواز کے دیوانے' کیسے سکون سے کھڑے ہو یہ سب دیکھنے' ارے جاؤ' جا کر رپٹ کیوں نہیں لکھواتے طیفے لاٹر کے خلاف' اس نے' اس نے یہ ساری خباثت چلائی ہے' رکو ذرا میں اس سکینہ کی تو خبر لوں' دو دو ہاتھ کروں اس سے ارے چاہے میرے خلاف قتل کا مقدمہ درج کروا دیں اس کے گھر والے' اس کی گردن نہ مروڑ ڈالی آج میں نے تو رابعہ کلثوم نام نہیں میرا۔"

"ارے رکو تو' رابعہ بی بی! کدھر جاتی ہو۔"

"میرا بازو چھوڑ دو دولہا بھائی! تمہاری تو عقل اور غیرت دونوں پر ہی پانی پڑ گیا ہے شاید' مگر مجھے کیسے چین آئے' میں تو اب سکینہ کو ہی نہیں طیفے کو بھی گولی نہ مار کر آئی تو نام میرا رابعہ کلثوم نہیں۔"

"جذباتی باتیں مت کرو رابعہ بی بی! تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے ان دونوں کے خلاف۔ سکینہ کے گھر سے کانجی آئی' ہم دونوں نے لے لی' جانتی بھی تھیں کہ اس کا اس طیفے سے کیسا تعلق ہے' پھر بیگم صاحبہ نے وہ کانجی پی بھی لی' بوتل میں صرف ایک گلاس کانجی تھی' جس کے چند گھونٹ اس کے اندر گئے' باقی کی گلاس سمیت نیچے گر گئی' اس کو ہوش میں لانے کی خاطر گلاسوں کے گلاس پانی اس پر پھینکنے کی کوشش میں وہ بھی پانی کے ساتھ پانی بن کر اپنے ثبوت مٹاتی بہہ گئی' گلاس ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا' تمہارے واویلا ڈال کر محلہ اکٹھا کرنے کے دوران نجانے کس کا داؤ لگا اور وہ بوتل بھی غائب ہو گئی جس میں کانجی تمہیں دی گئی تھی۔ بولو اب کس ثبوت کو لے کر رپٹ درج کراؤں میں اور کیا بتا کر طیفے اور سکینہ کو گولی ماروں۔"

"نہیں' میں کسی بات کو' کسی دلیل کو نہیں مانوں گی' مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ میرا راستہ مت روکو' میں ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گی۔ ہائے میں اپنی بہن کو دیکھتی ہوں تو میرا کلیجہ کٹ کٹ جاتا ہے' میں چین سے کیسے بیٹھ جاؤں' چھوڑو' چھوڑ دو مجھے۔"

"رکو رابعہ بی بی! رک جاؤ' سامنے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو سراج! روکو اسے' پکڑو' پہلے کم مصیبت آئی ہے ہم پر جو یہ کوئی نئی مصیبت لانے چلی ہے۔"

"میرا کون سا بس ہے۔ جی اس پر' اس دن سے رہ رہ کر ایسے ہی دورے پڑتے ہیں اس پر' میں تو بی جی کے ساتھ ساتھ اسے بھی سنبھالتا تھک ہی گیا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ رابعہ بی بی! میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ' خبردار جو اب تم نے اونچی آواز نکالی یا اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی' جان لو کہ ابھی ہم کسی سے بھی قانونی جنگ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں' میری بیوی زخم زخم ہے اور بے ہوش پڑی ہے' میرا معصوم بچہ ماں کی آغوش سے محروم بخار میں پھنک رہا ہے' سرمایہ سب کا سب مل میں مشترکہ کاروبار میں لگا بیٹھا ہوں' نہ پاؤں تلے زمین ہے نہ سر پر کوئی چھت ہے۔ میں کس آسرے پر ان لوگوں سے ماتھا بھیڑوں' مجھے اپنے مسئلوں سے نمٹ کر سکون کا سانس تو لے لینے دو' مگر مت بھولنا کہ میں اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے والوں میں سے نہیں ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ کہاں' کب اور کیسے جوابی وار کرنا ہے۔ مگر ابھی نہیں' ابھی میں مجبور ہوں' ابھی میرا وقت نہیں ہے۔"

"اللہ جانے کب آئے گا تمہارا وقت' کہا تھا تم سے اس محلے سے ہماری جان چھڑا دو' تم نے کہا۔ ابھی وقت نہیں' کہا تھا طیفے کا کوئی انتظام کر لو' تم نے کہا۔ ابھی وقت نہیں ہے' کہا تھا اسے ہی یہاں سے لے کر نکل جاؤ

بچے سمیت۔ تم نے کہا ابھی وقت نہیں' ارے چھری پھرے اس کم بخت وقت پر جس نے لے کر میری بہن کی شکل کو بے شکل کر دیا' نہ وہ مردوں میں ہے نہ زندوں میں' یونہی پڑی کراہتی ہے ہر دم' نہ کروٹ بدل سکتی ہے نہ سیدھی لیٹ سکتی ہے' ہائے میری ماں' میں کیا کروں' میرے تو رو رو کر آنسو بھی خشک ہو گئے اب تو۔"

"سراج! تم اسے لے کر گھر جاؤ' اسے نیند کی دوا دے کر سلا دو' اس کا ذہن تھک چکا ہے' اسے سکون کی ضرورت ہے۔"

"جی سرکار! میں کوشش کرتا ہوں۔"

"اور پلیز میرے بھائی! ذرا سعد کو بھی دیکھ لینا' میں اسے سلا کر آیا تھا' اس کے پاس تمہارے مولوی صاحب کی بی بی بیٹھی تھیں' ان کو بھی اب تک تو گھر واپس جانا ہو گا' مہربانی کر دو یار! اسے بھی لے جاؤ رابعہ بی بی کو بھی اور جا کر سعد کو بھی دیکھ لو۔"

"جی صاحب' میں خادم۔"



"یہ کھاری تو جذباتی ہے اماں! نجانے کہاں اور کس کی کیا سن کر آپ کو کھینچ لایا ادھر' اور آپ بھی بغیر سوچے سمجھے چل پڑیں' چوہدری صاحب کے پاس تو ہر طرح کے مہمان آتے ہی رہتے ہیں' کھاری کو سیدھا اور انجان سمجھ کر اس سے ہنسی مذاق بھی کر لیتے ہیں' یہ جذبات میں آ کر آپ کو بلانے چلا گیا۔ پہلے پتا تو کر لیں کون مہمان آیا ہوا ہے اور اس نے اس سے کس رنگ میں کوئی بات کی ہے۔"

کھاری کے اصرار پر آپا رابعہ اوائی توائی کرتی فارم ہاؤس پہنچی تھیں اور ذرا سانس لینے کو سعدیہ کے پاس رکی تھیں اور سارے قصے سے بے خبر سعدیہ نے آپا رابعہ کی آمد کی وجہ جان کر اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

"او سعدیہ باؤ! ایسہ کوئی مخول شغول نئیں" کھاری کا سانس برابر معمول سے تیز چل رہا تھا۔ "مینوں خود اس پچھل پائی نے بتایا ہے' وہ میرے ماں پیو کو جانتی ہے' چوہدری صاحب نے خود تصدیق کیتی ہے کہ وہ جو کہہ رہی ہے' وہ سولہ آنے سچ ہے۔"

"تسی بہن جی!" وہ سعدیہ سے دھیان ہٹا کر آپا رابعہ سے مخاطب ہوا۔

"سعدیہ دی کوئی نہ سنو' بس میرے نال اوپر والے کمرے میں چلو' اودھر ہی مہمان بیٹھی ہے' رنگ اس کا توے در گا (کی طرح) کالا اے' بال کھچڑی تے مونڈھیاں (شانوں) تک کٹے ہوئے اور اس نے عمر کے حساب سے بڑے شوخے کپڑے پہنے ہوئے ہیں' اس دی گل سن لو بہن جی! خدا معلوم تسی اس کو جانتے ہی ہو گے جی۔"

"اوپر والے کمرے میں۔" سعدیہ نے کھاری کی بات سن کر کہا "وہاں تو ابھی ابھی کچھ مہمان گئے ہیں' ماسی رشیدہ چائے کا انتظام کر رہی ہے بڑے کچن میں' مجھے بھی بلایا تھا اس نے کہ اس کی مدد کروا دوں' پہلے پتا تو کر لو وہاں اب کون بیٹھا ہے' ایسے ہی اماں کو وہاں لیے جا رہے ہو۔"

"اوئے ہوئے میں نے کہا تھا نا بہن جی جلدی چلیں۔" کھاری نے ماتھے پر ہاتھ مارا "فیر بھی اتنی سی دیر میں ادھر کوئی ہور مہمان آ گئے' ٹھہرو پھر میں دیکھ کر آتا ہوں' کدھر سے وہ پچھل پائی اڑھ نہ گئی ہو اتنی سی دیر میں۔"

کھاری کا جوش ایک دم چڑھے ابال کی طرح بیٹھ گیا اور وہ مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

"وہ جو بات کہہ رہا ہے سعدیہ! بے پر کی نہیں لگتی' بے چارہ یونہی تو جوش میں نہیں آیا تھا۔" کھاری کے جانے کے بعد آپا رابعہ نے سعدیہ سے کہا۔

"ارے اماں بے پر کی نہیں لگتی مگر ہے بے پر کی ہی۔" سعدیہ نے لاپروائی سے کہا۔ "اب آپ خود سوچیں کھاری اور اس سعد باؤ صاحب کا بھائی' آپ ذرا غور کریں' اس سے زیادہ بے پر کی کیا ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی کسی مہمان نے جو سعد صاحب کو بھی جانتی ہو گی۔ مذاق سے اسے کہہ دیا ہو گا کہ تم اس کے بھائی ہو' یہ بے چارہ بات کی گہرائی میں تو جاتا نہیں' یقین کر کے آپ کی طرف بھاگ پڑا۔"

یہ نہ کہہ رہا تھا کہ چوہدری صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔" آپا رابعہ کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

"افوہ اماں! آپ خود سوچیں' چوہدری صاحب کو بھلا کیا پتا کہ کھاری کے ماں باپ کون ہیں' وہ جانتے ہوتے تو کیا اس کو اسی وقت ان تک پہنچا نہ دیتے جب یہ انہیں ملا تھا۔ آپ چوہدری صاحب کے مزاج سے واقف نہیں۔ جب ان کا موڈ اچھا ہوتا ہے تو مذاق کرلیتے ہیں سب سے اچھا خاصا' اس بے چارے سے بھی کردیا ہوگا مذاق' یہ تو اللہ لوک ہے' مذاق کو سچ سمجھا' ذرا سا غور کرنے کی توفیق ہوتی تو خود ہی سمجھ جاتا کہ کیسی ناممکن بات کررہی ہے وہ مہمان۔"

"اتنا ہی بے چارہ سیدھا ہے تو اسے دنیا داری' سمجھ بوجھ سکھانا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔" آپا رابعہ نے سعدیہ کی بے نیازی اور لاپروائی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تم تو سمجھ دار اور چار لفظ پڑھی ہوئی ہو نا۔"

"ارے اماں! سمجھاتی ہوں' بہت سمجھاتی ہوں کہ اتنے جذباتی نہ ہوجایا کرو جو آنکھیں بند کرکے ہر کسی کی ہر بات پر یقین کرتے بیٹھ جاتے ہو۔" سعدیہ نے داناؤں کی طرح بات کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی دو چار دن پہلے کی بات ہے چوہدری صاحب نے اس سے کہہ دیا کہ اگر 'تمہاری بیوی پڑھنا چاہتی ہے تو میں اسے پڑھاؤں گا' سارا خرچا میں پورا کروں گا' اس سے پوچھو اس نے کیا پڑھنا ہے۔' یہ اسی طرح جذباتی ہوکر خوشی کے مارے آندھی کی طرح آیا اور میرا بازو پکڑ کر مجھے چوہدری صاحب کے پاس لے گیا۔ مجھے ان کے سامنے جاتے ہی احساس ہوگیا۔ وہ مذاق کے موڈ میں تھے' میں نے ان کے پوچھنے پر صاف کہہ دیا کہ جی مجھے ایف اے کے کورس کی کتابیں منگوادیں' میں نے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ دینے کے بعد ایف اے کرنا ہے پرائیویٹ۔"

"ارے یہ کیا کیا تم نے؟" آپا رابعہ کو سعدیہ کی بے نیازی پر غصہ آنے لگا۔ "ایسا ہی چوہدری صاحب فیاض ہورہے تھے تو کہنا تھا نا میٹرک سائنس کے ساتھ کرکے ایف ایس سی کروں گی۔ انہوں نے تمہیں ڈاکٹری بھی پڑھا دینی ہے۔"

"کوئی نہیں پڑھاتی اماں کوئی نہیں پڑھاتا کسی کو ڈاکٹری۔" سعدیہ حقیقت پسندی کے دائرے میں داخل ہوکر ایک مرتبہ پھر دانشمندوں کے انداز میں بولی "سیڑھی پر چڑھا کر سیڑھی کھینچ لیں تو ان چوہدری لوگوں کا کیا اعتبار۔ اور پھر میں بہت پڑھ کر کروں بھی کیا۔ کھاری کی بیوی اور ڈاکٹری۔ اماں کیوں چاہتی ہیں آپ کہ ایک مرتبہ پھر ایک گاڑی ایسی بنے جس میں دو پہیے سائیکل کے اور دو ٹرک کے لگے ہوں جیسے آپ کی اور ابا جی کی گاڑی تھی جو نہ چلتی تھی نہ رکتی تھی اور اس کے بار بار اسٹاپ کرنے نے مجھے بھی یہ پتا نہیں چلنے دیا کہ میرے قدم زمین پر ہیں کہ آسمان پر۔ نہیں اماں!" اس نے آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے یونہی رہنے دیں' میں کھاری کی نیکی کو نیکی رہنے دینا چاہتی ہوں اس بے چارے کے گلے پڑا عذاب نہیں بننا چاہتی۔"

سعدیہ نے ایک مرتبہ پھر آپا رابعہ کو حیران کردیا تھا' ان کی بیٹی ہوکر بھی اس نے دوسری مرتبہ ان کی نسبت دانش مندی کا ثبوت دیا تھا' سعدیہ اچانک اتنی سمجھ دار کیسے ہوگئی تھی خود ان کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم جو کوئی بھی ہو' تہذیب اور تمیز سے نا آشنا ہو۔" رازی اور رائنہ کے جانے کے بعد بلال سلطان نے سامنے کھڑی ماہ نور کو مخاطب کیا۔ "یا تو تمہارے والدین نے تمہاری تربیت کی نہیں' اگر کی ہے تو تم نے اثر قبول نہیں کیا۔"

"میرے والدین نے تو خیر میری تربیت کرنے میں ہی اپنی عمریں گزار دیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ان کی تربیت نے ہی مجھے انسان بنادیا۔" ماہ نور نے چبا چبا کر لفظ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "آفرین تو اس لڑکے پر ہے۔ جس کا نام سعد سلطان ہے اور جس کے آپ کے والد بزرگوار ہیں زندہ اور موجود ہونے کے باوجود آپ نے اس کی تربیت میں اپنا ایک لمحہ بھی استعمال نہیں کیا' وہ خودرو پودے کی طرح بڑھا لیکن واہ۔ کیا خوب بڑھا کہ آج جو بھی شخص اس سے واقفیت

رکھتا ہے' اس کی تعریف کرتا ہے اور اس کے لیے دعاگو بھی ہے' لیکن آپ' وہ زہر خند لہجے میں بولی "ذرا سوچ کر تو بتائیے گا اس دنیا میں کوئی ہاتھ ایسا بھی ہے جو آپ کے لیے دعا کرنے کو اٹھتا ہو۔"

"اچھی خاصی ماہر ڈرامہ باز ہو تم۔" وہ ماہ نور کی باتوں سے ذرا برابر بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے بولے۔ "صرف ایک ڈیڑھ دن پہلے تمہیں پتا نہیں تھا کہ وہ لڑکی کون ہے' جو سعد کی کوئین آف ہارٹ ہے اور یہ تمہارے ہی الفاظ تھے کہ تم اس لڑکی کو نہیں جانتیں' آج تم پر اچانک انکشاف ہوگیا کہ تم ہی وہ لڑکی ہو اور تم یہ دعوا کرتی یہاں بدتمیزوں کی طرح بغیر اجازت گھس آئیں۔"

ماہ نور کا چہرہ ان کی بات سن کر غصے سے تمتمانے لگا۔

"خوب سمجھتا ہوں میں یہ سب ڈرامہ بازیاں' یہاں آکر یہ سب دولت' جائیداد' روپیہ پیسہ' آسائش' سہولت دیکھی تو میرے بیٹے کی یہاں عدم موجودگی سے تمہیں خیال آیا ہوگا کہ لگے ہاتھوں یہ دعوا کرنے میں کیا حرج ہے کہ تم اس کے خوابوں کی شہزادی ہو' سو چلی آئیں منہ اٹھا کر' میری حماقت جو تم سے اس بات کا تذکرہ کر بیٹھا۔" وہ آگ لگا رہے تھے اور اسے مزید بھڑکانے کے لیے ساتھ ساتھ اس پر تیل بھی چھڑک رہے تھے۔

"آپ کی دولت' جائیداد' روپیہ پیسہ' آسائشیں' سہولتیں مائی فٹ!" ماہ نور پھٹ کر بولی۔ "دور سے سلام ایسی دولت کو جسے لات مار کر آپ کا اپنا سگا بیٹا آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ جو اسے دل کا سکون نہ دے سکی۔ وہ کسی اور کو کیا اپنی کشش سے کھینچے گی۔"

اب وہ بول نہیں رہی تھی پھنکار رہی تھی۔

"آپ جیسے مادیت پرست' ہر جذبے' ہر احساس کو دولت کے کھنکتے سکوں کی آواز کے ساتھ تولنے والے کیا جانتے ہوں گے کہ کچھ حقیقتوں کا انکشاف واقعی اچانک ہوتا ہے انسان پر' وہ توقع بھی نہیں کررہا ہوتا اور اس کی جھولی نعمتوں سے بھر دی جاتی ہے' آپ کو کیا معلوم کہ اللہ کی نعمت صرف روپیہ پیسہ' دھن دولت ہی نہیں۔ اس سے کہیں بڑی نعمت کسی کی محبت پالینے کا احساس ہے۔"

اس نے طنزیہ نظروں سے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"ہاں' میں نہیں جانتی تھی۔ فقط ایک دن پہلے تک نہیں جانتی تھی کہ میں اتنی خوش قسمت ہوسکتی ہوں کہ سعد سلطان جیسا انمول شخص مجھے اپنے دل کی ملکہ بنالے' مگر کچھ انکشافات واقعی اچانک اور غیر محسوس طریقے سے ہوتے ہیں۔ مجھ پر بھی یہ انکشاف اچانک ہی ہوا اور میں اس کی خوشی میں سرشار آپ کی طرف دوڑ پڑی' آپ سے آپ کی دولت' پیسہ' اسٹیٹس مانگنے نہیں' صرف وہ امانتیں لینے کے شوق میں بھاگتی چلی آئی جو آپ کے پاس سعد کی کوئین آف ہارٹ کے لیے رکھی ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"یقیناً" میرے لیے وہ جو کچھ بھی ہے' دنیا کی ہر بڑی اٹریکشن سے بھی بڑی اٹریکشن ہے لیکن جس روپے کا مظاہرہ آج آپ نے کیا ہے' اسے دیکھ کر مجھے خیال آرہا ہے کہ آپ جیسے شائیلاک سے کچھ مانگنے سے بہتر ہمیشہ کی محرومی ہے' دوسروں کی ایگو اور سیلف ریسپیکٹ کو ہرٹ کرکے شاید آپ کو بھی وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو شائیلاک کو دوسروں کے گوشت کے ٹکڑے اتارنے میں ہوا کرتی تھی' بے چارے آپ۔" ماہ نور نے افسوس سے کہا۔

"اسی مسرت کو پاتے پاتے اپنا بیٹا گنوا بیٹھے' نہیں چاہیے مجھے آپ سے کچھ بھی' میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ میں وہ ہوں جسے وہ چاہتا ہے۔"

اس نے مڑ کر کمرے سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھائے۔

"تم ٹھہرو' ادھر آکر بیٹھو میرے سامنے۔" بلال سلطان کی آواز آئی۔

ماہ نور نے پیچھے مڑ کر حیرت سے دیکھا۔

"میں صرف تمہیں جج کرنے کے لیے اتنی بے رحمانہ گفتگو کررہا تھا۔" ان کا لہجہ سراسر بدلا ہوا تھا۔

"آپ نے جج کرلیا؟" ماہ نور نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

"میں ان بے رحمانہ باتوں سے پہلے ہی تمہیں جج کر چکا تھا اور مجھے کوئی شک نہیں تھا تمہارے دعوے پر۔"

"پھر آپ نے مجھے لالچی اور موقع پرست قرار دینے کی کوشش کیوں کی۔" ماہ نور کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

"میں صرف تمہارے اعصاب آزما رہا تھا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا قلم میز پر رکھ کر ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگالی، "اگر تم تھوڑا سا غور کرتیں اور اپنے اعصاب کو اس تناؤ سے بچاتیں جس کا اظہار ابھی تم نے کیا ہے تو تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ میں نے اپنے دو ماتحتوں کو تو کمرے سے باہر بھیج دیا تھا لیکن تمہیں نہیں بھیجا۔" انہوں نے ماہ نور کو جتانے والی نظروں سے دیکھا۔

"میں نے اپنے ہیڈ ہاؤس کیپر کو آج ایک خصوصی ڈنر کی تیاری کا آرڈر دیا حالانکہ میرا ڈنر کہیں اور شیڈولڈ تھا۔ اس شیڈولڈ ڈنر کو کینسل کر کے گھر پر ایک خصوصی ڈنر جس میں صرف ایک مہمان انوائیٹڈ ہے، صرف ایک مہمان۔" انہوں نے شہادت کی انگلی کھڑی کی۔

"اور وہ مہمان تم ہو گی۔"

"آپ کو کیسے معلوم میں سچ کہہ رہی ہوں۔" ماہ نور کچھ دیر انہیں حیرت سے دیکھتی رہی پھر ان کی بات پر غور کرنے کے بعد بولی۔ "آپ کو کیا پتا میں جھوٹ ہی بول رہی ہوں، ہو سکتا ہے میں واقعی لالچی اور موقع پرست ہوں۔"

"نہیں ہو سکتا۔" بلال سلطان کرسی کی پشت چھوڑ کر سیدھے ہوئے۔ "کیونکہ ایک سچا جذبہ ہی انسان کے منہ سے وہ کچھ کہلواتا ہے جو تم نے کہا وہی جذبہ اسے اتنی جرات عطا کرتا ہے جس کا مظاہرہ تم نے کیا، ورنہ میرے سامنے اکثر لوگوں کی ٹانگیں اور آوازیں کپکپا جاتی ہیں۔"

"آپ کے ماتحتوں کی کپکپاتی ہوں گی میں آپ کی ماتحت نہیں ہوں۔" ماہ نور نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں۔" وہ اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے بولے۔ "تم ماتحت نہیں ہو۔ تم میرے بیٹے کی کوئین آف ہارٹ ہو، تم بہت اسپیشل ہو۔"

ماہ نور کو لگا جیسے کمرے کی فضا یکسر بدل گئی ہو۔ ایک سرد اور جامد ماحول میں نرمی اور ایک انجانے تعلق کی گرم جوشی اتر آئی ہو۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر بلال سلطان کے ٹیبل کے قریب آئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے اسی نرمی سے اپنے سامنے رکھی چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ سعد سے کتنی محبت کرتے ہیں؟" ماہ نور نے بیٹھے بغیر انہیں ایک ٹک دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کیلکولیشنز کا ماہر ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "لیکن میں یہ کیلکولیٹ نہیں کر پاتا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ سے دور جانے کے لیے کہیں چلا گیا ہے، کسی اور سے نہیں۔" ماہ نور نے کہا۔

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"آپ نے اسے کیوں جانے دیا، آپ نے وہ سب کچھ کیوں کیا جسے جاننے کے بعد وہ یہاں سے چلا گیا، آپ اس کے پیچھے کیوں نہیں جاتے، وہ جہاں کہیں بھی ہے آپ اسے ڈھونڈ کر واپس کیوں نہیں لے آتے۔" ماہ نور چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"تم بیٹھو، ہم آرام سے بات کرتے ہیں۔" انہوں نے ایک بار پھر اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چوہدری صاحب کے پاس کراچی سے اور سنگاپور سے مہمان آگئے ہیں، چوہدری صاحب اب ان کے ساتھ مصروف ہیں، لگتا ہے چمڑے کی فیکٹری کے متعلق بات چل رہی ہے، چوہدری صاحب نے کھانے کا بندوبست کرنے کا کہا ہے اور چائے پانی منگوا کر دروازہ بند کر لیا ہے ہال کمرے کا۔ ادھر ابھی کوئی نہیں جا سکتا۔"

ماسی رشیدہ نے کھاری کو بتایا تھا۔ کھاری آپا رابعہ کو سعدیہ کے پاس بٹھا کر خود افتاں و خیزاں ماسی رشیدہ کے پاس پہنچا تھا۔ اس پر ماسی رشیدہ کا جواب سن کر مایوسی چھا گئی گویا ابھی فوری طور پر چوہدری صاحب نہیں مل سکتے تھے۔

"اور وہ مہمان، جو پہلے آئی تھی، کدھر گئی؟" اس نے بے چینی سے ماسی رشیدہ سے پوچھا۔ جو پیاز کاٹ رہی تھی۔

"وہ واپس چلی گئی ہے شاید بشیرا ڈرائیور گاڑی میں بٹھا کر لے کر گیا ہے اسے۔" ماسی رشیدہ نے پیاز سے آنکھوں میں آئے پانی کو اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب نے کل بھی سویرے سویرے نکل جانا ہے مہمانوں کے ساتھ شکار پر۔ ہیڈ قادر آباد سے فون آیا تھا چوہدری صاحب کو۔" ماسٹر کمال نے بڑے کچن میں داخل ہوتے ہوئے ماسی رشیدہ کی طرف دیکھ کر اعلان کیا۔

"ماسٹر جی! وہ پروہنی کدھر کو گئی ہے۔ جو پہلے ادھر تھی؟" کھاری مایوسی اور بے چینی کی انتہا کو پہنچنے لگا تھا۔

"وہ شہر گئی ہے بشیرے کے ساتھ پتا نہیں اس سے آگے اس نے کدھر جانا ہے، بشیرے کو ہی بتایا تھا چوہدری صاحب نے۔" ماسٹر کمال نے دودھ کے بڑے بڑے برتن اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"یا بشیرے کا نمبر تو دو ماسٹر جی!" کھاری نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔

"اوئے تجھے اس پروہنی کی فکر کیوں پڑ گئی ہے؟" ماسٹر کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آئے ہائے۔ شکل نیہ رنگ روپ وچاری ہر پاسوں (طرف سے) بخشی ہوئی تھی۔" ماسی رشیدہ ہنس کر بولی۔

"انگریزی بڑی بولتی تھی نا، کھاری کو گٹ مٹ کرنے والے مہمان بڑے اچھے لگتے ہیں۔" ماسٹر کمال نے شرارت سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"مخول چھوڑو۔" کھاری جھنجلا کر بولا۔ "ماسٹر جی یا بشیرے کا نمبر دے دو بڑی مہربانی تمہاری۔"

"مجھے کون سا زبانی یاد ہے۔" ماسٹر کمال نے کہا۔ "لے ادھر میرے موبائل میں سے دیکھ لے۔" اس نے اپنا فون کھاری کو دیا۔

کھاری نے بشیر کا نمبر اپنے فون میں محفوظ کرنے کے بعد اسے فون کیا۔

"میں مہمان کو ادھر شہر کے ایک وڈے ہوٹل میں اتار کر آیا ہوں، پر اب چوہدری صاحب کا فون آیا ہے کہ ابھی واپس نہیں آنا، ادھر ہی رہنا ہے اکبر صاحب کی طرف۔" بشیرے نے کھاری کے استفسار پر جواب دیا تھا۔

کھاری کی بے چینی اور مایوسی مزید بڑھ گئی تھی۔ مہمان اس کے دل اور دماغ میں غیر متوقع آگ لگا کر بات ادھوری چھوڑ کر جا چکی تھی اور چوہدری صاحب اپنے نئے مہمانوں کے ساتھ مصروف ہو چکے تھے۔ کھاری کے سوال، جذبات اور بے چینی کے سوا نیزے پر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

دودن زادے نے اپنے نرم گرم بستر میں لیٹے لیٹے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا، وہ اپنا گٹار صاف کر رہا تھا۔ دودن نے سر واپس تکیے پر رکھ لیا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور اس پوری عمارت پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اس روز اس سیزن کی اب تک کی سب سے زیادہ برف باری ہوئی تھی اور ویرڈیل کے تمام مہمان اسیکٹرز اور اسکیٹ بورڈرز اپنے شوق کو سر شام ہی ادھورا چھوڑ کر واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے۔ اس کاٹیج کے طعام خانے سے جہاں وہ اور سعد ٹھہرے تھے کبھی کبھار برتنوں اور چمچوں کی کھنکھناہٹ کی آواز اٹھتی تھی اور پھر ماحول پر سکوت چھا جاتا تھا۔ دودن نے اپنی گردن کے نیچے ایک چھوٹا گول تکیہ رکھا اور سعد کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس کا نیا دوست، وہ پاکستانی لڑکا کتنا بے نیاز، مگن اور پر سکون نظر آتا تھا۔ جبکہ جو حالات اس نے اپنے دودن کو سنائے تھے دودن کو یقین تھا اگر وہ خود ایسے حالات اور ذہنی کیفیت سے گزر رہا ہوتا تو یقیناً "انتشار، بے سکونی اور اضطراب اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں ہوتا اور اسے دیکھنے والا فوراً" سمجھ جاتا کہ وہ کسی دکھ، پریشانی اور

مایوسی کی کیفیت سے لرز رہا ہے‘ مگر اس سلسلے میں وودن ‘سعد کے کمال مہارت کا قائل ہو چکا تھا۔ اسے اپنی ذہنی اور دلی کیفیت کو چھپا کر پر سکون نظر آنے کا فن آتا تھا۔

”میں حیران ہوں تمہارے والد نے اب تک تمہارا پیچھا کیوں نہیں کیا‘ وہ تم تک پہنچے کیوں نہیں۔“ وودن نے یونہی سر تکیے پر رکھے رکھے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی حیران ہوں۔“ سعد نے گٹار کے تاروں پر انگلی پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ایک بے سری آواز اس کے گٹار کے تاروں سے نکلی تھی۔

”تم نے کوشش نہیں کی کہ پتا کرو‘ انہوں نے تمہارا پیچھا کیوں نہیں کیا۔“ وودن لکڑی کے گول ستون پر ٹکی چھت کے شہتیروں کو گنتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ اس نے اٹھ کر گٹار ایک کونے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ میں بھی اس بار انہیں مکمل طور پر حیران کر دینے کے موڈ میں ہوں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے‘ کبھی وہ تم سے پوچھیں گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ وودن نے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے‘ اب تک وہ جان چکے ہوں گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اور اسی لیے انہوں نے میرا پیچھا نہیں کیا جب انسان۔ مکمل طور پر عیاں ہو جائے‘ خصوصاً“ اس شخص کے سامنے جس کے سامنے وہ عمر بھر چھپتا پھرا ہو تو پھر اسے اس شخص کا کبھی سامنا نہ کرنے میں ہی مصلحت نظر آتی ہے۔“ وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تو پھر تمہارا اپنا کیا ارادہ ہے؟ مستقبل کے بارے میں تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟“ وودن اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”یہاں تو سکی سیزن چند ہفتوں بعد ختم ہو جائے گا۔ پھر تم نے آگے کہاں جانا ہے‘ کیا کرنا ہے؟“

”میں یہاں بھی بلا ارادہ آیا تھا‘ آئندہ کے لیے بھی میرا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے‘ جدھر کو اللہ لے جائے گا چل دوں گا۔“

”تم نے کبھی سوچا ہے کہ اپنے تئیں تم اپنے والد کو جو سزا دینے پر تلے ہوئے ہو اگر وہ واپس تمہیں سزا دینے پر تل گئے تو کیا ہو گا۔“ وودن نے کہا۔

”کیا ہو گا؟“ سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر انہوں نے تمہارے اکاؤنٹس منجمد کرا دیے‘ اگر تمہارے بارے میں کوئی ایسا مقدمہ درج کرا دیا جس میں اپنے ملک کے قانون کو تم فوری طور پر مطلوب ہو گئے تو وہ انٹرپول کے ذریعے....“

”ہاہا وودن!“ وہ اپنا بستر سیدھا کرتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے تم مہم جوئی کی اور جاسوسی کہانیاں بہت پڑھتے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اکاؤنٹس اول تو وہ منجمد کرا نہیں سکتے‘ کرا دیں گے تو بھی پرواہ نہیں۔“

”کرا دیں گے تو تم اپنا مکھن اور روٹی کہاں سے کماؤ گے؟“

”میں۔“ وہ آنکھیں میچ کر سوچنے لگا۔ ”ہاں!“ اس نے کچھ سوچنے کے بعد آنکھیں کھولیں۔ ”میں پکاڈلی میں سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر گٹار بجایا کروں گا۔ میرے آگے ایک کپڑا بچھا ہو گا‘ پینیز اور شلنگز بھیک میں کمانے کے لیے۔“

”ہاہا۔“ وودن زادے اس کے جواب سے محظوظ ہوا۔ ”تم یقیناً“ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔“

”اسی میں تو مزا ہے۔“ وہ کمفرٹر میں گھستے ہوئے بولا۔

”ویسے!“ بعد کمرے میں چھائی خاموشی کو وودن نے کچھ توقف کے بعد توڑا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ تم آج میرے کہنے پر سب سے بلیند رنگ میں سکی انگ کرنے سے باز آ جاؤ گے۔“

”مجھے بھی امید نہیں تھی۔“ کمفرٹر کے اندر سے سعد کی آواز آئی تھی۔ ”لیکن میں باز آ گیا۔ اب اگر مہربانی سے تم لائٹ آف کر دو تو میں تمہارا ممنون ہوں گا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

اس کی آواز بھاری ہونے لگی۔

وودن کچھ دیر یوں ہی بیٹھا سعد ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اس نے اٹھ کر روشنی بجھا دی۔



”میں نے ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ دل کی بات اگر کسی سے کہہ نہ پاؤ تو کہیں لکھ دو‘ کاغذ اور قلم تمہارے دل کی بات کا بوجھ اتارنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گے۔“

کسی کا یہ قول پرانے وقتوں میں ریکارڈ ہوا۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ میرے جیسے انسان کو قلم پکڑ کر کاغذ پر لکھنا بھول سا گیا ہے۔ میری انگلیاں ٹیکسٹ ٹائپنگ کی عادی ہو چکی ہیں۔ اسی لیے میں اپنے دل کی بات اپنے اس ملٹی فنکشن فون پر ٹائپ کر کے ایک فائل میں محفوظ کر رہا ہوں۔

”میں جانتا ہوں کہ میرا یہ فون اور.... اس میں محفوظ یہ فائل شاید تم تک کبھی نہ پہنچ پائے‘ نہ تمہیں کبھی خیال آئے گا کہ تم یہاں میرے گھر تک پہنچو‘ نہ ہی میرے گھر میں کوئی ایسا موجود ہے جو اسے پا کر دیکھنے اور پڑھنے کی زحمت فرمانے کے بعد تمہیں تلاش کرے اور تم تک پہنچ کر اسے تمہارے حوالے کر دے۔ سو یہ تو یہ مضحکہ خیز کام جو میں کر رہا ہوں‘ مگر کیا کروں میرے دل پر بوجھ بہت ہے اور مجھے اس بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ مجھے کہیں یہ بات رقم کرنی ہے ماہ نور.... کہ میں تم سے شدید محبت میں گرفتار ہوں‘ شدید ترین محبت میں گرفتار۔“

ماہ نور کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور اس سرد موسم میں بھی اس کے چہرے پر پسینہ آنے لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ اس خالی کمرے میں ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھڑکیوں پر پردے تنے ہوئے تھے اور کمرے میں ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔

وہ سعد سلطان کا کمرہ تھا۔ جس میں بلال سلطان اسے بٹھا کر گئے تھے۔ خود باہر نکل جانے سے پہلے انہوں نے اسے بھورے رنگ کے سخت کاغذ سے بنا وہ لفافہ دیا جو بھاری تھا اور پھولا ہوا تھا اور جس میں وہ امانتیں محفوظ تھیں جو سعد کی کوئین آف ہارٹ کے لیے تھیں۔ اس لفافے میں پہلی چیز جو اسے ہاتھ لگی تھی‘ وہ یہ ہی فون تھا۔ جس کی بیٹری کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ اس نے فون کے ساتھ ہی رکھے اس کے چارجر کو بجلی کے ساکٹ میں لگا کر فون کو چارجنگ پر لگانے کے بعد اس بھورے لفافے کو مزید ٹٹولا تھا۔ اس لفافے میں گڑیا کی دو بھیلیاں‘ ایک شفاف کاغذ میں لپٹی رکھی تھیں۔ ہاتھ سے بنا ایک خوب صورت پنکھا جس کے کنارے پر کپڑا لگا کر کانچ کے موتی ٹانکے گئے تھے۔ دو بھٹے جن کے دانے مرجھا رہے تھے اور سیلے ہوئے تھے اور ایک سستی سی چنری‘ چند مرجھائے ہوئے پتے اور سرسوں کے سوکھے پھول۔

اس نے حیران نظروں کے ساتھ وہ سب چیزیں دیکھیں اور ان پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی گھومتی بھٹکتی نظر کمرے کی جنوبی دیوار پر سجی پینٹنگز پر پڑی۔ وہ ان چیزوں کو وہیں چھوڑ کر اس دیوار کی طرف بڑھی۔ یہ وہی دو چار کول پینٹنگز تھیں جو سید پور کی ایگزیبشن میں سعد نے اس سے خریدی تھیں۔ ان پینٹنگز کو خوب صورت اور قیمتی فریمز میں جڑوا کر وہاں آویزاں کیا گیا تھا۔ ماہ نور کی آنکھیں ایک انجانے احساس سے بھیگنے لگیں۔

”میں ان کی منہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہوں۔“ الفاظ بازگشت کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرائے۔

”نہیں ماہ نور! میں وہ لڑکی نہیں ہوں جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ وہ لڑکی تم ہو۔“ سارہ خان نے کہیں قریب سے کہا تھا۔

”ماہ نور میرے سینے کے اندر بہت ہی گہرا کھا وہ احساس ہے جسے میں نے برتا ہے۔“

”آہ....“ سسکیوں کے درمیان بے اختیار ماہ نور کے منہ سے نکلا۔ ”وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی کہتا رہا۔ میں سب

کچھ سنتے ہوئے بھی نہ سن سکی۔"

"بدگمانی، شک، حسد اور رشک کی پٹی نے مجھے کچھ دیکھنے دیا، نہ سننے اور سمجھنے دیا۔" اس نے اپنے آنسو ہاتھ کی پشت سے صاف کیے۔

وہ واپس چارجنگ پر لگے فون کے قریب آئی۔ فون تھوڑا چارج ہوچکا تھا اور اس کی اسکرین آن ہونے پر روشن ہو رہی تھی۔ اس نے اس مخصوص فائل کو کھولا۔ جس کا پاس ورڈ کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا اسی بھورے لفافے میں بند تھا۔

"نجانے کتنی بار، نجانے کتنے موقعوں پر میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں تم سے برملا اظہار کروں۔ میں تم سے صاف صاف کہہ دوں، اپنے دل کا حال تمہیں سنا دوں، لیکن میں اپنے سارے احساسات کو دل میں دباتا رہا۔" اس نے پڑھنا شروع کیا۔

"کیوں آخر کیوں؟" ماہ نور کے دل سے سوال اٹھا۔

"بندر کا تماشا دکھانے والے اس اجڈ، گنوار، میلے کچیلے، جاہل، خانہ بدوش کو اس پہلی ملاقات میں ہی تم اتنی اچھی لگی تھیں۔ جتنا اچھا لگنے پر انسان پہلی نظر کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میں خود اپنے سامنے بارہا اعتراف کر چکا ہوں کہ وہ پہلی نظر کی محبت نہیں، پہلی نظر کا عشق تھا۔ جس میں، میں مبتلا ہوا تھا۔"

ماہ نور کا دل ایک دھڑکن چھوڑ گیا۔

"تم سے پہلے میں بہت سی لڑکیوں سے واقف بلکہ ان کے قریب بھی رہا تھا۔ لیکن تمہارے اندر سے اٹھتی اور باہر ظاہر ہوتی Purity نے مجھے یکدم حیران بھی کیا اور اپنے طلسم میں جکڑ بھی لیا۔ بھٹا کھاتی۔ اس خالص دیہاتی ماحول میں بے نیازی مگر پورے شوق کے ساتھ بندر کا تماشا اس کے کرتب سیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتی، تم کتنی Pure (خالص) لگ رہی تھیں۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا دل اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس رات سب کاموں سے فارغ ہو کر اپنے بیڈ پر سونے کے لیے لیٹتے ہی میرے تصور میں تم آگئیں اور میں دیر تک تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔ بارہا میرا دل چاہا کہ دوبارہ اسی پس منظر میں تم سے ملوں اور تمہارا بے نیاز، مگر پر شوق چہرہ دیکھوں۔

اس رات ہی مجھے لگا کہ اس دنیا میں تم سے دوبارہ ملاقات ممکن نہیں، کیونکہ تم سے وہ ملاقات محض اتفاق تھی اور میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں رانجھے کی طرح بھینسیں چرانے، میرا مطلب ہے بندر کا تماشا دکھانے کے ___ پیشے کو مستقل اپنا سکوں۔ اسی لیے میں نے کوشش کی کہ تمہارے خیال کو ذہن سے جھٹک کر سو جانا چاہیے۔" ماہ نور نے پہلو بدلا۔

"لیکن اگلے روز جاگنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ میرے لیے ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں تمہیں اور اس منظر کو بھول جانا چاہتا تھا، مگر بھلا نہیں پا رہا تھا، شاید میرے احساس میں کوئی کھوٹ نہیں تھی، جب ہی تو مجھے ایک راہ چلتے درویش نے اچانک اکتارہ بجانا سکھا دیا۔

وہ اکتارہ جس کے بارے میں، میں نے تم کو بتایا تھا کہ میری زندگی کے خوب صورت ترین احساسات میں سے ایک احساس تھا، جو اس جوگی فقیر کے اپنی واحد قیمتی چیز مجھے تحفے میں دے دینے پر مجھے محسوس ہوا تھا۔ اکتارے کو میں کیا کرتا۔ میں نے اسے کہاں اور کیسے بجانا تھا۔ یہ مشورہ مجھے نذیرے خانہ بدوش نے دیا۔ اس کے خیال میں بابے منگو کے میلے پر اکتارہ بجانے اور جوگی سے سیکھی چند کافیوں کے بول سنانے پر اس کی بستی کے لوگوں کے لیے بہت سی نیر (پیسے) اکٹھی ہو سکتی تھی۔ میں ان دنوں بھی ڈیڈی سے آف پر تھا۔ اسی لیے اکتارہ اٹھائے، بھیس بدلے بابے منگو کے میلے کی طرف چل دیا۔ اس روز میں نے سارا دن وہ اکتارہ بجایا اور چند کافیاں بار بار سنائیں۔

نذیرے خانہ بدوش اور اس کی فیملی کو اچھی خاصی آمدنی ہوگئی۔

میں وہاں اس بھیس میں اکتارہ اٹھائے کیوں گیا تھا۔ یہ مجھے سارا دن گزر جانے کے بعد شام کے قریب پتا چلا۔ وہاں تم نے مجھے نظر آنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر تم نے مجھ سے سوال کرنا تھا۔

"سائیں جی! آپ کی آواز میں اس سوز کی وجہ؟" اور مجھے بالکل بے ساختہ جواب دینا تھا۔ "عشق"

ماہ نور میں نے تو دوسری بار ملنے پر کہہ دیا تھا۔ مگر تم اتنی معصوم اور بے نیاز ہو کہ مجھے یقین ہے تمہیں کبھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا میں کون ہے اور کس سے عشق کی بات کر رہا تھا۔ مگر اس رات میں اتنا خوش اور سرشار تھا کہ میں اس کی انتہا بیان نہیں کر سکتا۔

اس روز میرے دل نے بارہا کہا۔ مجھے تمہارے پیچھے جانے اور تمہارے بارے میں پتا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وقت ہمیں خود ہی آمنے سامنے لے آئے گا۔ مجھے معلوم نہیں میرا دل ایسا کیوں کہتا تھا۔ مگر میں نے بعد میں جانا کہ وہ سچ کہتا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ تم مجھے ہر اس جگہ ٹکرائیں جہاں کا میں نے قصد کیا۔ سید پور میں مٹی کے برتن بنا کر نمائش کرنے والے عبدالکریم کمہار سے میری اتفاق سے ہی ملاقات ہوئی اور میری روپ بہروپ والی رگ پھڑکنے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس رگ کے پھڑکنے پر کمہار کا بھیس بدل کر اوٹ پٹانگ اور ٹیڑھے میڑھے برتنوں کو بنانے کی مشق کرنے کے پیچھے کون سی وجہ کار فرما تھی۔ مگر میلے والے دن اس چبوترے پر بیٹھ کر برتن بنانے کے دوران وجہ اچانک ہی میری سمجھ میں آگئی تھی۔

وہ وجہ تم تھیں اور تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میرے لیے وہ کیسی خوشی کا لمحہ تھا۔

اس روز ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یقیناً "میرا اور تمہارا ایسا تعلق بننے والا تھا جسے میرے دنیا کے کسی بھی دوسری لڑکی سے تعلق سے الگ اور منفرد ہونا تھا۔ سید پور میں دوسری ملاقات تمہاری چار کول پینٹنگز کی نمائش میں ہوئی۔ تم اپنی پینٹنگز کو خام ہاتھ کا کام قرار دیتے ہوئے جس طرح مجھے پہچاننے کی کوشش میں کنفیوز ہو رہی تھیں۔ مجھے اس دوران اپنا محظوظ ہونا نہیں بھولتا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں تمہاری چاروں پینٹنگز خرید لوں، لیکن تمہارے کنفیوز ہو جانے پر میں نے یہ خواہش ادھوری چھوڑ دی۔

میں تمہارے کنفیوژن کی وجہ جانتا تھا۔ بندر والے، سائیں اور کمہار میں نظر آتے آتے میں، تمہیں اپنے اصلی روپ میں نظر آگیا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ روپ کیا تھا اور بہروپ کیا تھا۔ جب ہی تو فوک میوزک ایوننگ میں تم مزید برداشت نہ کرتے ہوئے اس اتنے بڑے ہجوم میں اٹھ کر مجھ تک چلی آئیں۔

وہ کیا لمحہ تھا۔ ماہ نور جب بکھرے بالوں، وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی دوست کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے تم چلا چلا کر مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ میں کون تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ وہ لمحے وہیں رک جاتے اور میں تمہارا وہ کنفیوژن کی آخری حد تک پہنچا تاثر دیکھتا رہوں۔

تم جانتی ہو، اس سنگر کے لیے جو اس فوک میوزک ایوننگ میں پہلی بار پرفارم کر رہا تھا۔ وہ خبر، وہ تصویریں اور وہ ویڈیوز کتنا بڑا اسکوپ ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک امیج بلڈنگ، پروفائل بلڈنگ اسکوپ، لیکن میں ایسا کیسے ہونے دے سکتا تھا۔ کیونکہ بال بکھرائے، وحشت زدہ نظروں سے دیکھتی۔ چیختی چلاتی وہ لڑکی کوئی اور نہیں تم تھیں، تمہیں اپنی تشہیر کا ذریعہ بنانے سے بڑھ کر میری توہین کیا ہو سکتی تھی۔ وہ بھی جبکہ تم میرے ہی چھپن چھپائی گیم کا شکار ہو کر وہ سب کر رہی تھیں۔

میں نے تمہیں تمہاری دوست کے ساتھ گھر بھجوانے کے بعد نجانے کون کون سی ترکیب اور ذریعے استعمال کر کے اس خبر کو پریس میں جانے اور اس ویڈیو کو کہیں بھی اپ لوڈ ہونے سے روکا۔ میں اس سلسلے میں اتنا کریزی ہو چکا تھا کہ کئی قریبی دوست مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اس واقعے کی کئی اسٹل پکچرز اور ویڈیوز اسی فون

کی ایک فائل میں محفوظ ہیں، جس کا ٹائٹل "ماہ" ہے۔ اسے میں اکثر کھولتا تھا۔ دیکھتا تھا۔ اس واقعے کو یاد کرتا تھا اور میرے چہرے پر ایک نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔

"تھا، تھی۔" ماہ نور نے پڑھتے پڑھتے رک کر سوچا۔ "اس کا مطلب میں اور میرے لیے اس کی محبت بھی ماضی کا صیغہ بن گئی" اس نے فون کی اسکرین پر انگلی چلا کر "ماہ" نامی فائل دیکھی اور کھول لی۔

"سید پور فوک میوزک ایوننگ میں اس کے بے خود ہو کر لوگوں کے ہجوم میں کھڑے سعد سلطان کی طرف بڑھنے سے لے کر اس کے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر دھرے سعد سلطان کے ہاتھ تک، اور اسی انداز میں کھڑے اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے تک ایک ایک لمحہ کی تصویریں اس فائل میں محفوظ تھیں۔ وڈیوز جن میں تالیوں کا، سیٹیوں کا اور نعرے لگاتے، شور مچاتے ہوئے ہجوم کا شور تھا اور اس شور کے درمیان اس کا دیوانہ وار سعد کی طرف لپکنا اور اس کے بازو کو جھنجھوڑتے ہوئے اس سے سوال کرنا صاف نظر آرہا تھا۔

"اوہ خدا!" ماہ نور فون کی اسکرین کو سوائپ کرتے ہوئے واپس اس فائل پر آگئی جسے کچھ دیر پہلے وہ پڑھ رہی تھی۔

"اس واقعے کے بعد میں نے تمہارے لیے مزید کنفیوژن کا باعث نہ بننے کا فیصلہ کر لیا، تمہیں یاد ہے وہ فون کالز اور میسجز۔ میں تمہارے سامنے آنا چاہتا تھا، اپنی احمقانہ حرکتوں کا اعتراف کرنا چاہتا تھا، ان میسجز کے جواب اور کال پر بات کے دوران ہی میں اپنے بارے میں تمہاری کیفیت سے آگاہ ہو گیا تھا، قیافے اندازے لگانا تو کوئی مجھ سے سیکھتا۔"

ماہ نور ایک مرتبہ پھر اس لفظ سیکھتا پر رکی، اب اس کے ذہن میں الجھن کی کئی گرہیں پڑتی جا رہی تھیں۔

"لیکن اس کے بعد جو ہوا، وہ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔" اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ "اتفاق سے میں نے تمہاری ملاقات سارہ خان اور اختر سائیں سے کروادی، ان دو ملاقاتوں نے میری سوچ کی ساری جہت بدل ڈالی۔ سارہ خان، اور اس کی صحت تندرستی اور اس کی زندگی میرے لیے بہت اہم تھی، مگر تم نے پہلی ہی ملاقات میں اس اہمیت کو ایک مختلف نوعیت عطا کر دی، تمہارے اس جذبۂ رشک و حسد پر میں کچھ دیر کے لیے محظوظ ہوا، اور تمہاری نظر میں اپنی حیثیت پر خوش بھی، لیکن اس سے پہلے کہ میں تم پر اپنے دل کا حال کھولتا، میں خود ہی تمہیں اختر کے پاس لے گیا۔

اختر کی تمہارے بارے میں گفتگو نے مجھے ڈرا دیا، مجھے اس کی باتوں کا حرف حرف بہت اچھی طرح یاد ہے، مجھے یقین تھا کہ اختر کی بات غلط نہیں ہوتی، میری وجہ سے کبھی تم پر پریشانی آئے، میں اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس اس کے بعد میں نے خود کو اور تمہارے لیے اپنی محبت کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ہر ملاقات میں، میں نے دانستہ کوشش کی کہ تمہیں یہ تاثر دے سکوں کہ تم میرے لیے ایک نزدیک ترین دوست کی حیثیت رکھتی ہو۔ مجھے اعتراف ہے، میں غلط کرتا تھا، مجھے اعتراف ہے تمہارے معاملے میں، میں نے حماقت کی حد تک لاپروائی اور بے نیازی برتی۔ میں اپنے لیے تمہاری تڑپ اور بے قراری دیکھتا اور محسوس کرتا تھا لیکن تم سے دل کی بات نہ کہہ کر خود شاید تم سے زیادہ تڑپتا اور بے قرار رہتا تھا۔

میں نے تم سے کئی بار کہا مجھے اپنی فیلنگز کے اظہار کا طریقہ نہیں آتا۔ میں نے تم سے کہا۔ میں بے نام منزل کا مسافر ہوں جبکہ مجھے خود ایسا لگتا تھا میں ہر اس راستے پر چلنا چاہتا ہوں جو مجھے تم تک لے جائے۔ اپنے سلسلے میں تمہاری مایوسی اور بے چارگی دیکھنا میرے لیے ایک عظیم دکھ، ایک المناک ترین منظر تھا، لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے تمہیں خود سے اتنا مایوس کر دینا ہے کہ تم میرا تصور کرنا بھی بھول جاؤ۔

میں جانتا تھا کہ خود میں کتنا الجھا ہوا انسان تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خود کو محروم ترین شخص سمجھتا تھا،

ڈیڈی کے رویوں اور ان کے گریز نے مجھے اپنی ماں کے سلسلے میں جنونی بنادیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں اپنی ماں کو کہیں ڈھونڈ لینے یا ان کا کوئی نشان پانے کے لیے کیسا بھٹکتا پھرتا تھا۔ میرے سارے روپ' بہروپ' میرا ہر عمل' ہر غیر معمولی اور ناقابل یقین جگہ پر موجود ہونا صرف ماں کا نشان پانے کے لیے تھا۔ ڈیڈی نے اس سلسلے میں اتنی کہر آلود خاموشی اختیار کررکھی تھی جس کو توڑنا میرے لیے کبھی ممکن نہیں رہا۔

میرے اردگرد' آگے پیچھے کوئی بھی شخص میری ماں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا' نہ صرف یہ بلکہ ہر شخص ان کے بارے میں کوئی بات بھی کرنے سے گریزاں دکھائی دیتا تھا۔ اس جامد خاموشی نے ہی میرے اندر وہ تڑپ پیدا کردی جسے تم نے بھی دیکھا اور جس سے ابراہیم اور اختر بھی واقف ہیں۔ میرے سب غیر معمولی رویّے اور عمل اس تڑپ ہی کا نتیجہ تھے۔

کبھی سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ سب ایب نارمل رویّے تھے۔ روپ بدل کر ایسی جگہوں پر چلے جانے سے کیا میری ماں کبھی مجھے مل سکتی تھی یا ان کا کوئی نشان میں پاسکتا تھا۔ مگر تم جانتی ہو ہر انسان کے ری ایکشنز مختلف صورت حالات میں مختلف ہی ہوتے ہیں۔ میرے ری ایکشنز نے میرے دونوں راستے کھوٹے کردیے' نہ میں اپنی ماں کی طرف جاپایا نہ ہی تمہاری طرف' میرے ہی جیسے لوگ ہوتے ہوں گے جو سب کچھ اختیار میں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ پاتے ہوں گے۔

میرے ساتھ عجیب ہی قصہ ہوا' اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا جنون میرے باپ کو میرے سامنے ایکسپوز کرتا گیا اور جوں جوں میں ان کے بارے میں جانتا گیا ویسے ویسے ہی ڈیڈی سے میرا رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا' تمہیں یاد ہوگا' میں نے تم سے کہا تھا۔ مزاج کی سب پیچیدگیوں کے باوجود مجھے اپنے ڈیڈی بہت عزیز ہیں۔ مگر جیسے جیسے میں ڈیڈی کے بارے میں جانتا گیا انسان پر' انسانی تعلق اور انسانی رشتوں پر سے میرا اعتبار اٹھتا چلا گیا۔

میں تمہیں تمہارے چچا چوہدری سردار سے سنی وہ بات نہیں بتاؤں گا ماہ نور! جس کو سننے کے بعد مجھے تمہاری کے غیر اہم وجود کی اہمیت کا علم ہوا' میں تمہیں اپنے اندر اٹھتے اس طوفان کی خبر بھی نہیں سناؤں گا جس نے مجھے چچا سردار کے فارم ہاؤس سے آنا "فانا" نکل جانے پر مجبور کردیا' مگر میں تمہیں نور فاطمہ کے ہالٹ کے بارے میں ضرور بتاؤں گا جس کو میں نے سمجھتے ہوئے بھی اگنور کردیا۔

نور فاطمہ' میرے لیے ایک تنبیہہ کی علامت تھی یا کسی نئے سبق اور تجربے کی' میں اس معاملے پر غور کرنا اور سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن تمہارے لیے میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ ایک بار تم کوٹلی فقیر چند کے سولنگ کے ساتھ تاحد نظر نظر آنے والے سبز کھیتوں کے درمیان بنی اسی کچی جھونپڑی میں ضرور جاؤ اور کچھ وقت وہاں گزار کر دیکھو' کیا تمہیں بھی وہاں صبر اور تشکر مٹی کی ان دیواروں سے لپٹے محسوس ہوتے ہیں' کیا تمہیں بھی وہاں رہ کر سکون اور طمانیت کا وہ احساس ملتا ہے جو جسم و جاں' روح و ذہن میں اٹھتے غصے' انتقام اور سب کچھ بھسم کردینے کے ارادے باندھنے والے شعلوں کو یکدم بجھا سا دیتا ہے۔

میرا دل چاہتا ہے ماہ نور! تم ایک بار صرف ایک بار نور فاطمہ سے ضرور ملو' اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میل ملاقاتوں کے سلسلے میں تمہارے اپنے اسٹینڈرڈز ہیں اور تم اس سلسلے میں میرے فلسفے سے بالکل بھی متفق نہیں ہو' مجھے خانہ بدوشوں کی بستی میں تمہیں لے جانے والا واقعہ بھولا نہیں ہے' پھر بھی اگر کبھی مزاج گوارا کرے تو تم وہاں ضرور جاؤ۔

ماہ نور! میں تمہیں فضل حسین اور میمونہ آنٹی سے ملاقات میں ملنے والی معلومات اور فلزا ظہور کے سینے میں انی کی طرح گڑے دکھ کا احوال بھی نہیں سناؤں گا کیونکہ ان سب باتوں کا تم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"فلزا ظہور۔" ماہ نور نے رک کر سوچا "فلزا ظہور کا کسی بھی بات سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

"میں تمہیں یہ سب اس لیے بھی نہیں بتاؤں گا۔" اس کی نظریں دوبارہ فون کی اسکرین پر دوڑنے لگیں۔ "کہ تم ان باتوں کو کسی تیسرے فرد کے سے کان سے سنوگی اور کسی تیسرے فرد کی سی نظر سے دیکھوگی' تمہارا ان کے سلسلے میں تجزیہ یکسر مختلف ہوگا' اور میں تمہیں کبھی سمجھا نہیں پاؤں گا کہ ان سب باتوں نے جو میں نے سنیں اور ان سب حقیقتوں نے جن کا میں نے نظارا کیا' میرے ذہن و دل پر کیا اثر کیا۔ تم شاید یقین نہ کرپاؤ وہ سب جان کر دنیا کی ہر چیز کی اہمیت میری نظر میں صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے اپنا وجود بھی خلا میں معلق ادھر سے ادھر تیرتا پھرتا محسوس ہوتا ہے' میں کیوں ہوں' مجھے کیا کرنا ہے' مجھے کس راستے پر چلنا ہے' میری سمجھ سے ہر سوچ ختم ہوتی چلی جارہی ہے' اپنی بے وجودی کا احساس بڑھتا چلا جارہا ہے۔ وہ لوگ جو میرے باپ کی خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھے' ان کا غم دنیا کے ہر احساس پر حاوی ہوتا چلا جارہا ہے۔ کبھی اپنے باپ کو ختم کردینے کو دل چاہتا ہے اور کبھی خود اپنے آپ کو' اور کبھی دل چاہتا ہے ساری دنیا کو تباہ و برباد کردوں۔

جو میری کیفیت ہے ماہ نور! اس میں مبتلا ہونے کے بعد میں نے بارہا شکر ادا کیا۔ میں تم پر تمہارے لیے اپنے جذبات ظاہر نہ کرپایا۔ اگر اظہار کرچکا ہوتا تو اپنی بے وجودی سمیت تمہارے لیے کتنا بڑا عذاب بن جاتا۔ بہت سوچنے کے بعد سمجھ میں آیا ہے کہ میں اپنے تینوں ارادوں میں سے کسی ایک کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکتا' نہ ہی میں وقت کا پہیہ الٹا چلا کر ساری غلط چیزوں کو درست کرسکتا ہوں' اس لیے میرے لیے بہترین راستہ یہ ہی ہے کہ میں اس پورے منظر سے آؤٹ ہوجاؤں۔ اپنے باپ سے اتنا دور چلا جاؤں کہ جتنی دوری پر جانے کے بعد انہیں ایک بار احساس ہوجائے کہ جن دلوں کو' جن رشتوں کو انہوں نے ایک دوسرے سے دور کیا۔ ان پر عمر بھر کیا گزری ہوگی۔

میں نہیں جانتا میں غلط کررہا ہوں یا صحیح۔ اختر کی باتیں اور نور فاطمہ کی جھونپڑی مجھے غلط قرار دیتی ہیں' مگر میرا تعقل مجھے درست کہتا ہے' ایک عمر میں نے ایک انجانے تعلق کی تلاش میں جگہ بے جگہ بھٹکتے گزاری۔ اب میں رک کر محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی کی گہما گہمی اور اس کے سب کام' انسان کے سب پرانے تعلق جب رک جاتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے ہیں اور صبح مجھے یہاں سے چلے جانا ہے' اس درمیانی وقفے میں مجھے کچھ اور نہیں سوجھ رہا' اس لیے یہ باتیں تمہارے لیے یہاں لکھے چلا جارہا ہوں' میرے یہ لفظ جنہیں شاید ہمیشہ ہی اس فائل میں محفوظ بند پڑے رہنا ہے' نہ کبھی تمہاری اس فائل تک رسائی ہوپائے گی نہ ہی تم یہ سب پڑھ پاؤ گی' لیکن میں نے اپنے دل کے سارے جذبے اور دماغ کی ساری منتشر سوچیں اس کے حوالے کیں اور ان کا مخاطب تمہیں بنایا' اس لیے ماہ نور! کہ میں یہ سب اگر کبھی کسی سے شیئر کرنا چاہتا تو وہ صرف تم ہوتیں۔

تم جو میری کوئین آف ہارٹ ہو' تم جو میری واحد محبت ہو۔ تم جو کبھی میری باتوں' میرے اشاروں اور میری نظروں میں چھپے پیغام کو پڑھ سکیں نہ ہی سمجھ پائیں۔

تم جس نے خود ہی سے سارہ خان کو اپنی رقیب روسیاہ سمجھ لیا' اور اس سے رشک اور حسد کے رشتے میں خود کو باندھ بیٹھیں۔ کبھی جو میں تمہارے چہرے پر پھیلے رشک و حسد کے اس احساس کو یاد کرتا ہوں جو سارہ کے ذکر پر اپنا آپ چھپانہ پاتا تھا تو مجھے تم پر پیار آتا ہے اور میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ تم جو صاف چھپتی بھی نہیں تھیں اور سامنے آتی بھی نہ تھیں مگر مجھ سے کیسے بچ پاتیں' لو ایٹ فرسٹ سائیٹ کا سوال پوچھنے والی تم نے کتنی امید کے ساتھ مجھ سے جواب مانگا تھا۔

تمہارے سوال کو ٹالتے ہوئے میرے دل پر بھی قیامت گزری تھی اور اس روز مجھ پر بھی یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ محب اپنے محبوب کو کبھی آزمائش میں نہیں ڈالتا' اختر نے کہا تھا۔ تم میری وجہ سے آزمائش میں پڑوگی۔ اس

کی اسی بات کو دل سے لگا کر میں تم کو اور تمہارے جذبے کو نظر انداز کرتا رہا۔ مجھ سے تمہاری بدگمانی میرے سر آنکھوں پر سویٹ ہارٹ، مگر تمہاری آزمائش مجھے کسی طور قبول نہیں۔"

ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے، فون کی اسکرین اس کی نظروں کے سامنے دھندلی ہو رہی تھی۔

"تمہارے لیے میرے دل میں بہت دعائیں ہیں اور بے شمار خواہشیں، تم مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو، خدا کرے تم ہمیشہ مسکراتی رہو۔

تمہارے شانوں پر پڑے بال تمہاری اپنی کسی بھی کوشش کے بغیر اتنے سجے ہوئے اور شان دار لگتے ہیں کہ انہیں کسی بھی ہیئر ڈریسر کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔

تمہاری آنکھوں کی چمک ستاروں کی چمک کو ماند کر دیتی ہے، خدا کرے تمہاری آنکھوں کی یہ چمک ہمیشہ اسی طرح قائم رہے، کیونکہ لڑکی تمہیں خدا نے جیسا بنایا ہے تمہارا ویسا ہونا ہی دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔

خدا کرے تم ہمیشہ ایسی ہی رہو جیسی تم ہو، کم از کم میرے خوابوں میں، میری سوچوں میں، میرے تصور میں تم ہمیشہ ایسی ہی رہو گی جیسا خدا نے تمہیں بنایا ہے۔

میں اس فون کے ساتھ نور فاطمہ کے دیے وہ تحفے جو اس نے مجھے میری دلہن کے لیے دیے تھے، تمہارے لیے رکھ رہا ہوں، کیونکہ اگر جو میں اتنا خوش قسمت ہوتا کہ تمہیں پا سکتا تو میں یہ سب چیزیں تمہیں ہی دیتا۔ اب نجانے کتنے برس یا شاید ہمیشہ یہ یونہی پڑی رہیں گی، تم کبھی ان تک پہنچ پاؤ گی نہ انہیں دیکھ پاؤ گی کیونکہ میں اتنا خوش قسمت تو ہوں ہی نہیں کہ میرا اظہار تم تک پہنچ پائے، لیکن کاش یہ پہنچ پائے۔

لیکن کبھی سوچتا ہوں، کاش یہ کبھی تم تک نہ پہنچے۔ کیونکہ مجھے تم سے صرف محبت ہوتی تو شاید تمہیں میرا اعتراف اور اظہار تکلیف نہ دیتا، مگر کیا کیا جائے کہ مجھے تم سے صرف محبت نہیں، مجھے تم سے عشق ہے ماہ نور! عشق جو پھولوں جیسی زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ تم تک یہ الفاظ اور یہ اظہار پہنچے یا نہ پہنچے، میرے دل کا ایک بوجھ تو اس فائل میں منتقل ہو گیا، میں نے کسی کو تو شریک راز کر لیا۔"

آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے پار دھند بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ الفاظ معدوم ہونے لگے تھے۔



"آپ اب آئے ہو صاحب! فقیر تو کئی سالوں سے کٹیا جمائے یہاں بیٹھا ہے، فقیر کا ور اک منتظر تھا اور اس کی حسیات گواہی دے رہی تھیں کہ آپ کبھی تو آؤ گے ہی۔" اختر نے اپنے سامنے بیٹھے بلال سلطان سے کہا۔

"راستہ کھلے اور قدم مڑیں، آنا تو تب ہی ممکن ہوتا ہے سائیں اختر!" بلال نے نیچی آواز میں کہا اور اختر کی کٹیا کے فرش پر بکھرے تنکوں پر نظر جمالی۔

"یہی تو عرض کر رہا ہوں کہ راستہ بھی کھلنا تھا اور قدم بھی مڑنے ہی تھے بس وقت کا تعین انسان کے بس کی بات نہیں۔" اختر نے گڑ گڑی ہاتھ سے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ جیسوں کو پہنچاننے کے لیے جس نظر کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھیں اب ہی عطا ہوئی۔" بلال نے بدستور گھاس کے تنکوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"کمال کی بات تو یہ ہے کہ آپ سے کہیں پہلے وہ نظر سعد سلطان کو عطا ہو گئی۔" اختر ہلکا سا مسکرایا۔

"اس کو نظر عطا ہو چکی ہوتی تو حقیقت بھی روشن ہو جاتی، اس کی نظر تو چوک چکی جب ہی اس نے سامنے نظر

آتی حقیقت سے منہ موڑلیا۔" بلال کے لہجے میں شکوہ اُترا۔

"آپ سمجھتے ہو' یہ اس کا قصور ہے کہ اس کی نظر چوک گئی' آپ سمجھتے ہو' اس نے سامنے نظر آتی حقیقت سے منہ موڑلیا۔" اختر نے سوال کیا۔

"نہیں۔" بلال نے سرہلایا۔ "میں اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں' لیکن اس بات سے بھی متفق نہیں ہوں کہ اس کو نظر عطا ہو گئی' وہ عطا ہو چکی ہوتی تو میری قصوروار ی اس کے راستے کا پتھر کبھی نہیں بنتی۔"

"ہا ہا!" اختر بے اختیار ہنس دیا۔ "میں ان سے کہتا رہا باؤ صاحب! یا زن پالو یا من پالو' وہ دونوں کے درمیان پھنس کر رہ گئے اور جب دونوں کی گرفت سے نکلنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آیا تو دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا۔"

"وہ کہاں گیا سائیں اختر اور اسے کب واپس آنا ہے؟" بلال کے لہجے میں اضطراب اترا۔

"اس نے سب جانتے ہوئے منہ موڑا ہے صاحب! آپ کے گریز نے اسے حقیقت کا سامنا ہو جانے پر اس کے سچ اور جھوٹ' صحیح اور غلط کی کھوج میں جانے سے پہلے' حقائق و واقعات کا نتارا کرنے سے پہلے ہی منہ موڑنے پر مجبور کر دیا' میں نے اس سے کئی بار کہا "اس سے منہ نہ موڑنا جو تم سے سچا پیار کرتا ہے۔ راستہ کھوٹا کر بیٹھو گے' راستے کے ادھر ادھر بکھرے چھوٹے چھوٹے پتھر ایک جگہ جمع ہو کر تمہارے لیے ایک ایسا کوہ گراں بن کر رہ جائیں گے جسے سر کیے بغیر نہ من کو مکمل طور پر پاسکو گے نہ زن کو۔" اختر کے لہجے میں تاسف تھا۔

"لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ اس کی عمر ہی ایسی ہے' جو بندے کی نظر کو چوک کا شکار کر دیتی ہے۔ اسے نور فاطمہ کی جھونپڑی اور اس کی مہمان نوازی پر بھی شک ہونے لگتا ہے اور اختر کے ڈیرے کے لنگر کے شربت میں بھی ملاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ اوپرے دل سے اگر کوئی کام کر بھی لیا جائے صاحب تو اس کی worth وہ نہیں رہتی جو پورے دل سے کیے کام کی ہوتی ہے۔ اب اس نے خود کو راستے کی آزمائش میں ڈال لیا ہے' یہ کوہ گراں سر کیے بغیر اس کی واپسی ناممکن ہے۔"

"سب میرا قصور ہے سائیں اختر!" بلال نے سرہلایا "میں جو خود کو دنیا کا بہترین کیلکولیٹر سمجھتا تھا' شمار ہی نہیں کر پایا کہ حالات کا رخ کدھر کو مڑ رہا ہے اس کے لاابالی پن کو اس کی شخصیت کا حصہ سمجھ کر دانستہ نظرانداز کرتا رہا' کاش کبھی اسے بٹھا کر حالات کی تفصیل سنا دیتا اور واقعات کا بیان بھی' میری ہی وجہ سے وہ اپنا راستہ کھوٹا کر بیٹھا' من بھی اس کی دسترس میں تھا اور زن بھی' میری ہی وجہ سے وہ دونوں سے منہ موڑ گیا' آپ جانتے ہو سائیں جی!" انہوں نے اختر کی طرف دیکھا۔ "میری زندگی کے سارے اکاؤنٹس پچھتاووں کی دولت سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے زندگی کے ہر اہم محاذ پر مناسب وقت کا انتظار کرنے میں وقت ضائع کر کے مار کھائی ہے۔ میری گنتی اور میرے شمار سب میری عقل کا دھوکا ثابت ہوئے۔" انہوں نے تاسف سے سرہلایا۔

"آپ جیسے انسان پر اللہ کا یہ کرم بھی بڑا خاص ہے صاحب کہ اس نے آپ کو اپنے قصور کا اعتراف کرنے' پچھتاووں کو کیلکولیٹ کرنے اور کسی کے سامنے سر جھکا کر بیان کرنے کا موقع عطا فرما دیا۔ اب جائیے اپنی ساری اغلاط کو درست کرنے میں کچھ وقت صرف کیجئے۔ زندگی کی بساط کے جو مہرے غلط خانوں میں چلے گئے' انہیں واپس ترتیب دینے کی کوشش کیجئے۔ فقیر کو یقین ہے کہ بگاڑ ہے تو سہی مگر اتنا نہیں جتنا آپ سمجھ بیٹھے ہیں' بس ایک دست مسیحا پھیرنے کی دیر ہے' بہت سی اغلاط درست ہو جائیں گی کیونکہ آپ کی نیت میں کھوٹ تھا نہ من میں جھوٹ۔"

بلال نے چونک کر اختر کی طرف دیکھا' وہ گڑگڑی کے کش لگاتا ہوا ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا' اس کی

نظریں انہیں یقین دلا رہی تھیں کہ جو کچھ اس نے کہا وہ سچ تھا۔

☼ ☼ ☼

"آج موسم کی صورت حال اس روز سے بھی زیادہ عجیب ہے۔" وودن نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "برف گرتی ہے' گرنا بند ہوتی ہے اور سورج اپنی روشنی بکھیرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے' بادل اور آسمان سے گرتی برف اپنا زور لگا کر پھر سے میدان میں آتی ہے اور نظر کو دھوکا دینے میں خاصی حد تک کامیاب ہو جاتی ہے۔ میں تو آگے نہیں جاؤں گا۔ یہیں بیٹھ کر لفٹ کا انتظار کروں گا' لفٹ آتی ہے تو واپس چلتے ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے' تم مجھے سکی انگ کرنے کے بجائے آتشدان کے پاس بٹھا کر دنیا بھر کی گپ بازی میں مصروف رکھنا چاہتے ہو۔" سعد نے اپنا ہیلمٹ درست کر کے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو' میں یہاں سکی انگ کرنے آیا ہوں' برائے مہربانی مجھے وہ بھی کر لینے دو۔"

اسے سامنے تاحد نظر سفید برف نظر آ رہی تھی اب تک وہ سکی انگ کی شوق میں اتنا طاق تو ہو ہی چکا تھا کہ اس اونچائی کے پورے راستے پر پھسلتا اس کی آخری حد دیکھ کر واپس آ سکے۔

"نہیں۔ اس غیر یقینی موسم میں تو ہرگز نہیں' یہ ایک ایسا دن ہے' جس کے بارے میں پیش گوئی بھی نہیں کی جا سکتی' کب کیا صورت حال ہو۔" وودن زادے نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"آتش دان کے پاس بیٹھ کر پروٹین سے بھرپور غذا کھاتے کھاتے تم چند دنوں میں بوڑھے ہو چکے ہو وودن! اس دن تو تم ایسے نہیں تھے جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا۔" سعد نے اپنی سکی اسٹکس پر وزن ڈالتے ہوئے کہا۔

"چلو پھر بوڑھے انسان! تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو' میں ابھی آیا۔" اس نے اسکیٹس پر دباؤ ڈال کر آگے پھسلتے ہوئے کہا۔

"سعد! بات سنو۔ صرف میں ہی نہیں تم بھی آگے نہیں جا رہے۔" وودن بلند آواز میں بولا مگر اس کی بلند آواز اس چہار سمت پھیلی خاموشی سے ٹکرا کر واپس اسی تک آ گئی تھی' اس کا مخاطب آگے آگے پھسلتا اس کی نظر سے کہیں فاصلے پر جا چکا تھا۔

"سعد! سورج کی کرن ایک بار پھر نمودار ہونے کی کوشش کر رہی ہے' واپس آ جاؤ۔ تمہاری نظر ابھی اتنی پختہ نہیں ہوئی کہ برف پر پڑتی سورج کی کرن کے زاویے کو جانچ سکے۔" وودن بے قراری سے اٹھ کر آگے بڑھا تھا مگر اس کی آواز اس کے دوست کے کان تک پہنچ نہیں پائی تھی۔ وہ بے بسی سے وہاں کھڑا اسے آگے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے سورج کی کرن نے ایک بار پھر بادلوں سے مات کھائی اور برف کے گرتے گالوں کے پیچھے چھپ گئی' اس وقت کے کسی ہزارویں حصے میں اس کی سامنے دیکھنے کی کوشش میں سکڑی آنکھوں نے سعد کے وجود کو کئی فٹ اوپر اچھل کر کہیں دور گرتے دیکھا تھا۔ وہ بے قراری سے آگے پھسلتا سعد کے قریب چلا گیا تھا۔ اس کے پاکستانی دوست کا وجود نظر کے دھوکے کا شکار ہو کر برف کے پہاڑ پر ساکت پڑا تھا۔ کائنات میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا چکی تھی اور برف کے گالے سک سک کرتے تیزی سے سعد کے بے حس و حرکت پڑے وجود کو ڈھانپ رہے تھے۔

(باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ)

"شہر بے مثال ہے۔" اندرون لاہور۔۔۔ موچی دروازہ۔۔۔ محلہ سیداں۔۔۔ نیلی گلی۔۔۔ اندھیر گلی۔۔۔ ذرا سا بادل چھا جائیں تو ایسا لگے کہ زمین پر کبھی روشنی کی کرنیں اترتی ہی نہیں۔

بہار کبھی برسی ہی نہیں۔۔۔ پھول، پودے، درخت۔۔۔ رنگ، خوشبو کبھی مہکے ہی نہیں۔

اسی نیلی گلی کے پہلے گھر کی گھپا میں بادل تو کبھی برسا ہی نہیں۔ دھوپ تو کبھی چمکی ہی نہیں۔۔۔ جاڑا ٹھہرا گیا۔ نرم گرم تو کبھی ہوا ہی نہیں۔۔۔ نیلی گلی کا یہ پہلا کنارے والا گھر میدے کا ہے۔ میدے کی بیوی کا ہے۔۔۔ دونوں میاں، بیوی کے گیارہ بچوں کا ہے۔۔۔

انگلیوں پر کئی کئی بار گن کر سوئی تھیں۔ ویسے تو وہ اب حساب میں اتنی تیز ہو چکی تھیں کہ کھڑے کھڑے کئی سو جوڑوں کا حساب لگا کر کئی گاہک بھگتا کر انگلوں کا انتظار کرنے لگتیں، پر انہیں یہ حساب کتاب کرنے کروانے میں مزا بہت آتا تھا۔ اس حساب کا حاصل جمع انہیں بڑی مسرت دیتا تھا۔ اس حاصل جمع سے وہ شاہ عالمی، انار کلی بازار جا جا کر کئی سو مسرتیں خریدتیں۔۔۔ تو اتنا مسرت آمیز کام کوئی بار بار کیوں نہ کرے۔

جمیل اتنی بار لکھ لکھ کر تھک چکا تھا۔ "اماں بس بھی کرو۔۔۔ روز لکھوانے بیٹھ جاتی ہو۔۔۔ کب آئے گی تھانے دارنی۔"

"تجھے دو لفظ لکھتے موت پڑتی ہے۔ اسے دیکھ اپنے

سمیرا حمید



اور۔۔۔ اور۔۔۔ جمال۔۔۔ ہاں جمالے کا بھی تو۔۔۔ اسے بھی یہیں کہیں ادھر ادھر ہونا تو چاہیے، اسی گھر میں، زندوں میں، گیارہ بچوں میں ہی، یہیں کہیں ہی، ہاں ہاں وہ اسی گھر میں ہے۔ زندوں میں ہی ہے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ خیر۔۔۔ خیر۔

ہاں تو میدے کی بیوی گیارہ بچوں کی اماں پانچویں میں پڑھنے والے سب سے چھوٹے جمیل کو پاس بٹھائے کوئی گیارہویں بار بول بول کر حساب لکھوا رہی ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں رہنے والی تھانے دارنی کے بڑے بیٹے کی شادی کے پورے دو کم پچاس سوٹ سل کر گئے تھے۔ اماں نے انچ انچ کا حساب لکھوایا تھا۔ راتوں کو

بھائی کو، وہ سی سی کر نہیں تھکتا۔" اماں نے حسب عادت پیشانی سے بالوں کا گچھا پکڑ کر مروڑا۔

جمیل نے سر جھٹکا۔ "انسان ہیں ہم۔۔۔ جن وِن نہیں۔"

"ایک وقت میں پانچ پانچ کلچے کھا جاتا ہے۔ تب بھی تو انسان ہی ہوتا ہے نا۔"

"وہ پدے پدے سے کلچے۔۔۔ تیرا ڈر نہ ہو اماں تو دس کھا جاؤں۔"

"مجھے تو تجھ سے ڈر لگتا ہے کہ ہمیں ہی نہ کھا جائے۔۔۔ چل لکھ۔"

"لکھ تو لیا سب۔"

"چل اب جمع کر۔"

اس نے جمع کیا۔۔۔ دس بار کر چکا تھا اماں اپنی انگلیوں پر پھر سے کوئی ہزارویں بار جمع کر رہی تھیں۔ کالی اماں کی گود میں پٹخ کر، چلا کر حاصل جمع بتاتا جمیل بھاگ گیا۔

"منحوس مارے نے تیس روپے کی غلطی کی۔ دس بار کروایا، پر کبھی سو چھوڑ دیتا ہے، کبھی پچاس۔۔۔ ہزار بار کہا ہے 'اتنا چلا کر مت بتایا کر، میرے کان میں بتایا کر۔ نظریں لگی رہتی ہیں سب کی میرے گھر۔ کھا جائیں گی نظریں ہمیں۔ میڈ میں یہاں کا رستہ بھول جائیں گی۔ جتنا لوگ سال میں نہیں کماتے، میرا جمالا مہینے میں کما لیتا ہے۔ پر یہ میرے کم بخت مارے بچے۔ کھلا کھلا کر میں نے ہی ان کی عقلوں پر چربی چڑھا دی۔ سنڈے مسٹنڈے بھوکوں مریں تو عقل پکڑے کہ دو نوالے بھی کھاؤ چھپا کے۔۔۔ روکے کہ ہمارے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں، تبھی دنیا کی نظروں سے بچے گا کچھ۔"

تھانے دارنی سر بہت کھاتی تھی۔ اسی لیے اماں نے ذرا دفتری طرز کی فہرست بنوالی تھی۔ ایک ایک سوٹ کے آگے رقم لکھی تھی۔ لہنگے کے ہوئے پینتالیس سو دو ساڑھیاں بارہ بارہ سو، چوبیس سو، دو ہزار چار سو، ہاں تین شرارے، چھ عدد انارکلی، آٹھ ہاتھی کان کے سے پاجامے، تنگ قمیصیں، کھڑے پاجامے، لنگی شلواریں، انگرکھے، کشمیری طرز کی پشوازیں، کچھ میگزین کے فیشنی کپڑے، دو کم پچاس۔

ابھی تھانے دارنی نے آکر اس میں کٹوتی کروانی تھی۔ جھک جھک کرنی تھی۔ تھانے دارنی ہوگی تو اپنے گھر، اماں تو پورا تھانہ کھول کر بیٹھ جانے والوں میں سے تھیں۔

میں نے کہا تھا لہنگے کا پچیس دوں گی۔ کہا تھا کہ نہیں، زمرد جڑی پستول مار کہ انگلی اٹھا کر تھانے دارنی نے دبنگ کہا۔

"میں نے بھی کہہ دیا تھا پینتالیس سے ایک روپیہ کم نہیں لوں گی۔" اماں پستول مار کہ سے ذرا نہ دبکیں "اچھا چلیں یہ بتائیں آپ کی لندن والی بہو نے کسی دھاگے سلائی کی شکایت کی ہو؟ ہوئی اسے خبر کہ لہنگا ڈیفنس گلبرگ سے دس پندرہ ہزار میں نہیں اندرونی شہر سے اپنے جمالے سے صرف پینتالیس سو میں سلا ہے۔ سنا ہے لندن والیاں اتنے کی تو وہ لمبی لمبی باریک جرابیں خرید کر پہنتی ہیں۔"

تھانے دارنی باریک پتلی لمبی جرابوں کے ذکر پر بہت جزبز ہوئی۔ بھلے سے کانوں سے دھواں نکالتی اماں نے کرنی اپنی ہی تھی۔ کل میں سے صرف دو سو ہی کم کیے۔ ڈھائی تین گھنٹے بحث چلتی رہی۔ آخری دھمکی کام کر گئی۔

"جناب جی ابھی تو سرکار نے ایک ہی بیٹے کی ہے خیر سے دو بیٹے اور ایک بیٹی بیاہنے کو ہیں، ڈیفنس گلبرگ سے سلوا کر شوق پورا کریں گے تو اتنے میں تو وہ چھ سات سوٹ سی ہی دیں گے۔"

دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو بیاہنے کے لیے تھانے دارنی پیسے پکڑا گئی۔ انٹرنیٹ سے تصویر ڈاؤن لوڈ کر کے اس کی بیٹی جمالے کو دکھا کر سمجھا گئی تھی۔ صرف اسی ٹیل ساڑھی کے گلبرگ والے نو ہزار مانگ رہے تھے۔ تو پھر جمال زندہ باد، اماں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ گنے بار بار گنے۔ ہاں اتنے ہی تھے جتنا راتوں کو اٹھ اٹھ کر حساب لگایا تھا۔ وہی حاصل جمع تھا۔ وہی تھا سب کا سب۔ رکشہ کروایا اور رابعہ کا جہیز لینے شاہ عالمی آگئیں اماں۔ قسم قسم کے برتن لیے۔ یہ بڑی بڑی میڈ موں ٹائپ کی دکانوں میں گئیں۔ سات ہزار کا تو صرف اماں نے وہ چمچہ سیٹ لیا جس کے کنارے سنہری تھے اور جن میں مرتے دم تک آئینے سی شفاف صورت نظر آنے والی تھی۔ یہ سیٹ دنیا سے ناپید ہی نہ ہو جائے۔ اماں نے جھٹ سے لے لیا۔ ہاں آتے ہوئے ریڑھی سے وہ پندرہ روپے کی ریوڑی لینا نہیں بھولیں۔ جمالے کو پسند تھی نا ریوڑی۔۔۔ کھاتا جاتا سلائی کرتا جاتا۔ ختم ہو جاتیں تو بھی سلائی کرتا جاتا، بھوکا ہوتا تو بھی۔۔۔ بیمار ہوتا تو بھی۔۔۔ خوش ہوتا (جو ہونے کا موقع ملا نہ دیا گیا۔) دکھی ہوتا، افسردہ، بے چین، جی کرتا نہ کرتا وہ سلائی کیے جاتا، کیے ہی جاتا۔۔۔ جیسے دنیا بھر میں ایک وہی ہے جو سب کو کپڑے سی سی کر پہنا رہا ہے۔۔۔ صرف وہی ایک درزی ہے جہاں بھر میں۔۔۔ اس منصب پر صرف اسے ہی فائز کر دیا گیا ہے۔

پیارا جمال۔۔۔ زہیب (سونے کا) جمال۔۔۔ روز کئی کئی انڈے دیتا۔۔۔ تھک جاتا تھا اور تھکتا نہیں تھا۔ اوب جاتا تھا۔ پھر بھی لگا رہتا تھا۔

دائیں ٹانگ میں پیدائشی لنگ تھا۔ چھ سال کا تھا۔ دایاں ہاتھ جل گیا۔ اماں نے گھر میں ہی پٹی کر دی۔ دس، پندرہ دن بعد کھولی، ہاتھ مٹھی صورت بند ہو گیا۔ زخم الگ گل سڑ گئے۔ پانچ روپے کی پرچی پر اماں دوا لیتی رہیں۔ مہینوں بعد زخم ٹھیک ہو گیا۔ ہاتھ ویسا ہی مٹھی صورت رہا۔ چاروں انگلیاں زور لگانے سے ذرا سی کھل جاتیں۔ سب نے کہا "مزدوری سے تو گیا۔ کسی دکان یا ہوٹل میں رکھوا دو۔"

اماں نے درزی کی دکان پر بٹھا دیا۔ تین سال ایک استاد کے پاس رہا، سلائی کٹائی سیکھ لی۔ اب قینچی اس کے مٹھی بند ہاتھ میں ایسے اڑتی کہ استاد اس کی کٹائی پر فدا ہو، ہو جاتا۔ آستین کی وہ گولائی آتی کہ گاہک عش عش کرنے لگے۔

استاد مر گیا، اس کے بیٹوں نے دکان بیچ دی۔ جمالا خود ہی جا کر انارکلی کی ایک بڑی دکان میں کٹائی کا ٹیسٹ دے آیا۔ بڑے ماسٹر جی حیران رہ گئے۔ اتنا سا چھوکرا اور ایسی استادوں سی کٹائی۔ انارکلی کی اس دکان سے اسٹیج کے سارے بڑے بڑے اداکاروں کے کپڑے سل کر جاتے تھے۔ این سی اے پنجاب یونیورسٹی، کنیرڈ کالج اور ادھر ادھر کے دوسرے اداروں کے تھیٹریکل پروگراموں کے لیے انہی کے پاس آیا جاتا۔ لڑکے، لڑکیاں تصویریں، میگزین، آئی فونز، لیپ ٹاپ لیے جمالے کے پاس آجاتے۔ گھنٹوں سر کھاتے پھر منہ مانگے پیسے دے کر جاتے۔

"ہاں، ہاں یہی۔۔۔ ایسا ہی۔۔۔ ہائے گاڈ یہ تو اس سے بھی پیارا ہے۔"

ممی ڈیڈی ٹائپ لڑکیاں چلّانے لگتیں۔ بر گر بچے حیران رہ جاتے۔ "یہ تو روبن ہڈ کے گاؤن سے بھی زیادہ کلاسک ہے۔ تمہیں تو ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے۔" بے چارے کچھ زیادہ ہی کہہ جاتے بل پے کرتے ایک نظر نہ دیکھتے کہ کتنے ہزار کا بنا ہے۔ ایسے لڑکے، لڑکیوں کا گروپ آتا تو ماسٹر جی کاؤنٹر کے پیچھے سے ہاتھ کے اشارے سے کہتے۔ "وہاں اس طرف جاؤ۔"

وہ کاؤنٹر کی طرف ہی آئے چلے جاتے۔ "ہمیں ایسے کاسٹیومز سلوانے ہیں۔" تصویریں اسکیچز آگے رکھتے۔

"ہاں، ہاں سب سل جائے گا۔ وہاں اس کیبن میں چلے جاؤ۔" شیشے کے دروازے کے پار جمالا آٹومیٹک مشین پر کام کر رہا ہوتا۔ سامنے ایک لکڑی کا بینچ رکھا ہوتا۔ وہاں آتے بیٹھتے اور چلے جاتے۔ اگلی بار آکر لے جاتے، ہاؤ واؤ کرتے نہ تھکتے۔

انارکلی کی اس دکان میں جمال کے علاوہ پانچ اور درزی تھے۔ تین کٹنگ ماسٹر، دو لڑکے، بٹن کاج، اوور لاک، استری اور پیکنگ کے لیے، لیکن سب سے مہنگا، پیچیدہ ڈیزائن اسے ہی سلائی کے لیے دیا جاتا۔ وہ ہر نئے ڈیزائن کو جلدی سمجھ جاتا، صفائی سے سی دیتا۔ تھوڑی بہت کمی بیشی ایک، دو بار سلائی سے جاتی رہتی۔ وہ رات دن یہی کام کرتا تھا۔ وہ رات دن اس میں پہلے سے زیادہ ماسٹر ہو رہا تھا۔

اس کے ہاتھ سے نکلا کپڑا ایک انچ کم زیادہ نہ سلتا۔ اس کے ہاتھ کا کٹا کپڑا نو آموز بھی سی لیتا تو اتراتا پھرتا۔



اسے معلوم ہی نہیں ہوا نہ اس نے معلوم کیا کہ وہ کیسے اس کام میں عروج کی طرف سفر کرنے لگا۔ ماسٹر جی اس سے بہت لگاؤ رکھتے۔ کہتے درویش ہے۔ جمال، چھپا درویش، کبھی کبھار خود انار کا جوس منگوا کر پیتے تو اسے بھی پلا دیتے۔ عیدین پر جہاں دوسروں کو ایک ایک سوٹ اور دو، دو ہزار عیدی ملتی اسے دو سوٹ اور تین ہزار عیدی ملتی، مٹھائی کا دو کلو کا ڈبہ الگ سے۔

وہ سر جھکائے اپنا کام کرتا رہتا، کم ہی نقص نکلتے اس کے کام میں... ساتھ کے درزی کچھ الٹا سیدھا کر دیتے تو وہ بھی وقت نکال کر ٹھیک کر دیتا۔

وہ جمال چوغہ پوش درویش تھا۔

نہ اس کا چوغہ دکھائی دیتا، نہ اس کی درویشی۔ خواتین بنا جھجکے اسے ناپ دے جاتیں۔ جیسے کسی مرد کسی لڑکے کو نہ دے رہی ہوں۔ محراب چھپائے اس برگزیدہ بزرگ کو دے رہی ہوں جو صرف بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہے۔ جو سب سے محبت کرتا ہے اور نفرت کو گناہ کبیرہ سمجھتا ہے اور ایسا بھی جو صرف مان لینے کے لیے پیدا ہوا ہو۔ نا سے وہ منکر ہو جانے والا ہو۔

اس کا فن اس وقت عروج پر پہنچا جب ایک خاتون نے آکر کہا کہ وہ ناپ نہیں دیں گی پرانے کپڑے بیماری کی وجہ سے کھلے ہو گئے ہیں۔ اب اسے اپنے سائز کے کپڑے چاہییں اور ناپ۔

جمال نے ایک نظر خاتون کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔ "سل جائے گا آپ کے ناپ کا" اور سوٹ واقعی خاتون کے ناپ کا تھا۔ خاتون حیران ہوئیں، لیکن ماسٹر جی نہیں۔

"شاباش بچے، تجھ پر خاص خدا کی رحمت ہے۔"

کچھ ایسی آتیں جو بلاوجہ اپنی کیمسٹری چلاتیں۔ ویسٹ انیس کر دو۔

وہ نظر اٹھا کر خاتون یا لڑکی کو دیکھتا۔ "بیس کر دیتا ہوں باجی۔"

"نہیں انیس ٹھیک ہے، مجھے انیس ہی چاہیے۔"

اگلی بار وہی انیس والی قمیض لیے آتیں۔ "تم لوگوں کے کاموں میں نہیں بولنا چاہیے۔ اسے بیس ہی کر دو۔ اس کی تو شیپ ہی ٹھیک نہیں لگتی، تم بیس ہی کر دو۔"

تو جو اسے ناپ دے جاتا، اس کے ہاتھ کا سلا لے جاتا، اسے واپس کم ہی آنا پڑتا کہ یہاں سے ٹھیک نہیں، وہاں سے تنگ ہے۔ گلا گہرا ہو گیا۔ کالر بڑا لگ گیا۔ دامن اتنا کھلا، زپ اتنی نمایاں کیوں، یہ سب اس کے ساتھ نہ ہوتا۔

خواتین اس کے ہاتھ کی فٹنگ کی نہیں شیپ کی دیوانی تھیں۔ وہ لباس نہیں آرائش سلائی کرتا تھا۔ مصور کے ہاتھ کی طرح بناتا نہیں تخلیق کرتا تھا۔

پروفیسروں، ڈاکٹروں، آرمی آفیسروں کی بیگمات کے کپڑے صرف جمالے کو دیے جاتے۔ جمالے سے پوچھ کر انہیں وقت دیا جاتا۔

"ہاں بھئی جمالے! میڈم ادریس چار سوٹ لائی ہیں، سادی شلوار قمیصیں ہیں، کیا وقت دوں واپسی کا؟"

"ہفتے بعد کا ماسٹر جی۔"

"دو تو تیرے پاس میڈم نرگس کے لہنگے ہی ہیں۔ تین ٹیل گاؤن... تو ہفتے بعد کا کہہ رہا ہے۔"

"ہو جائے گا ماسٹر جی۔"

ماسٹر جی دس دن بعد کا کہہ دیتے، لیکن جمالے کے کہے مطابق کپڑے پہلے ہی تیار ہوتے۔

وہ اتنی کامل توجہ سے کام کرتا جیسے وقت کامل توجہ سے گزرتا ہے نہ ایک گھڑی پہلے، نہ ایک گھڑی بعد، کپڑے اس کے ہاتھ ایسے آتے جیسے اس کے ہاتھوں امر ہونے آئے ہوں وہ انہیں ایسے برتتا جیسے استاد کامل شاگرد کامل کو برتتا ہے۔ اس کے دل میں کھوٹ نہ تھی۔ اس کے کام میں کھوٹ نظر نہ آتا۔

اس کے اندر کوئی کم زیادہ کا ترازو نہ تھا۔ اس کے کام میں بھی یہ ترازو نہ جڑا۔ اس کے اندر ہاں ہی ہاں تھی۔ اس کے کام میں نا کیسے نظر آتی؟

پیارے جمال کا کام سب کا دلارا بن گیا۔

اور پیارا جمال...

خدا جانے۔



دکان میں آگ لگ گئی۔ ہفتہ پندرہ دن دکان بند رکھنی پڑی۔ ان ہفتہ، پندرہ دنوں میں جمال، جمال ہو گئی۔ اماں تو دنگ رہ گئیں۔ کاروں، ٹیکسیوں میں پوچھتے پاچھتے لڑکے، لڑکیوں کے گروپ ان کے گھر آنے لگے۔ تھیٹریکل سیزن شروع تھا نا۔ بڑی مارا ماری تھی۔ ایک دو گروپ اسے ساتھ لے گئے۔ ہفتے بعد دس ہزار دے کر بھیجا۔ ہفتے کا دس ہزار، اماں کا منہ کھل گیا۔ دس ہزار اماں نے پورے گن لیے تھے۔ وہ کپڑے نہیں گنے تھے جو جمال سی کر آیا تھا۔ سات دنوں کی آٹھ راتوں میں وہ صرف تیرہ چودہ گھنٹے سو کر آیا تھا۔

خیر... خیر...

کچھ بیگمات بھی آئیں پیچھے۔ اماں جمال کو کریدنے لگیں۔ "ایک سوٹ کا تیرا استاد کتنے پیسے لیتا ہے؟"

"مجھے نہیں پتا اماں!" اسے واقعی نہیں پتا تھا۔ اس نے پتا کرنا چاہا ہی نہیں تھا کبھی۔

"لو آٹھ سال سے اس کی دکان پر کام کر رہا ہے اور تجھے خبر ہی نہیں ہے۔" سیدھی سادی ہفتے میں ایک دن آدھ سیر گائے کا گوشت پکا کر صبر شکر کرنے والی اماں گوگل ڈاٹ کام بن گئیں۔ گھر سے نکلیں ناک پر سے مکھی اڑائی اور پتا کیا کہ یہ کم بخت ماری بڑی بڑی ٹیلرنگ کی دکانیں کتنے پیسے لیتی ہیں میڈموں سے۔

ماسٹر سترہ ہزار دیتا تھا جمال کو۔ وہ بھی باقی سب سے چھپا کر۔ اماں اسی میں پھولی نہ سماتیں کہ ایسے ہاتھ پیر کے ساتھ بھی ان کا شہزادہ محلے کے ہر شیر جوان لڑکے سے زیادہ کما کر لاتا ہے۔ اٹھارہ افراد کے اس کے کنبے میں سترہ ہزار بہت تھا۔ بہت تھا جب تک صبر تھا، شکر تھا، بہت تھا۔

ماسٹر جی کئی بار آئے، منت کی بیس سے پچیس دینے پر آگئے، پر اماں نہ مانیں۔

"لاکھ بھی دو تو اب یہ نہیں آئے گا۔ بس اپنا ہی کرے گا اب یہ۔"

ماسٹر بڑا آبدیدہ ہوا۔ اسے لگا دکان تو اب جل رہی ہے اب تو کوئی پانی اس آگ کو نہیں بجھا سکے گا۔

"کام کی بات نہیں، مجھے جمال سے بڑا لگاؤ ہے۔ بہن جی۔"

"ہاں تو روز آکر مل لیا کرنا۔" اماں ترخ کر بولیں۔

ماسٹر جی چلے گئے۔ جمال کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

"خبردار جو تو اسے آگے پیچھے کہیں ملا ہو تو... لٹیرا... لوٹتا رہا تجھے۔"

جمال نے سر جھکا لیا۔ مان لینے والا سر کیسے اٹھاتا۔

ساری خواتین کو کہہ دیا گیا کہ گرمی، سردی سارے کپڑے جمال سے سلواؤ۔ گرمی، سردی سارے کپڑے جمالے سے سلوائے جانے لگے۔ ڈرائیور کے ہاتھ کپڑے بھیج دیے جاتے۔ فون پر تفصیلات بتا دی جاتیں۔ بل اماں ڈرائیوروں کو پکڑا دیتیں۔ کام چل سو چل ایسے چلا جیسے عربی گھوڑا میدان میں سرخرو ہونے کے لیے سرپٹ دوڑا ہو۔ یہ جاوہ جا۔

دو مرلے کے میدے کے گھر میں آپا کے شوہر اور چار بچوں سمیت سولہ افراد براجمان تھے۔ اوپر کا گھر کسی اور کا تھا۔

یا اوپر والا خرید لو، یا نیچے والا بیچ دو کے مصداق اماں نے ہی اوپر والا خرید لیا۔ ایک کمرہ برآمدہ اور سات فٹ کی چھت ان کے نصیب میں لکھی گئی۔ سلائی مشین کے قلم سے... کمرہ برآمدہ آپا کو دے دیا گیا اور تیسری منزل پر اماں نے کمرہ کچن ماربل لگوا کر بنا لیا۔ اوپر تلے کی تین منزلیں اماں کی ہوئیں۔ اماں گردن اکڑا کر اندرون شہر گھومتیں۔ آدھ سیر گائے کے گوشت کی جگہ ڈھائی سیر بکرے کے گوشت نے لے لی۔ کہاں تو سوچا کرتی تھیں کہ جیسے تیسے بیٹیاں بیاہ دیں۔ اب سونے کی قیمتوں پر نظر رکھا کرتی تھیں۔

جمال کے پیدائشی لنگ پر پہلے تو کڑھا کرتی تھیں کہ کیا چار بہنوں کے بعد بھی آیا تو ایسا ٹیڑھا میڑھا۔ کوئی گبھرو جوان ہوتا، ماں، بہنوں کا سہارا بنتا۔ اب وہ لنگ تو اماں کبھی کا بھول بیٹھی تھیں۔ خیر... خیر۔

آپا تو جیسے اماں نے قرض مانگ بیاہی تھی۔

وہی جانتی تھیں میدے کی نک چڑھی موسمی گاجر مولی کی ریڑھی سے تو گھر کا ایک بل ہی بمشکل نکلتا۔ بیٹیاں کہاں عزت سے نکل سکتی تھیں۔ تو آپا بیاہ دی گئی اور آپا اپنا بیاہ لے کر اماں کے پاس ہی آگئی۔ اس کے چار بچوں کا باپ کماتا نہ تھا۔ جیٹھ' دیور اب اور کھلا نہیں سکتے تھے۔ جمال ضرور کھلا سکتا تھا۔ اماں اور کہاں نکال باہر کرتی۔ مصدق تو کمائے گا نہیں' لیکن لڑکی کو بسائے گا تو سہی نا اور مصدق اتنا پیار کرتا تھا آپا اور بچوں سے کہ بھوکا مار دے گا۔ کما کر نہیں کھلائے گا۔ اماں' آپا کے پیار میں بندھی تھی۔ آپا مصدق کے اور مصدق "کچھ نہ کرنے کے۔"

کسی نے کہا ہے۔ غریب بہت ظالم ہوتا ہے۔ جس نے بھی کہا ہے۔ کمال کہا ہے۔

خیر تو جمالا تھا نا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کب اتنا لائق فائق ہو گیا۔ سلائی کٹائی میں کہ سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ بلکہ بہت سوں کو اپنے پیچھے لگا لیا۔۔۔ خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ وہ کتنا لائق' کتنا قابل ہے۔ قدر اس کے فن کی تھوڑی تھی' قدر تو اس روپے کی تھی جو اس کے بدل میں آتا اور فرق شریف عرف میدے کے خاندان کو پڑا' بہت پڑا' میدے کے بیوی' بچوں کو۔۔۔ خود میدے کو۔۔۔ ریڑھی چلائی' چلائی نہیں تو نہ سہی۔ دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر سگریٹ پینے میں آخر کیا جاتا ہے۔ یہ جوان لونڈے بھی تو بے فکر بنے پھرتے ہیں۔ گیارہ بچوں کا باپ کیوں نہیں بے فکرا پھر سکتا۔ تھڑوں پر بیٹھ سکتا' سینما تھیٹر جا سکتا۔ چوک چوباروں میں بلاوجہ ٹہل سکتا۔ کیوں نہیں بھئی؟

ویسے میدا جمالے کا سگا باپ ہے۔ میدے کی بیوی جمالے کی سگی ماں ہے اور باقی کے دس سگے بہن بھائی' بھانجے' بھانجیاں اور ہاں ایک عدد سگا بہنوئی بھی۔

وہ سب کا سگا تھا۔ سب اس کے سگے تھے۔

تو اوپر والا گھر اماں نے پورے تیرہ لاکھ میں خریدا۔ یہ تیرہ لاکھ جمالے نے کئی بیگمات کے بیٹے' بیٹیوں کی شادیوں کے کپڑے سی کر اکٹھے کیے۔

اماں نے اکٹھے کیے۔ سیدھی سادھی اماں' سیدھی ہو گئیں۔ غربت کی تو ایسی کی تیسی۔ بہت نچوڑ لیا اس منحوس ماری غربت نے' تو اب اماں اس غربت کے سر ہو گئی تھیں۔ ایک ایک بال نوچ پھینکنا چاہتی تھیں' ہاں جی۔

وہ نو سال کی عمر سے پہلی دکان پر بیٹھا۔ اٹھارہ کا ہوتا' چھبیس سال کا ہو گیا۔

محلہ سیداں کی نیلی گلی کے گھپ اندھیرے گھر میں وہ کپڑے سلائی کرتا رہا' کرتا رہا' سردی آئی گرمی گئی بہار گزری خزاں چھائی اسے کیا خبر' وہ کیوں رکھے خبر' اس کی گھپ اندھیری کھپا میں تو ایک ہی موسم تھا۔ "سلائی کا" ایک ہی سُر تھا۔ سلائی مشین کی آواز کا۔

وہاں ایک ہی وقت آکر ٹھہر گیا تھا۔ سر جھکائے کام کرتے رہنے کا۔

جمال منہ اندھیرے اٹھتا۔ رات گئے سوتا۔ جب نیلی گلی کی باہری سڑک کا حلوائی اور نان بائی اپنی دکانیں بند کر رہے ہوتے' وہ اگلے سوٹ کو سینے کی تیاری کر رہا ہوتا۔ جب گھر والے مونگ پھلی چھیل چھیل کر کھا رہے ہوتے اور لحافوں میں گھسے زمانے بھر کے چٹکلے چھوڑ رہے ہوتے اور آخر کار تھک ہار کر سو جاتے' وہ تب بھی کسی میڈم کے شیفون پر ترپائی کر رہا ہوتا۔ کالر کی آخری سلائی بٹھا رہا ہوتا۔ کسی ناپسندیدہ سلائی کو ادھیڑ رہا ہوتا اور نہیں تو اگلے دن کی سلائی کے کپڑے کاٹ رہا ہوتا۔ سونے سے پہلے اماں یاد سے یاد کروا کر جاتیں۔

"کل میڈم انیلا کا ڈرائیور آئے گا۔ کپڑے تیار ہیں ان کے سب ہی۔"

"ہاں اماں۔"

کبھی کبھی وہ کہہ دیتا۔ "ایک رہ گیا۔"

"کیسے رہ گیا ایک' کیا کرتا رہا ہے تو۔۔۔ سلے کیوں نہیں ابھی تک سارے۔ کہا بھی تھا انہوں نے فلائٹ ہے ان کی اگلے ہفتے امریکہ کی۔ مجھے مروائے گا کیا تو' ایڈوانس پیسے دے گئی ہیں وہ۔ لو کر لو بات' کہہ رہا ہے سلے نہیں۔"

وہ شرمندہ ہو جاتا۔ سوچتا کیا کرتا رہا ہے کہ کپڑے سلے ہی نہیں۔ آخر کیا کرتا رہا ہے۔ سوچتا جاتا کپڑے سیتا جاتا۔

اس کا زمینی بستر کھپا میں ہی ایک طرف لگا تھا۔ عرصہ ہوا اسے ایمرجنسی سونے اور اٹھنے کی عادت تھی۔ ہر وقت کل فلاں سوٹ دینا ہے کی تلوار لٹکتی رہتی۔ وہ کبھی فارغ نہ ہوا۔ اسے کبھی فارغ نہ چھوڑا گیا۔

اماں اور بہنیں کپڑے استری کر دیتیں۔ بٹن لگا دیتیں۔ ترپائی کرنے کی کوششیں کرتیں۔ ایک آدھ سوٹ کر کے ان کا ہاتھ ٹیڑھا میڑھا' موٹا چوڑا چلنے لگتا۔ جمال کو پسند نہ آتی' پھر ان کے ہاتھ کی ترپائی وہ خود ہی کرتا جاتا۔ دس بار انہیں سکھانا چاہا' لیکن ان کے ہاتھوں نے بگاڑ کی ہی ضد پکڑ رکھی تھی۔

ہاں تو وہ اسی کھپا میں ایک طرف چٹائی پر سو جاتا۔ منہ اندھیرے اٹھتا' منہ ہاتھ دھو کر بیٹھ جاتا۔ جب تک اوپر والا نہیں خریدا تھا۔ سب پچھلے دوسرے کمرے میں ہی چٹائی پر سوتے تھے۔ اب وہاں ایک صوفہ سیٹ لا کر رکھا تھا۔ ڈیوڑھی سے اندر آؤ تو پہلے اس کی کھپا آتی تھی۔ سامنے ذرا بڑا کمرہ اور ساتھ اوپر کو جاتی سیڑھیاں۔ اوپر ہی باورچی خانہ کر لیا تھا اماں نے۔

اماں اٹھ کر پہلے اسے ناشتا دے جاتیں۔ ایک پراٹھا' ایک پیالی چائے' کبھی کبھار انڈے اور نہاری۔ وہ جلدی جلدی ناشتا کرتا۔ ہر روز ہی لگتا۔ بس آج ہی ذرا جلدی ہے۔ یہ ذرا جلدی کی روز پچھلے کئی سالوں سے آرہی تھی۔

ماسٹر جی کے یہاں انار کلی جاتا تھا تو کچھ آرام تھا۔ نو بجے دکان کھلتی۔ وہ آرام سے اٹھ کر نہا دھو کر پیٹ بھر ناشتا کر کے دکان پر چلا جاتا۔ جب سے گھر میں کام کرنے لگا تھا۔ بس جلدی جلدی کا اودھم مچا رکھا تھی۔ اماں ناشتا دے کر دو منٹ بعد ہی آجاتیں۔

"دو گھونٹ چائے ہے' ختم کر لے جلدی جمالے۔ دو بجے میڈم بلقیس کا ڈرائیور آئے گا۔"

وہ دو گھونٹ چائے چھوڑ ہی دیتا۔ کبھی کبھار اماں پیالی اٹھا کر وہ دو گھونٹ چائے خود اندر کر لیتیں۔ اماں نے اس جلدی جلدی کے چکر میں اس کا پراٹھا ہی چھوٹا پتلا سا بنانا شروع کر دیا تھا۔ موٹا پراٹھا کھانے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے نا۔ پتلے سے پیڑے کو وہ پھیلا دیتیں جلدی کھائے گا' جلدی چبائے گا تو ہی۔۔۔ تو ہی۔

خیر۔۔۔ خیر۔

تو ان گھر کے نو سالوں کے کام میں وہ دن کے دو بار واش روم میں جانے کے نکال کر۔ مشین سے کتنی بار اٹھ کر گیا کا حساب آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ سردیوں میں پندرہ دنوں میں ایک بار نہانے کو۔

اماں کہتیں۔ "اتنی ٹھنڈ ہے' کیا کرے گا نہا کے۔ کیسا جاڑا لگا ہے' ہڈیوں میں گھس کر کھوکھلا کر دیتی ہے ایسی ٹھنڈ۔"

اور یہ ٹھنڈ اپریل تک رہتی۔ گرمیوں میں کچھ ایسا عالم رہتا ہے کہ نہا کر پنکھے کے نیچے بیٹھو تو جسم جڑ جاتا ہے۔ پسینہ تو اچھا ہوتا ہے' جسم ترو تازہ رہتا ہے۔ وہ سر جھکائے کام کرتا رہتا' نہانے نہ جاتا۔ وقت نے اس کی یہ ضرورت ہی مار دی کہ نہانا بھی ضروری ہے۔ ہاں تو تین بار عیدین کی نمازیں پڑھنے گیا۔ وہ بھی یوں کہ محلے والوں نے اماں کو شرم دلائی کہ کمائی کی اس مشین کو نماز تو پڑھنے بھیج دیا کرو۔ کمائی کی مشین تین نمازیں ادا کر آئی۔ اماں کا بس نہ چلا مولوی صاحب کو گھر بلا کر مشین کے آگے ہی جماعت لگوا لیتیں۔ اماں کہتی تھیں جوان کے ہاتھ ایسا ہنر ہوتا تو وہ رات کو سوتیں بھی نا۔ بھئی صرف ہاتھ چلانے سے ہی سونا نکل رہا ہے تو ہاتھ کون بے وقوف روکے۔

☼ ☼ ☼

آپا سے چھوٹی رابعہ کی بھی شادی ہو گئی۔ محلے والے مہینوں رابعہ کے جہیز کو لے کر باتیں کرتے رہے۔ اتنا جہیز' سب کو جمال سا بھائی ملے۔

اماں نے تین تین سو چار چار سو دے کر باہر کے درزی سے کپڑے سلوا لیے رابعہ کی شادی کے' لیکن جمال کو تنگ نہ کیا۔ اس نے کہا بھی رابعہ کے کپڑے تو

سی دیتا ہوں پر اماں نے کہا۔

"نا بھئی تو صرف میڈموں کے کپڑے سی دیر ی نہ کر۔"

رابعہ کی شادی ہو گئی۔ اب رابعہ سے چھوٹی صائمہ اور ہما کا جہیز تیار ہونے لگا تھا۔ سب سے چھوٹا جمیل تھا۔ وہ اور اس سے اوپر کی چار بہنیں اسکول جاتی تھیں۔ اماں کہتیں 'ابھی تو پوری چھ کی بٹالین جمالے کو بیاہنی ہے۔ تو یوں ہوا کہ جمال لیٹرین میں دو منٹ سے زیادہ لگا دیتا تو اماں ذرا اونچی آواز سے چلانے لگتیں۔

"تیرا پیٹ خراب ہے جمال۔ پھکی لاتی ہوں تیرے لیے ابھی۔"

جمال پھکی کھالیتا۔ پیٹ ٹھیک ہو جاتا۔ کٹائی کرتا جاتا۔ سلائی مشین کی موٹر پر پیر کا دباؤ رکھے رکھتا۔ بے جان کپڑے اس کے ہاتھوں نکل کر جان دار ہوتے جاتے۔ رات ڈھل جاتی دن نکل آتا۔ دن ڈوب جاتا۔ رات چھا جاتی۔ سلائی کٹائی جاری رہتی۔ سردی آتی بارش برستی 'خوب برستی دھنک نکلتی' تارے ٹمٹماتے۔ لاول حلوائی کی دکان پر کام کرنے والے لڑکے آتے اور چلے بھی جاتے۔

نیلی گلی کے گھروں کی چھتیں اونچی ہو گئیں۔ کسی نے ماربل لگوالیا۔ کسی نے مکان بیچ دیا۔ اس کے ہم عمر لڑکے بیاہ دیے گئے۔ گلی کے باہر کی سڑک پکی ہو گئی۔ اتنا کچھ ہو گیا' لیکن جمال کی کھپا میں کچھ نہ بدلا۔ وہاں وہی ریشم' جارجٹ' شیفون' کھدی' لان' لینن' انارکلی' تنگ پاجامے' ٹیل گاؤن' ساڑھی' بلاؤز' شلوار قمیص کا ہی موسم رہا۔ کس پر کون سا ڈیزائن بنے گا۔ یہ یاد رکھا جاتا۔ کسے کس دن اور تاریخ کو دینا ہے' یہ یاد دلایا جاتا۔ یہی موسم ہر دن' ہر پہر رہا۔ ہر حال میں رہا۔ اس کی بیماری میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ کھانستا' کانپتا صرف کام کرتا' اسے صرف کام کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ اس پر صرف کام ہی فرض کیا گیا تھا۔

خیر۔۔۔ خیر۔

صائمہ کی شادی بھی دھوم دھام سے ہو گئی۔ ہما کے ساتھ اماں نے سوچا۔ جمالے کا بھی نکاح پڑھوا دیا جائے۔ کم بخت مارے یہ لوگ باتیں بہت کرتے ہیں' اماں بہانے سے گاؤں سے جمیلہ کو لے آئیں۔ اماں کی بہن بھی تو سیدھی سادی پر جمیلہ کو شہر میں بیاہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بے چاری بس اتنا ہی کہتی جاتی' بار بار۔

"یہ شہر والے بڑے ظالم ہوتے ہیں آپا۔" "ہم تو نہیں ہیں۔" اماں اترا کر کہتیں۔

خیر جمیلہ کو اماں بہانے سے لے آئیں کہ چلو سیدھی سادی ہے' گاؤں کی چھوری' ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ مہینہ دو مہینہ شہر کے رنگ دیکھ لے گی تو ماں کو بھی راضی کر لے گی۔

تو گاؤں کی چھوری میدے کے گھر اندرون شہر آگئی۔ لمبے سیاہ گھنے بالوں اور موٹی موٹی آنکھوں والی جمیلہ' اس کی بھنویں اور پلکیں جنگل سی گھنی تھیں۔ ان میں چراگاہوں سی شادابی اور شفافیت تھی۔ جھرنے اس کی آنکھوں میں گر کر اس کے وجود کو جھلملا جاتے۔

اماں نے اسے انارکلی' عجائب گھر' گلشن پارک' جناح پارک' چڑیا گھر گھمایا۔ خوب سیر کروائی' سیل سے کپڑے جوتے بھی لے دیے۔ اماں بڑی خوش تھیں اس سے۔ گھر کے سارے کام منٹوں میں کر دیتی۔ صبح سویرے ہی سب کام نپٹ جاتے۔ کپڑے دھل جاتے۔ سالن روٹی پک جاتی اور تو اور اس نے آٹھ دس سالوں کے بنے گندے سندے لحاف گدے نکال نکال دھوئے۔ روئی کو دھوپ' سکھایا۔ اماں کے ساتھ جا کر بھروالائی اپنے ہی سر پر گٹھڑ رکھ کر گھر لاتی۔ دھوپ میں بیٹھ کر نگندے ڈال دیتی۔ ہفتے میں دس بارہ رضائیاں گدے تیار اور تو اور جمال کو اس کے ہاتھ کی ترپائی بھی پسند آگئی تھی۔ ہاتھی کان کے سے پاجامے بھی سی دیتی تھی۔

لو اماں کو تو دو لوگ مل گئے۔

ہاں تو شروع میں جمیلہ کی خوب آؤ بھگت کی گئی کہ بس شہر والوں کو پسند کر لے' پھر وہ بھی نان چنوں' چائے بابوں پر آگئی۔ جیسے کپڑا کاٹ کر سی کر پہن لیا جاتا ہے اور کترنیں ادھر ادھر رلتی پھرتی ہیں ویسے ہی وہ کر دی گئی۔

سارے گھر کا کام کرنا جیسے اسی پر فرض ہو گیا۔ اماں نے نکاح پڑھوایا نہیں اور اسے اپنی بہو ہی سمجھ کر بیٹھ گئیں۔ کام سے فارغ ہوتی تو اماں جمالے کے پاس بیٹھا دیتیں۔ وہ بھی گھنٹوں ترپائی کرتی جاتی، بٹن ٹانکتی رہتی۔

سردیوں کے دن تھے۔ جمال کی ٹھنڈی کھپا' میں بیٹھے بیٹھے وہ کانپ جاتی۔ ہاتھ پیر سن ہو جاتے۔ اس کا جی چاہتا۔ اوپر جا کر دھوپ میں بیٹھنے کو۔ ایک دو بار اس نے خالہ سے کہا کہ کپڑے وہ اوپر دھوپ میں بیٹھ کر ترپائی کردیتی ہے، لیکن خالہ نے پرزور منع کردیا۔ کپڑوں کا اس کھپا سے نکلنا ایسے ہی ممنوع تھا جیسے بنا چاند کے رمضان کا روزہ رکھ لینا۔

اتنے مہنگے کپڑوں پر داغ دھبا لگ جائے، کون بھرے گا۔ فرش پر صاف پلاسٹک بچھا تھا۔ ایک دیوار گیر الماری اماں نے خاص ان کپڑوں کے لیے بنوائی تھی۔ وہاں احتیاط سے کپڑے تہ کیے رکھے ہوتے۔ بیگمات — دس دس بار کہتیں۔

"بہت مہنگے کپڑے ہیں کوئی داغ دھبا نہ لگے۔"

جمیلہ نے جی کڑا کرکے آٹھ، دس دن تو کام کیا، پھر بھاگنے لگی، کام سے نہیں سیلن زدہ دم گھوٹ کھپا سے۔

"جمال بھائی! آپ کو ڈر نہیں لگتا۔"

"کس سے؟"

"اس کمرے کی چھت نہ گر جائے۔"

"چھت کیسے گرے گی بھلا۔"

"سب گھر والے چھت پر ہیں نا۔ صرف ہم دو ہی نیچے ہیں۔"

وہ ہنسا بہت ہنسا بہت اچھا ہنسا۔ "تم جاؤ، میں خود کرلوں گا۔"

"میں یہ کام اوپر لے جاتی ہوں، دھوپ نکلی ہے، دھوپ میں بیٹھ کر۔"

"داغ لگ جائے گا۔"

"اچھا۔۔۔" وہ بیٹھ گئی۔

"تم جاؤ جمیلہ۔"

"نہیں جمال بھائی! آج کرلیتی ہوں، کل سوچوں گی کروں یا نہیں۔ میرے پاس شہر کی بہت باتیں اکٹھی ہوگئی ہیں، میں رضیہ کو جا کر بتاؤں گی کہ شہر والے گڈے گڑیاں جتنے گھروں میں رہتے ہیں، کبوتروں کے لیے بڑے بڑے گھر بنواتے ہیں اور اپنے لیے۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی، ہنستی ہی رہی۔

جمال بھی ہنسنے لگا۔

"میرا تو بڑا دم گھٹتا ہے آپ کے گھر میں۔ ہمارے گھر نا میں شام کو ابے کی سائیکل دیر تک چلاتی رہتی۔ رضیہ بھی اپنے بھائی کی سائیکل لے آتی ہے اور ہم ریس لگاتے۔ اتنا بڑا گھر ہے ہمارا۔ آپ تو کبھی آئے ہی نہیں نا۔ خالہ سے پوچھ لیں بے شک۔ جھوٹ نہیں بولتی میں اور یہ آپ کا گھر ہے۔ یہاں تو سائیکل رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے اور یہ آپ کا کپڑوں کا گودام، ایسا لگتا ہے ابھی ابھی کنویں سے پانی نکالا ہے۔"

جمال ہنستا رہا۔ اپنا کام کرتا رہا کنواں۔۔۔ ہاہاہا۔

"دھوپ چمک رہی ہے آج تو خوب۔" وہ باربار کہتی جاتی۔

"دھوپ بھی چمکتی ہے بھلا؟" جمال کہہ بیٹھا۔ سالوں سے اس نے کپڑوں کی ہی چمک جو دیکھی بھالی تھی۔

"تو کبھی نہیں دیکھی دھوپ چمکتی، آئیں میرے ساتھ، آئیں نا۔ میں دکھاؤں کیا اس ڈربے میں سارا وقت بیٹھے رہتے ہیں، کچھ خانۂ خدا کی طرف بھی نظر کریں، دیکھئے کیسے کیسے رنگ بکھرے ہیں شیفون، جارجٹ کے رنگوں کو بھول جائیں گے۔"

وہ اسے اوپر لے آئی اور وہ اس کے ساتھ اوپر آگیا۔ اس کی بہنیں اماں آپا کے چار بچے اور اس کا سگا بہنوئی بھی چھت پر ادھر ادھر بیٹھے کینو مالٹے کھارہے تھے۔ دھوپ سینک رہے تھے۔ اماں نے جو اسے آتے دیکھا مانو سوواٹ کا کرنٹ لگا۔ بلب جل کر بجھا۔

"جمالے تو۔۔۔ اوپر؟"

جمال ایک طرف بیٹھ گیا۔ کھپا کی سیلن میں جڑا اس کا جسم کھلنے لگا۔ اسے بڑا اچھا لگا۔ اماں نے فٹافٹ اسے کینو چھیل کردیے۔ جمیلہ آنکھوں کے اشارے سے پوچھتی رہی۔

"کیسی چمک رہی ہے پھر دھوپ۔"

جھٹ پٹ اماں نے اسے تین، چار کینو کھلائے اور نیچے چلتا کیا۔ لیکن اب ذرا سی دیر ہوچکی تھی۔ سورج مکھی کی جڑ نکل آئی تھی۔ وہ روز پندرہ بیس منٹ ضرور دھوپ کی چمک دیکھ جاتا۔ جمیلہ بہانے سے اس کے قریب کہیں سرگوشیاں کرتی جاتی۔ جمال اس کے لیے اس بچے جیسا تھا جس کی انگلی تھام کر اپنی انگلی کے اشارے کر کرکے اسے اس نے دنیا دکھائی تھی۔ خانہ خدا کے رنگ دکھائے تھے۔ وہ بہت خوش ہوئی اپنے استاد بننے پر۔

"وہ سامنے چھ سات گھر چھوڑ کر جو ڈربہ معاف کیجئے گا جو گھر ہے اس کی چھت پر وہ ادھر کونے میں چھپا بیٹھا ایک مور ہے۔ وہ ادھر۔۔۔ ہاں لال ٹین کے پاس۔۔۔ ہاں وہی میرے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھیں نا جمال بھائی۔"

جمال آنکھیں سکیڑ کر مور ڈھونڈتا۔

"ٹھنڈی یخ رات کے بعد دھوپ نکلے تو یہ مور ناچتا ہے۔"

"مور ناچتا بھی ہے؟" جمالے کو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ مور شور ناچتے بھی ہیں۔ وہ ٹھنڈی یخ رات کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دو بار اس نے جمیلہ سے پوچھا بھی۔

"آج رات بڑی ٹھنڈ ہے۔ اچھا تو کل ناچے گا مور۔"

وہ ہنس دیتی۔ "کیا پتا۔"

اماں اور باقی سب اتوار بازار گئیں۔ اماں تو بس دس پندرہ منٹ کا جانا آنا ہی کرتی تھیں۔ جمالے کی فکر لگی رہتی تھی نا۔ باقی سب پھرتی رہتی تھیں، تو ان دس پندرہ منٹوں کے لیے جمال اور وہ اوپر آگئے۔ دونوں نے چھت کی دیوار سے۔۔۔ ایک ہی دیوار سے ٹیک کر ذرا دور مور کو ناچتے دیکھا۔

مور پنکھ دونوں کے دل میں ہوا کرنے لگے۔ مور کیوں ناچ رہا ہے۔ جیسے انہیں خبر ہوگئی۔ انسان کیوں نہ ناچے، انہوں نے سوچ لیا۔

گھنی بھنوؤں والی کی آنکھوں میں دھنک اتر آئی۔

جمال مبہوت رہ گیا۔ وہ مور کو دیکھنا بھول گیا۔ اس کے اندر ایک سوال جاگا۔ جمیلہ کا سوال، وہ کھڑے کھڑے جمیلہ کا سوالی بن گیا۔

اور اس کے بعد جو کپڑے سلے انہوں نے ساری میڈموں کو خوش سا کردیا۔

"کمال کردیا اس بار تو، میری بیٹی تو پھولے نہیں سما رہی تھی گاؤن پہن کر۔ اس کی دو فرینڈز بھی پوچھ رہی تھیں تمہارا۔" ایک میڈم نے باقاعدہ فون کرکے کہا۔

اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اس کے دل میں محبت کا سوتا پھوٹا اور سب نکھر کر اجلا اجلا ہونے لگا۔ اس کے فن کو آٹھ چاند لگ گئے۔

"اماں! مجھے اوپر والا کمرہ دے دیں۔" جمالے نے عجیب بات کی۔ اماں کا سارا دن منہ کھلا اور ساری رات آنکھیں۔

"کیوں تو کیا کرے گا اوپر کے کمرے کا؟"

"نیچے اندھیرا بہت ہوتا ہے۔ نہ دن کی خبر نہ رات کی، دھوپ بھی نہیں آتی۔"

"دھوپ کا کیا کرے گا؟"

"دھوپ بڑی پیاری ہوتی ہے اماں۔"

"اب تو گرمی آنے والی ہے۔ پگلے تیرا کمرہ تو ایسا ٹھنڈا ہے کہ جیسے اے۔ سی لگا ہو۔ ہمیں دیکھ، کیسے گرمی میں تڑپ تڑپ جاتے ہیں۔ تندور بن جاتا ہے یہ تیسری منزل کا کمرہ۔"

"ابھی تو دسمبر ہے اماں، نہیں لگے گی مجھے گرمیوں میں گرمی۔"

باربار کی تکرار سے اماں نے اس کا سامان اٹھوا کر اوپر رکھوادیا۔ اب وہ روز چھت پر آنے لگا تھا۔ یہ بھی نقصان تھا۔ اوپر کے کمرے میں کھڑکی سے دھوپ سیدھی اس جگہ آدھ گھنٹہ ٹھہرتی جہاں اس کی مشین رکھی تھی۔ یوں وہ مزے سے دھوپ میں کام کرتا جاتا۔ ادھر ادھر کے دنیاوی شوروغوغے سے مزے لیتا۔ آس پاس کے سب چھتوں پر ہوتے۔ وہ ایک نظر ان سب پر بھی ڈال لیتا۔

خوش تھا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ کھلے آسمان کو دیکھتا

تو سکون سا ملتا۔ ڈھلتی شام دیکھتا' گہری رات دیکھتا۔ رات کے تھال پر سجے نکلتے چراغ دیکھتا۔

اس کے اوپر آنے سے رات کو سب اب نیچے سوتے۔ دن میں اوپر آجاتے۔ لیکن اس کے کمرے میں کوئی نہ گھستا۔ رات کو جمیلہ اس کا کھانا لے آتی اور سیڑھیوں پر نظر رکھ کر اسے کھلی چھت پر لے آتی اور جگمگ جگمگ ننھے چراغ دکھاتی' دھند ہوتی تو وہ اسے کہتی کہ دس تارے ڈھونڈ دیں۔ وہ دس ہزار ڈھونڈ لیتا۔ اس کی آنکھوں میں۔

"ہمارے گاؤں آؤ تو آسمان ایسے صاف شفاف ہوتا ہے کہ ان ستاروں سے نظر ہی نہیں ہٹتی۔ جی چاہتا ہے ہاتھ بڑھا کر سب مٹھی میں بند کرلیں۔ جھولی بھر لیں۔"

"میں تمہارے گاؤں آؤں گا۔"

"ضرور آنا۔"

"حیدر آبادی کرتا سی کرلاؤں گا' بہت بھلا لگے گا تم پر۔"

"ضرور لانا۔"

"ساتھ انڈین چنز۔۔۔ سرخ۔۔۔ ہری۔۔۔ پیلی۔"

"ہاں سرخ تو ضرور ہی۔"

"چلو صرف سرخ ہی۔"

"اور چوڑیاں۔۔۔"

"وہ ست رنگی۔ سارے رنگ ہوں گے سارے۔"

وہ اماں کے ڈر کا بہانہ کرتی نیچے بھاگ جاتی' وہ بہت دیر کھڑا دھندلے آسمان میں دس ستارے ڈھونڈتا رہتا۔

"جمالے۔" اماں اوپر آتیں۔

"ہاں اماں۔"

"یہاں کیا کررہا ہے' اتنی ٹھنڈ میں۔" اماں کی توپ مارکہ آواز نکلتی۔

وہ چپ کرکے کمرے میں آجاتا' کوئی جواب نہ دیتا۔ اماں کپڑے گننے لگتیں۔

"پاجامہ سی دے جلدی۔ باؤلا ہوگیا ہے تو تو۔۔۔ ٹک کر کام ہی نہیں کرتا۔ تیری بہن کی تاریخ ڈالنی ہے۔ تجھے خبر ہی نہیں ہے۔ دو بہنیں بیاہ دے گا تو خدا کے حضور رتبے والا ہی ہوگا نا۔ کیا کیا نہیں کرتے بھائی بہنوں کے لیے جمیل تو چھوٹا ہے ابھی' تو تو ذمہ دار بن۔"

وہ شرمندہ ہوگیا۔ اس رات ساری رات نہ سویا اور سارے کپڑے فجر سے پہلے سی دیے۔

نماز پڑھ کر جمیلہ چپکے سے اس کے کمرے میں آئی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "ساری رات نہیں سوئے۔"

وہ خاموش رہا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور خاموشی سے کام کرنے لگی۔ اماں آئیں۔ دیکھ کر نہال ہوگئیں۔

اگلی صبح وہ جمال کو لیے اس منڈیر کی طرف کھڑی تھی جہاں سے سڑک نظر آتی' یہاں دودھ دہی' حلوے نان کی کئی دکانیں تھیں۔ ہمہ وقت رش لگا رہتا۔

"یہ سامنے والا حلوائی دودھ میں سنگھاڑوں کا آٹا ملاتا ہے۔"

"اچھا؟" اسے حیرت ہوئی "تمہیں کیسے پتا۔"

"میں نے کتنی بار دیکھا ہے آپ نے تو کبھی ادھر اُدھر جھانکا ہی نہیں نا کہ یہاں وہاں کیا ہورہا ہے اور وہ جو نان والا ہے نا اس کا' اس کا نا۔۔۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

"اس کا کیا۔۔۔؟" جمال کو اس کی ہنسی بڑی پیاری لگی۔

"وہ جو نیلی ٹنکی والا گھر ہے نا۔ اس باجی سے چکر چل رہا ہے۔ باجی روز آتی ہے۔ آٹھ' دس نان بنا پیسوں کے لے جاتی ہے۔"

"ہوسکتا ہے وہ اس کی سگی بہن ہو یا رشتہ دار ہو۔"

اب وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ "بہت بھولے ہیں آپ۔ بہت ہی زیادہ۔"

"اچھا۔۔۔ میں بھولا ہوں۔" وہ بھی ہنسنے لگا۔

تو جمال نے بھی ہنسنا شروع کردیا۔ چھت کی منڈیر سے سر نیچے کرکے چند تماشے وہ بھی دیکھ کر ہنس لیتا۔

سر اٹھا کر آسمان کی دھند سے لپٹ جاتا اور بارش کی چھم چھماہٹ پر وہ بھی جھومنے لگا۔ ادھر ادھر کی چھتوں سے چلتے عشق ممنوع اس نے بھی پکڑ لیے۔ وہ اعتکاف جس میں وہ سالوں رہا۔ اب اس سے باہر آنے کا وقت آنے لگا۔ وہ جمیلہ کے اوپر آنے کا انتظار کرتا۔ جمیلہ اس کے ہاتھ سے سلے ایک ایک کپڑے پر ہاتھ پھیرتی جاتی کہتی جاتی۔

"جادو ہے آپ کے ہاتھوں میں' جادو۔"

ایک عالم نے اس کی تعریف کی تھی یہ تعریف سب پر بھاری تھی۔ ایک وہ تھے جو یہ جادو پہنتے تھے۔ ایک وہ تھے جو یہ جادو کھاتے تھے۔ لیکن وہ ان دونوں میں سے کوئی نہ تھی۔ جمال کو اپنے جادوگر ہونے پر فخر ہونے لگا۔

"آرام بھی کیا کریں۔ ورنہ یہ کُب پکا ہوجائے گا۔" وہ رات کو اسے کہہ کر سوتی۔

وہ اپنے کُب کو کچا کرنے کے لیے رات کو جلدی سے سونے لگا۔

"آسمان سے برف گرے گی جمال۔"

وہ کمرے میں آئی اور جلدی سے کہہ کر چلی گئی۔ اماں کا دھڑکا لگا رہتا تھا نا۔ موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور کچھ ہی دیر میں آسمان سے برف گرنے لگی۔

جمال دبا دبا مسکرانے لگا اور برف اکٹھی کرنے لگا۔ نیچے سب لحافوں میں دبکے تھے ابلے انڈے کھا رہے تھے۔ کوئلے والی انگیٹھی تاپ رہے تھے۔ اس کو دیا انڈا ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ سردی کی بارش میں بھیگ کر بھی گرم ہی رہا۔

اماں نے دیکھا تو چیخ ماردی۔ "نمونیہ ہوجائے گا جمالے باؤلے۔"

لیکن اسے نمونیا نہ ہوا۔ اسے آسمان سے گرتی برف بہت اچھی لگی۔ وہ ننھا بچہ بن گیا جو جنگل میں دور تک تتلی کا پیچھا کرتا ہے گھٹنوں پانی میں تیرتی مچھلیوں کو دیکھتا ہے اور تو اور جو بلی کے بلونگڑوں کو اپنے ساتھ بستر میں سلانا چاہتا ہے۔

گھنٹہ بھر وہ برف اکٹھی کرتا رہا۔ اماں نے لال انگارہ آنکھوں سے جمیلہ کو دیکھنا شروع کردیا۔ یہ گاؤں کی چھوری' ہونہہ۔۔۔ اندھی نہیں تھیں اماں۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن ایک اور قصہ ہوا۔

عید میلاد النبی کا دن تھا۔ گاؤں میں بھی اچھا خاصا اہتمام ہوتا' لیکن جمیلہ تو اندرون شہر کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسی رونق کہ میٹھی عید سے بھی زیادہ' سب نے نئے کپڑے پہنے' رات مہندی' لگوائی' چوڑیاں پہن کر آئیں سب۔

جلوس آنا تھا' سب چھتوں' منڈیروں پر چڑھے تھے۔ لڑکوں کا جلوس گھروں سے باہر تھا۔ ایک صرف جمال حسب دستور گھر کے اندر تھا۔ سارے حلوائی خالص دودھ کی بنی کھیر کی ٹھوٹھیاں' کچے ماتھے پر ہرے رومال باندھے بانٹ رہے تھے۔ لڑکوں کا جم غفیر تھا جو جلوس میں کئی ہزار ٹھوٹھیاں' نان حلوے' کینو' سیب' جوس کے ڈبے' بریانی کے چھوٹے ڈبے اور سبز چائے بانٹ رہے تھے۔ جمیل انہیں بھی اندر سب لا لا کر دے رہا تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ذرا کی ذرا جمال بھی جلوس دیکھنے باہر آیا۔ جمیلہ نے سرگوشی کی۔

"آپ بھی جاؤ نا نیچے۔"

"میں۔۔۔ میرا کیا کام۔"

"سب لڑکے ہیں وہاں۔۔۔ جلوس کا استقبال کریں۔ گلے ملیں۔۔۔ کھیر کھائیں۔۔۔ کھیر بانٹیں۔۔۔ اور کیا کرنا ہے۔"

وہ چپکے سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ اماں گلی کے نکڑ پر گلی کی دوسری عورتوں کے ساتھ بن سنور کر کھڑی تھیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی سارا جلوس ماتمی ہوگیا۔

"جمالے! تو کہاں؟"

"اماں یہ ذرا لالا حلوائی تک۔۔۔"

"کیا کرے گا جاکر۔۔۔ اتنی دھکم پیل ہے وہاں۔"

"ابھی آیا اماں۔" وہ چلا گیا۔ اماں دیکھ کر رہ گئیں۔

"آج تو واقعی عید ہے۔ بھئی جمالے کی شکل جو دیکھ لی۔" پڑوسن خالہ نے مسکرا کر طنز کیا' اماں کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔

جمیلہ ہاتھ ہلا ہلا کر جمال کو اوپر سے اشارے کر رہی تھی کہ فلاں ٹرالی پر مکہ مدینہ کیا کمال کا بنا ہے' فلاں ٹرالی کیسی سجی ہے۔ فلاں کیسے اچھل اچھل کر ناچ رہا ہے۔ عید واقعی عید ہو گئی۔

جمال بھی ٹھوٹھیاں کجے جلوس میں بانٹنے لگا۔ کسی نے اس کے گلے میں ہرے رنگ اور سنہرے کناروں والا دوپٹا ڈال دیا۔ پیشانی پر رومال باندھ دیا اور پھر آخری ٹرالی میں بیٹھ کر وہ بھی جلوس کے سنگ لاہور کا چکر لگانے کے لیے نکل کھڑا ہوا اور رات گئے واپس آیا اور آتے ہی سو گیا۔ اس نے کبھی اتنی جگمگاہٹ نہیں دیکھی تھی۔ وہ کبھی ایسے جشن کا حصہ نہیں بنا تھا۔ آج سب ہو گیا۔

اماں اگلے ہی دن جمیلہ کو اس کے گاؤں چھوڑ آئیں۔

"تیرا رشتہ ڈال آئی ہوں۔ تیری خالہ کہہ رہی تھی۔ سوچ کر جواب دیں گے۔" اماں نے جمال کو آکر بتایا۔

"جمیلہ ہاں کہے گی تو خالہ کیسے انکار کریں گی۔"

جمیلہ نے نا کی یا خالہ نے جمیلہ کا چھوٹا بھائی مٹھائی کا ڈبہ لے کر آگیا' گھڑی دو گھڑی بمشکل بیٹھا' چائے بسکٹ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔

"جمیلہ کا نکاح ہو گیا ہے۔ شریف لوگ ہیں۔ عزت دیتے ہیں۔ بیٹیاں تو کسی کی بھی گھر نہیں رہتیں خالہ۔"

اماں ہونہہ کہہ کر رہ گئیں اور پھر مسکراہٹ دباتی ہوئی جمال کے پاس آئیں۔

"جمیلہ کا نکاح کر دیا تیری خالہ نے' عجیب ڈنگر بہن ہے میری۔ مجھے ہاں نا کی نہیں اور لڑکی کا نکاح پڑھوا دیا۔ پندرہ مرلے کا گھر ہے سسرالیوں کا' گجرات گاؤں میں' کہاں وہ کہاں ہم سب اپنا بھلا ہی سوچتے ہیں۔ ہم ٹھہرے غریب' جمیلہ تو یہاں بھی کہتی پھرتی تھی ڈربہ... ڈربہ... خیر... خیر۔"

"تو جمیلہ کا نکاح کسی اور سے ہو گیا۔" سارا دن دھاگے ٹوٹتے رہے۔ قینچی اس کے ہاتھ سے پھسلتی رہی اور تو اور مشین کی دو سوئیاں ٹوٹ گئیں۔

پندرہ مرلے کا گھر۔ جمیلہ... لیکن مور کو ناچتے تو ان دونوں نے دیکھا تھا۔ جمال کو یاد آیا ایک بار جمیلہ اور صائمہ اوپر چھت پر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ اندر کپڑے سی رہا تھا۔

"کیسا لگا ہمارا لاہور۔" صائمہ نے اِترا کر ایسے پوچھا جیسے لاہورن ہونے کا تاج صرف اسی کے سر پر ہے۔

"ہاں جی دیکھا... یہ بڑی بڑی سڑکیں' بلڈنگیں' دکانیں' بازار اور گھر۔" گھر کے نام پر... وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی رہی۔

صائمہ چڑ گئی۔ "یہاں گھر مہنگے ہوتے ہیں نا' ایویں کھویں بات نہیں یہاں گھر بنا لینا۔"

"روشنی ہوا بھی خریدنی پڑتی ہے کیا۔ اپنا گھر ہی دیکھ لو' دھوپ بارش کے لیے تیسری منزل پر آنا پڑ رہا ہے۔ نچلا حصہ تو غار ہے مانو غار۔"

"اے بہن یہی سب ہے یہاں۔ تجھے کیا پتا کیسے رہا جاتا ہے یہاں۔"

"سب پتا ہے مجھے... گھر چھوٹے ہوں' روشن ہوا دار ہوں' میرا تو دم گھٹتا ہے ایسے بند گھروں میں۔"

دو ڈھائی مرلے کے گھر سے بڑے گھر کا رشتہ نہیں ملنے کا تجھے یہاں۔ اتنے سے گھر میں کہاں رکھے گی صحن' برآمدہ' روشن دان' ہوادان۔"

"دو ڈھائی مرلے والا میرے کہنے پر اس سے بڑا بھی بنوا دے گا۔ اسے بھی کچھ سکون ہو گا۔ قدر کرے گا میری۔"

"گاؤں کی چھوری کے اتنے نخرے۔"

"ہاں بھئی' یہ نخرہ تو بنتا ہے۔"

تو جمال نے ذرا سے بڑے گھر کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ ہما کی شادی بھی جلد ہی ہو جائے گی۔ پیچھے کی پانچ رہ جائیں گی۔ دو کی اپنے بعد کر دے گا' پھر گھر بنائے گا۔ باقی وقت کے ساتھ سب ہوتا جائے گا۔ وہ

جمیلہ کے لیے ایک چھوٹا سا گھر تو لے ہی سکتا تھا نا۔ اس نے اماں سے کہا۔

"اماں میری کمیٹی ڈلوادیں کہیں۔"

"کمیٹی۔۔۔ تو کیا کرے گا کمیٹی۔۔۔ بابا میں نے ڈال رکھی ہے تیری بہنوں کی شادیوں کے لیے کمیٹی۔"

"اماں میرے لیے ایک ڈال دے۔ میں ایک گھر لوں گا۔"

صرف خدا ہی جان سکتا تھا کہ اس نے کس فرشتہ صفت انداز سے یہ خواہش ظاہر کی تھی ایک گھر کی۔ جیسے ایک عبادت گاہ کی۔ اس میں کہیں دنیا اکٹھا کرنے کا لالچ نہ تھا۔ لالچ اس کے جسم کی کسی پور میں نہ تھا' لالچ ہوتا تو وہ لاکھوں روپے سی کر اماں کے ہاتھ نہ پکڑاتا جاتا۔ یہ تو صرف اس تاج محل کو بنانے کی چاہ تھی جو محبت کے نام پر محبت کرنے والے بنا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں کچھ برا نہ تھا' اس میں کچھ حرام نہ تھا۔

"گھر۔۔۔" اماں کئی لحظے اس کا منہ دیکھتی رہیں۔ "یہ گھر ہے نا۔۔۔ اور کتنے گھر لے گا۔"

"صرف ایک لوں گا' صرف ایک۔" وہ جمیلہ کا نام نہ لے سکا۔

اماں نے توپ مار کہ نظروں سے اسے دیکھا۔

خیر۔۔۔ خیر۔

اپنے فن میں راجہ ادھیراج (راجوں کا راجا) اپنا تاج محل مسمار کروا بیٹھا' جو مور سنگ کیا تھا دونوں نے اس رقص عاشقاں کا کیا بنا۔

بائیس ہزار کی ساڑھی کی پلیٹیں بیٹھنے میں نہ آئیں۔ مسز حماد دنگ رہ گئیں۔ ساڑھی اٹھا کر ڈرائیور کے ساتھ آئیں۔

"یہ ساڑھی سی ہے کہ لہنگا؟ مسز حماد کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

جمال مسز حماد کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ "مجھے معاف کردیں آپا جی۔" وہ ایک دم سے رونے لگا ہاتھ بھی جوڑ دیے' مسز حماد ہکا بکا رہ گئیں۔

"کوئی بات نہیں' ہو جاتا ہے اگر ٹھیک ہو جائے تو ورنہ۔۔۔"

جمال نے ٹھیک کرنے کے لیے ساڑھی نما لہنگا پکڑ لیا۔ تین دن بیمار رہا۔ کپڑے سیتا رہا۔ چھ ماہ بعد پھر تین دن بیمار رہا۔ جمیلہ کی رخصتی تھی نا۔

چھبیس سال کا جمال چھتیس سال کا ہو گیا۔ ہما' زارا۔۔۔ حنا بیاہی گئیں۔ اس کا بھی نکاح ہو گیا۔ بیوی بیاہ کر اس گپھا میں آگئی۔ اماں کے دور کے رشتے دار تھے۔ ان کی لڑکی تھی۔ لڑکی نے ایسے حالات دیکھے تھے کہ ماچس کی آدھ جلی تیلی بھی محفوظ کر لیتی کہ کام آئے گی۔ کپڑوں کی کترنوں سے اس نے اٹھتے بیٹھتے کئی رلیاں بنا لیں اپنی نندوں' نندوں کی نندوں کو دیں۔ بے چاری ان لوگوں میں سے تھی جو سال میں تیسرا جوڑا بنا لیتی تو خود کو فضول خرچ سمجھنے لگتی اور توبہ توبہ کرتی کہ قیامت کے دن اس فضول خرچی کا حساب کیسے دے گی آخر۔

جمال چھتیس سے چھیالیس' سینتالیس' اڑتالیس کا ہو گیا۔ اس کی بیٹی دس سال کی ہو گئی۔ سویرا جس کی آنکھیں جنگل سی گھنی تھیں۔ ہاں تو اس نیلی گلی کے آس پاس کے مکینوں کا کہنا تھا کہ جمالے کی شادی نہیں ہونے کی' شادی ہو گئی' اچھا تو کوئی اولاد نہ ہونے دے گی میدے کی جورو۔۔۔ اولاد بھی ہو گئی۔ خیر اب اور نہیں ہونے کی اولاد۔ جمال کے اور اولاد نہ ہوئی خیر۔۔۔ اماں مر گئیں۔۔۔ ساری بہنیں بیاہی گئیں' جمیل دبئی چلا گیا۔

مشین چلتی رہی۔ چلتی رہی۔ اوپر کے کمرے سے وہ اپنی گپھا میں واپس آگیا تھا۔ موروں سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ جاڑے کی راتوں میں اس نے کبھی تارے نہ ڈھونڈے۔

مشین جو چلتی رہی' خیر۔۔۔ خیر۔

وہ سلائی کا کام کرتا ایسا لگتا جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے کو کھال سا رنگ دے کر مشین کے آگے بٹھا دیا گیا ہو۔

ہاں تو یوں ہوا کہ اوپر کی دو منزلیں بیچ کر اماں نے آپا کے شوہر کو کاروبار کے لیے پیسے دے دیے۔۔۔ جمال کے سگے بڑے بہنوئی کو۔ چھوٹی رابعہ کو قسطوں پر

پلاٹ لے دیا۔ وہ قسطیں جمال کو بھرنی تھیں۔ سونے کے کڑے' جھومر۔ ٹیکے بھی اماں نے قسطوں پر حاصل کیے۔ الیکٹرونک کی بڑی چھوٹی چیزیں جو پچھلی چار کو ٹرک بھر بھر دیں وہ سب بھی اتنا سامان دیا کہ سسرالیوں نے اٹھا اٹھا گیلریوں میں رکھا۔

خیر۔۔۔ خیر۔

مشین چلتی رہی۔ کبھی رک جاتی تو منزہ بے چاری یاد دلاتی۔ "تین دن بعد پہلی تاریخ ہے۔ قسطوں والے۔"

ہاں تو وہ اڑتالیس سال کا ہو گیا۔ خاندان میں کسی مرگ' غم' جوگ' سنجوگ تیہ نہ گیا' پہلے اماں جاتی تھیں' پھر ابا جانے لگے۔ اب منزہ چلی جاتی۔ میلے ٹھیلے اس پر حرام تھے۔ عید' بقر عید اس پر واجب نہ ہوتی تھیں۔ اس پر ایک ہی فرض تھا۔ اس کا ایک ہی فرض تھا۔ "مشین چلانا۔"

سویرا بڑی ہونے لگی تو ٹھوڑی تلے ہاتھ ٹکا کر اسے دیکھے جاتی۔ ایک دن رونے لگی۔ "میں تھک گئی تجھے دیکھتے دیکھتے ابا۔"

ابا جمال مسکرا دیا' سر جھکا کر کام کرنے لگا۔

ایک دن آئی۔ "آسمان سے برف گر رہی ہے ابا۔"

"کیسی برف؟" اتنے سالوں بعد وہ ٹھنڈا ٹھار ہونے لگا۔

"گول گول موٹی موٹی۔۔۔ چل ابا! برف اکٹھی کریں۔"

"مجھے نہیں کرنی۔" اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ماہی' ماہی کرتے کسی کا حلق سوکھا۔۔۔ سوکھا ہوا۔۔۔ بنجر پھوٹا۔

"میں نے تو کبھی ایسے برف گرتی نہیں دیکھی۔ چل ابا تو بھی دیکھ لے۔"

جمال نے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام لیا۔ منزہ دہلیز میں کھڑی ژالہ باری دیکھ رہی تھی۔

نیلی گلی سے باہر لال حلوائی کی دکان کے باہر جواب لال کا بیٹا چلاتا تھا۔ سویرا اسے لے کر کھڑی ہو گئی۔ سڑک سفید ہو چکی تھی۔ چھوٹے بڑے خوب مستی کر رہے تھے۔ آسمان سیاہی میں لپٹا تھا کیا بادل آج نوحہ کناں تھے؟ اس نے آسمان کی طرف دیکھا' اسے سکون نہ ملا۔

سویرا سڑک پر جھکی برف جمع کر رہی تھی۔ اس کے سر پر جمال کھڑا تھا۔

میدے کا بیٹا۔۔۔ آپا کا بھائی۔۔۔ جمیلہ کا خالہ زاد۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ جمال درزی۔۔۔ ماسٹر۔۔۔ جادوگر۔

جمال درزی نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آسمان سے برف گر رہی تھی۔ کیا وہ کروبی (اعلا درجے کا فرشتہ) تھا۔ ہاں شاید۔۔۔ نہ ہوتا تو ایسے پھوٹ پھوٹ کر نہ رو رہا ہوتا۔ وہ چوغہ پوش درویش تھا۔ اسے چوغہ پوش درویش ہی رہنے دیا گیا۔

جمال درزی دائم الحبس (عمر بھر کا قیدی) برف برساتے آسمان تلے کھڑا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔



نورِ عین

وہ اک حرفِ یقین

ناولٹ

وہ ایک خوب صورت سرسبز باغ تھا۔ تاحد نظر مخملی گھاس کی وسیع و عریض چادر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔ دودھیا سی ٹھنڈی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں طرف ٹھنڈے یخ پانی کا شفاف چشمہ بہہ رہا تھا جس میں جھلکتا نیلا آسمان روح کو تازگی بخش رہا تھا۔ بائیں طرف گہرے سرخ اور بے تحاشا سفید رنگت لیے شبنم سے دھلے گلاب بہار کی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ فاریہ نے گلاب کا سرخ پھول ٹہنی سمیت توڑا اور اسے چشمے کے ٹھنڈے میٹھے پانی سے غسل دینے لگی۔

پھول پانی کی لہروں سے ٹکراتا ہوا ایسے جھول رہا تھا' جیسے عالم سرور میں ہو۔ فاریہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ یونہی ہنستے ہنستے اس نے سامنے دیکھا تو مبہوت رہ گئی۔ زمین سے آسمان تک ایک کمان کی شکل میں پھیلی ہوئی قوسِ قزح بے تحاشا خوب صورت لگ رہی تھی۔ فاریہ کا ہاتھ اب ساکت ہو چکا تھا کیونکہ آسمان سے زمین تک پھیلی اس رنگین سیڑھی سے کوئی نیچے اتر رہا تھا۔ وہ شاید کوئی پری تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے وہ دھیرے دھیرے نیچے آئی تھی اور اب فاریہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فاریہ حیرت سے یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ خوف زدہ ہرگز نہیں تھی۔ نہ جانے اس سفید لباس میں ملبوس وجود میں ایسی کیا بات تھی کہ فاریہ کو اس سے ذرا برابر بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اب وہ پری اس کے قریب آچکی تھی۔ اتنی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی تھی۔ دھندلے نقوش واضح ہوئے تو پھول فاریہ کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے پانیوں میں جا گرا۔

"ماما!" فاریہ کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

"ماما! آپ آگئیں۔ میں نے آپ کو بہت مس کیا۔" فاریہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ماما خاموشی سے مسکراتی رہیں۔

"ماموں آپ بھی... آپ کب آئے۔ اب تو آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے؟" فاریہ نے بائیں جانب دیکھا تو عامر ماموں بھی سرتاپا سفید لباس میں ملبوس مسکراتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

فاریہ وارفتہ سی اپنی ماما کی طرف بڑھی لیکن ایک عجیب منظر نے اسے ساکت کر دیا۔ جس جگہ اس کی ماما کھڑی تھیں' وہاں سے مخملی گھاس غائب ہو چکی تھی اور خشک مٹی اڑ اڑ کر ان کے پاؤں کو ڈھانپ رہی تھی۔ ان کا وجود تیزی سے بھربھری مٹی میں تبدیل ہو رہا تھا اور پھر ان کا چہرہ بھی مٹی نے ڈھک لیا۔ جس جگہ وہ کھڑی تھیں' اب وہاں بھربھری مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ فاریہ نے دھڑدھڑاتے ہوئے دل کے ساتھ بائیں جانب دیکھا تو وہاں بھی مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔

"ماموں...!" وہ زور سے چیخی۔

اب وہ مٹی باغ میں موجود ساری مخملی گھاس تیزی سے ڈھانپ رہی تھی۔ وہ خوب صورت باغ تیزی سے ایک قبرستان کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ نیلے پانی کا وہ ٹھنڈا میٹھا چشمہ لال رنگ کے گاڑھے مائع میں بدل چکا تھا۔

"نہیں نہیں!" اپنے کانوں پر کس کر ہاتھ رکھے آنکھوں کو سختی سے بھینچے ہوئے فاریہ حلق کے بل چیخ رہی تھی۔ حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔ نفی میں دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے وہ یکایک اس چشمے میں جا





گری۔
ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ پسینے میں شرابور تھی۔ صد شکر کہ کمرے کی لائٹ کھلی ہوئی تھی۔ ایک زبردست سی جھرجھری لیتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی۔ دیوار پر موجود کلاک رات کے تین بجا رہا تھا۔ آج پھر اس کی نیند کا دورانیہ صرف تین گھنٹے رہا۔ بے چینی اور خوف نے اس کو پوری طرح سے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ اس نے پاؤں میں سلیپر اڑسے اور واش روم میں گھس گئی۔ پورے پانچ منٹ بعد جب وہ باہر نکلی تو کمرے میں تیزی سے ادھر سے ادھر چکر لگانے لگی۔ ساری دنیا خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور وہ دھک دھک کرتے ہوئے دل کے ساتھ پورے کمرے میں ادھر سے ادھر چکرا رہی تھی' کسی پنڈولم کی طرح.....

"اوہ گاڈ! یہ تو کم و بیش پچیسواں چکر ہے۔ آخر وجہ کیا ہے؟"

جاگنگ کرتا ہوا صارم کھڑکی کے پردے پر چکراتے ہوئے نسوانی وجود کو دیکھ کر بڑبڑایا۔ وہ صبح پانچ بجے سے اسے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ یہ پریڈ رات تین بجے سے جاری ہے۔

اب وہ عین اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا اور جاگنگ کرنا بھول چکا تھا۔

"ایک سو دس.....ایک سو گیارہ.....ایک سو بارہ۔" اس نسوانی وجود کو پرسوچ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کی گنتی اب بھی جاری تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم ایوری باڈی!" بلیک ٹوپیس پہنے خوشبوؤں میں بسے ہوئے صارم نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔ البتہ گہری پرشوخ نگاہیں سامنے موجود ہستی پر جمی ہوئی تھیں' جو پڑی سی زرد چادر سے اپنا وجود ڈھکے ناشتے میں مگن تھی۔ اس کی سفید رنگت میں سنہری پن جھلک رہا تھا۔ غضب کی گھنی پلکوں نے خوب صورت آنکھوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔ البتہ چہرے پر یاسیت طاری تھی۔ پھر بھی صارم نے ایک نظر دیکھتے ہی اسے پسندیدگی کی سند عنایت کردی۔

مگر عجب بے نیازی تھی اس کے انداز میں کہ اس نے نظر اٹھا کر ایک دفعہ بھی صارم کی طرف نہیں دیکھا حالانکہ وہ اچھا خاصا ڈیشنگ تھا۔ ہزاروں میں اپنے دراز قد اور پرکشش شخصیت کی وجہ سے ممتاز نظر آتا تھا۔ بلاشبہ وہ ماحول پر کسی سحر کی طرح چھا جانے کی صلاحیت رکھتا تھا لیکن وہ گڑیا جیسی لڑکی اس کے سحر کا شکار بہرحال نہیں ہوئی تھی۔

صارم نے کندھے اچکاتے ہوئے کرسی سنبھالی۔

"نیند پوری ہو گئی؟" ثمینہ بیگم نے فرائی انڈے کی پلیٹ صارم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ان کے لہجے میں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے پیار ہی پیار چھلک رہا تھا۔

"جی ماما! بہت اچھی نیند آئی بلکہ بہت عرصے بعد اتنی گہری نیند سویا ہوں۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں چلے جاؤ' اپنے بیڈ روم کی بات ہی کچھ اور ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے دیکھ کر کسی اور کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔"

گہری نظروں سے فاریہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔ صارم کی بات پر فاریہ نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اگلے ہی پل فوراً" جھکالیں۔

فاریہ کی کالی سیاہ آنکھوں نے صارم کو سچ مچ متاثر کیا تھا۔ اس کی ساحر آنکھوں میں کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ حالانکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے دیکھ کر فاریہ کے گالوں پر گلال بکھر جائے گا۔ وہ شرمائے گی۔ لجائے گی لیکن وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

"شاید وہ اپنے آپ پر گزرنے والی قیامت کے کرب سے ابھی تک آزاد نہیں ہو پائی ہے۔" یہ سوچتے ہوئے صارم نے ایک ہاف فرائی انڈا کانٹے کی مدد سے اپنی پلیٹ میں منتقل کیا۔

"مجھے تو بڑے سکون کی نیند آئی۔ آخر میرا بیٹا جو گھر آگیا ہے۔ ویسے کس کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔" ثمینہ بیگم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کسی کی نہیں ماما! بس ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔ آپ بتائیں پاپا کب تک آئیں گے۔" صارم نے چائے کا بھاپ اڑاتا کپ اٹھایا۔

"رات کو حسن صاحب سے بات ہوئی تھی۔ ابھی پاکستان آنے میں ایک دو مہینے لگیں گے۔ تمہیں تو پتا ہے نا کہ اپنے کاروبار سے ان کا لگاؤ کتنا شدید ہے۔ ویسے اتنے دن باہر کبھی گزارے تو نہیں۔ شاید کام کا برڈن کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ اب تمہیں بھی کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن تم نے تو اپنے لیے الگ ہی کام چن لیا ہے۔" ثمینہ بیگم کے انداز میں ہلکی سی ناراضی در آئی۔

"کم آن ماما! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ پاپا کی خواہش پر ہی تو میں نے یہ پروفیشن چنا ہے اور آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں کاروبار میں بھی ان کا ہاتھ ضرور بٹاؤں گا۔" صارم نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی تر و تازگی سمیٹتے ہوئے کہا۔

"انسان ہی رہو' دیو بننے کی کوشش نہ کرو۔ ویسے تمہاری کانفرنس کیسی رہی۔"

"بہت زبردست۔ پہلے ریسرچ ورک اور پھر کانفرنس دونوں ہی بہت کامیاب رہے ہیں۔ میرے کیریر میں بہت ہیلپ کرے گی یہ ریسرچ۔" صارم نے فاریہ کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز چائے پینے میں مصروف تھی۔

"شکر ہے اللہ کا کہ تمہارا کام مکمل ہوا۔ میں تو کب سے سوچ رہی تھی کہ تم جلدی سے آجاؤ تاکہ تمہاری شادی کی باقاعدہ تقریب کروں۔ اب تم آگئے ہو تو لگے ہاتھ یہ کام بھی کر لیتے ہیں۔ تمہیں کیا پتا۔ ماں کے دل میں بیٹے کی شادی کا ارمان اس کے بچپن سے ہی کیسے مچلتا رہتا ہے۔"

"کیوں ماما! دوسری بہو لانے کا ارادہ ہے۔ پہلی پسند نہیں آئی کیا۔" صارم نے فاریہ کی طرف دیکھا' جس کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔

"شکر ہے محترمہ انسانوں جیسے جذبات بھی رکھتی ہیں۔" دل ہی دل میں ہنستے ہوئے وہ فاریہ کی کیفیت پر محظوظ ہوا۔

"ارے نہیں میری بہو تو بہت پیاری ہے اور مجھے دل و جان سے پسند ہے۔ مت بھولو بیٹا جی! کہ ابھی صرف نکاح ہوا ہے۔ رخصتی ابھی باقی ہے۔ نکاح پر تو میں اپنے دل کے ارمان نکال نہیں پائی۔ اب شادی پر دیکھنا بس تم۔ میں آج ہی حسن صاحب سے بات کرتی ہوں۔ تم کل ہی کارڈ چھپنے کے لیے دے آنا۔"

ثمینہ بیگم کی بات پر فاریہ کو زور کا اچھو لگا تھا۔ شدید کھانسی سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

"یہ پانی لیجیے۔" صارم نے اپنا پانی کا گلاس فاریہ کی

طرف بڑھایا لیکن صارم کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے فاریہ نے اپنے قریب پڑی منرل واٹر کی بوتل کا ڈھکن کھول کر منہ سے لگا کر سرعت سے اپنے حلق میں انڈیلا۔ طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ کسی کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

صارم ابھی تک ہاتھ میں پانی کا گلاس پکڑے ششدر تھا۔ چہرے پر موجود پریشانی ماتھے پر شکنوں کے جال میں ڈھل چکی تھی۔

"تم مائنڈ نہ کرنا بیٹا! فاریہ ابھی تک اپنی تکلیف کو بھلا نہیں پائی ہے۔ اسی لیے ایسا کر جاتی ہے اور ویسے بھی وہ ہمیشہ منرل واٹر ہی پیتی ہے۔ دوسرے پانی کو تو اس نے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ابھی غم تازہ ہے۔ وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف پلٹ آئے گی۔" انہوں نے اپنے تئیں صارم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"اوکے ماما! میں رات کو دیر سے گھر آؤں گا۔ آپ کھانا کھا لیجیے گا۔"

سنجیدگی سے کہتے ہوئے صارم نے بریف کیس اٹھایا۔ ثمینہ بیگم اس کے چہرے سے اس کے جذبات کا اندازہ نہیں لگا پائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے اللہ کا آپ آ گئے۔" بابا کب آئیں گے۔ کی گردان کرتے ہوئے آپ کی لاڈلی ابھی ابھی سوئی ہے۔" فرح بیگم نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔

"بس آج دکان پر بہت رش تھا اسی لیے دیر ہو گئی۔ یہ فروٹس پکڑو۔ صبح فاریہ کو دے دینا۔ اس نے فرمائش کی تھی۔" احمد صاحب نے بائیک گیٹ کے پاس بنی چھوٹی سی روش پر کھڑی کرنے کے بعد اس کے اگلے ہینڈل سے لٹکا ہوا شاپر فرح بیگم کو تھمایا۔

"آپ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائیں۔ میں دو منٹ میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔ آپ کی فیورٹ بریانی بنائی ہے۔"

"بریانی.... کیا بات ہے۔ جلدی سے لے آؤ پھر' بہت بھوک لگی ہے۔" احمد صاحب واش بیسن کی طرف بڑھے۔

"عفت بھابھی کے بھائی کی شادی ہے۔ انہوں نے خاص طور پر شادی میں شرکت کے لیے دعوت دی ہے لیکن شادی میں شرکت بڑی مہنگی پڑ جائے گی۔ زیادہ نہیں ایک سوٹ میرا' دو فاریہ کے۔ دولہا دلہن کے کپڑے اور سلامی کے پیسوں پر ہی آٹھ دس ہزار اٹھ جائیں گے۔ کرائے کے اخراجات الگ سے ہوں گے۔ میں سوچ رہی ہوں' بھابھی کو منع کر دوں۔" فرح بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے نہیں۔ رشتے داری کا معاملہ ہے۔ ہم شادی میں شرکت ضرور کریں گے۔ پیسوں کی فکر نہ کرو۔ میں انتظام کر لوں گا۔ تم جانے کی تیاری کرو۔ بیس ہزار کافی ہوں گے نا' میرے بھی ایک دو سوٹ بنا لینا۔" احمد صاحب نے ذوق و شوق سے بریانی کھاتے ہوئے کہا۔

"بیس ہزار میں تو اچھی خاصی تیاری ہو جائے گی۔ آپ کھانا کھا لیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

ایک سرشاری کے عالم میں فرح بیگم نے تیزی سے پاؤں میں چپل اڑسی اور چائے بنانے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہو رہا ہے ماما جان!" صارم نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے بے حد خوشگوار موڈ میں کہا۔

"کچھ نہیں ماما کی جان! چیز آملیٹ بنا رہی ہوں سوچا آج تمہارا فیورٹ ناشتہ بناؤں۔" ثمینہ بیگم نے پیاز کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ بیٹھیں ماما! آج ناشتا بدولت خود بنائیں گے۔" صارم نے ثمینہ بیگم کے گلے میں بازو حمائل کیے۔

"اچھا.... پھر کھا سکو گے۔ انڈا ابالنا تو تمہیں آتا نہیں۔ آملیٹ خاک بناؤ گے۔ پیچھے ہٹو۔ فضول میں دیر کروا رہے ہو۔" ثمینہ بیگم نے صارم کو پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

"ارے ماما! چھ ماہ ملک سے باہر رہا ہوں۔ گھر سے دوری نے اچھا خاصا کوکنگ ایکسپرٹ بنا دیا ہے۔ آپ یہ چھوڑیں اور یہاں بیٹھیں اور میرا کمال دیکھتی جائیں۔" ثمینہ بیگم کے ہاتھوں سے نرمی سے ادھ کٹی پیاز لے کر انہیں کچن میں موجود کرسی پر بٹھاتے ہوئے صارم نے کہا۔

"ماما! یہ چھری اتنی کالی کیوں ہو گئی ہے۔ آپ اسے جلاتی رہی ہیں کیا۔ ہمارے گھر کے برتن تو ہمیشہ چمکتے رہتے ہیں۔" پیاز کے بعد ہری مرچیں باریک باریک کترتے ہوئے وہ حیرانی سے بولا۔

"پتا نہیں بیٹا! میں نے کافی مانجھا ہے اسے۔ ٹھیک ہو جاتی ہے پھر سے کالی ہو جاتی ہے بلکہ دو تین دفعہ تو چھریاں بھی تبدیل کر چکی ہوں۔ شاید فاریہ سے جل جاتی ہیں۔ خیر چھوڑو میں نے کبھی اس سے پوچھا نہیں۔ ابھی اپنے حواس میں ہی کہاں ہے۔ اللہ اس پیاری سی بچی پر رحم کرے۔ تم مجھے یہ بتاؤ آملیٹ تو شاید بنا لو پراٹھے کیسے بناؤ گے۔" ثمینہ بیگم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اب آپ مجھے انڈر ایسٹیمیٹ کر رہی ہیں۔ بس پانچ منٹ صبر کریں۔ ایسے خستہ اور سنہری پراٹھے بناؤں گا کہ آپ انگلیاں چاٹتی رہ جائیں گی۔" صارم نے مصروف سا جواب دیا۔ انڈے اور چیز کی خوشبو آہستہ آہستہ کچن میں پھیلنے لگی۔

"ماما! ایک بات بتائیں۔ کیا فاریہ اس رشتے سے خوش ہے۔ ایکچوئلی اس کے کل والے رویے سے میں کافی ڈسٹرب ہوں۔ آپ نے نکاح سے پہلے اس کی رضامندی تو لی تھی نا۔" صارم نے ایک لمحے کو رک کر پوچھا۔

"نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے خود اس سے نکاح سے پہلے بات کی تھی۔ ویسے بھی وہ مضبوط کردار کی حامل ہے۔ اتنا تو اندازہ میں لگا ہی چکی ہوں۔ تم خوامخواہ کے وہم اپنے دل میں مت پالو۔ تم تو جانتے ہو نا کہ اپنے واحد سہارے کے چھوٹ جانے کا غم انسان کو اپنا آپ بھلا دیتا ہے اور ویسے بھی جن حالات میں شادی ہوئی ہے' وہ شدید ڈسٹرب ہو گئی ہے ورنہ بہت اچھی بچی ہے۔ میرے ساتھ کچن کا سارا کام کرواتی ہے۔ ہاں بس صفائی پسند تھوڑی زیادہ ہے۔ گرم پانی سے کچن کو دن میں تین چار بار دھوتی ہے۔ پانی ابالے بغیر نہیں پیتی۔ مجھ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ بس سات آٹھ بڑی بڑی چادریں ہی منگوائی ہیں۔ چادر لپیٹ کر ہی کمرے سے باہر آتی ہے۔ روزانہ نئی چادر بدلتی ہے حالانکہ گھر میں کوئی مرد ملازم بھی نہیں ہے۔ شاید اس کا لائف اسٹائل ہی ایسا ہو گا آہستہ آہستہ ایڈجسٹ ہو جائے گی۔ ویسے میرا دل بہت چاہتا ہے کہ وہ میرے پاس بیٹھے' ہنسے کھیلے۔ مجھ سے باتیں کرے۔ نہ جانے وہ دن کب آئے گا۔ پتا نہیں وہ اس صدمے سے باہر کیسے نکلے گی۔" ثمینہ بیگم نے صارم کو گرم گرم خستہ پراٹھے کو پلیٹ میں رکھتے دیکھ کر تسلی سے جواب دیا تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔

"مگر اسے جلد سے جلد اس صدمے سے نکلنا ہو گا آخر اس کا شوہر ایک بے حد قابل اور کوالیفائڈ سائیکاٹرسٹ ہے۔" ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے صارم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

"ارے واہ! آج تو لاؤنج میں بڑی رونق ہے۔" صارم نے ٹی وی کے سامنے بیٹھی فاریہ کو دیکھ کر ٹکڑا لگایا۔ وہ آج بھی بڑی سی چادر میں ملفوف تھی لیکن آج چادر کا رنگ گلابی تھا۔ چہرہ گلابی رنگ کے ہالے میں مقید چاند کا ٹکڑا لگ رہا تھا لیکن وہ چہرہ آج بھی بے تاثر ہی تھا۔

صارم نے سائیڈ پر رکھے ہوئے سنگل صوفے پر اپنی جگہ سنبھالی اور اپنے پیپر سینٹرل ٹیبل کے پائے دان پر رکھ دیے۔ یوں کہ فاریہ اسے مخاطب کیے بغیر ادھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

"ارے کہاں بیٹا! یہ تو کبھی ٹی وی دیکھتی ہی نہیں ہے۔ وہ تو میں نے ہی زبردستی شام کی چائے پر اسے ادھر بلوا لیا ہے۔ فاریہ کو تو آج کل کی لڑکیوں کی طرح کپڑے

بنانے کا کوئی شوق ہی نہیں۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ زبردستی پاس بٹھایا ہے تاکہ اس کی پسند ناپسند اور کلرز چوائس کے بارے میں مجھے کچھ آئیڈیا ہی ہوجائے۔ ویسے فاریہ بیٹا! یہ اورنج اور گرین کنٹراسٹ بھی اچھا لگ رہا ہے نا۔ ذرا یہ ڈائری اور پینسل پکڑانا۔ ڈیزائنر کا نمبر نوٹ کرلوں۔ یہ ڈریس بھی ضرور آرڈر کروں گی۔ کسی دعوت میں پہن لینا۔"

ثمینہ بیگم نے فاریہ کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ٹیبل پر رکھی ہوئی ڈائری اور پنسل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ فاریہ کی عدم دلچسپی بھانپ چکی تھیں۔

ثمینہ بیگم اپنی ڈائری میں جبکہ صارم فاریہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔ جس کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔ ہونٹوں کو کچلتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں کو پلکیں جھپک جھپک کر روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ سانس کا زیروبم بھی بڑھ چکا تھا۔ شاید وہ اٹھ کر چلی جاتی اگر صارم نے اس کا راستہ مسدود نہ کررکھا ہوتا۔ صارم نے صوفے پر پڑے ہوئے ریموٹ کی مدد سے چینل تبدیل کردیا۔ کوئی غزل آرہی تھی۔

ایک مشہور ٹی وی سیریل کا سریلا ٹائٹل سونگ کیمرے میں جادو بکھیر رہا تھا۔ بظاہر گانے کے بولوں میں گم صارم کی ساری توجہ نارمل ہوتی ہوئی فاریہ کی طرف تھی۔

"ہوں تو یہ بات ہے۔" اپنی گہری پرسوچ نگاہوں کو ٹی وی اسکرین پر مرتکز کرتا ہوا وہ کسی نتیجے پر پہنچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے احمد صاحب! آپ آج کل بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ فاریہ بھی کہہ رہی تھی کہ پاپا مجھ سے پیار نہیں کرتے۔ کیا بات ہے۔ کچھ تو بتائیں۔ آپ کی خاموشی اب مجھے بھی پریشان کرنے لگی ہے۔" فرح بیگم نے آنکھوں پر بازو رکھے خاموشی سے لیٹے ہوئے احمد صاحب کا کندھا ہلایا۔

"سب کچھ ختم ہوگیا سب کچھ۔ ہم برباد ہوگئے۔ میرا جما جمایا کاروبار۔ میری برسوں کی محنت سب کچھ مٹی میں مل گیا۔" تیزی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے سر کے بالوں کو اپنی دونوں مٹھیوں میں زور سے جکڑا کہ اب اپنی بربادی کو دل میں دبانا ممکن نہیں تھا۔

"کک۔ کیا مطلب۔ کیسے احمد صاحب! دکان تو اچھی خاصی چل رہی تھی۔ ایک دم سے کیسے ختم ہوگئی۔" پھٹی پھٹی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے فرح بیگم نے بمشکل اپنی بات پوری کی۔

"خادم حسین میرا وفادار۔۔۔ میرا سب کچھ لوٹ کر فرار ہوگیا۔ پرسوں دکان کا سارا مال ٹرک پر لوڈ کروایا تھا گودام بھجوانے کے لیے۔ نئی دکان جو کرائے پر لی تھی۔ ساتھ میں تیس لاکھ روپیہ کیش بھی اسے دے بیٹھا کہ وہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادے لیکن اس نے میرے اعتبار کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور مال سمیت غائب ہوگیا۔ اپنا کاروبار تو جو ڈوبا سو ڈوبا میں بیس لاکھ کا قرض دار بھی ہوگیا۔ ایف آئی آر درج کروائی تو ہے میں نے لیکن جو لے کر بھاگا ہے وہ کب کسی کے ہاتھ آئے گا۔ گھر کا خرچ۔ سر پر چڑھا ہوا قرض کا بوجھ میری جان لے کر چھوڑے گا دیکھ لینا!" اپنی بات مکمل کر کے وہ اونچے لمبے مرد ہچکیوں سے رو پڑے۔

"فکر نہ کریں احمد صاحب! اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔" شوہر کو دلاسا دیتے ہوئے فرح بیگم کے دو آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر دوپٹے کے پلو میں جذب ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

"ماما! میرا واش روم لاکڈ کیوں ہے۔ مجھے نہانا ہے۔" اپنے ہاتھ میں تولیہ اور کپڑے اٹھائے صارم ثمینہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوا۔

"ہاں بیٹا! میں نے اپنے اور تمہارے واش روم میں تیزاب ڈلوایا ہے تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔" ثمینہ بیگم نے ہاتھوں پر کولڈ کریم کا مساج کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے جلدی ہے ماما! ایک گھنٹے تک میری

ڈاکٹر جانسن کے ساتھ میٹنگ ہے۔ مجھے بس کچھ ہی دیر میں نکلنا ہے۔"

"اچھا۔ تم ایسا کرو۔ فاریہ کا واش روم استعمال کرلو۔ ویسے بھی ابھی وہ کچن میں بزی ہے۔" ثمینہ بیگم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"اوکے ماما! تب تک آپ میرے لیے چائے بنوادیں۔ چائے پی کر نکلوں گا بس۔" کمرے سے باہر نکلتے ہوئے صارم نے فرمائش داغی۔

"صارم نہانے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچا تو سامنے ہی ڈریسنگ ٹیبل پر ڈھکی ہوئی چائے دیکھ کر بے اختیار مسکرادیا۔ تیار ہونے کے بعد وہ اپنے اوپر پرفیوم کا اسپرے کررہا تھا جب اس کی نظر سیف کے کھلے پٹ سے جھانکتے ہوئے شاپنگ بیگ پر پڑی۔

"یہ کام بھی کرہی دوں آج۔" صارم نے مسکراتے ہوئے اپنا بریف کیس اور شاپنگ بیگ اٹھایا۔

"فاریہ۔۔۔ کہاں ہیں آپ۔" فاریہ کے کمرے کے باہر پڑے ہوئے اپنے تولیے اور فاریہ کی چادر کو دیکھ کر وہ بے ساختہ پریشان ہوا۔ قدرے جھجکتے ہوئے وہ اندر داخل ہوا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور فاریہ اپنے ہاتھوں کو دھونے میں مصروف تھی۔ صارم کی آواز سن کر اس نے تیزی سے نل بند کیا۔

"یہ۔ یہ۔ کیا ہے آپ کے ہاتھ میں۔ اس کو پھینک دیں۔ گندا تاول ہے یہ۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کو اپنی چادر میں لپیٹ کر باہر پھینکا تھا۔ آپ اسے اندر کیوں لے آئے پھر۔" وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی مانند سہم گئی تھی۔

"میری بات سنو فاریہ!" صارم اس کی کیفیت سمجھنے لگا تھا۔

"نن نہیں ۔۔۔ آپ جائیں۔ اپنے کمرے میں جائیں۔ مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔" دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیلتی ہوئی وہ واش روم سے باہر نکلی۔ "آپ نے میرے باتھ روم میں جراثیم پھیلا دیے ہیں۔ اب وہ سارے کمرے میں پھیل جائیں گے۔ اب میں نہیں بچوں

گی۔ دیکھ لیجئے گا اور میری موت کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ صرف اور صرف آپ۔ جائیں یہاں سے چلے جائیں پلیز ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔" ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھتی چلی گئی۔

"اوکے۔ اوکے ریلیکس۔ ان چیزوں سے پرابلم ہو رہی ہے نا تمہیں۔ میں انہیں ابھی باہر پھینک دیتا ہوں۔" دونوں چیزیں اٹھا کر صارم نے تیزی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور انہیں باہر پھینکا۔

"آئی ایم سوری فاریہ! میری وجہ سے تمہیں اتنی پرابلم ہوئی۔ تمہارا واش روم یوز کرنے سے پہلے مجھے تم سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ سوری اگین! ویسے میں اپنا بیگ یہاں پر بھول گیا تھا۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو لے لوں۔"

گھٹنوں میں سر دیے بیڈ پر ساکت بیٹھی فاریہ کو اپنائیت سے مخاطب کرتے ہوئے صارم نے اس کے صابن کے کثرت استعمال کے باعث بے تحاشا سفید ہوتے ہوئے ہاتھوں کو تاسف سے دیکھا۔

"اور میں تو بھول ہی گیا۔ یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔" صارم نے فیروزی رنگ کا چمکتا ہوا شاپنگ بیگ فاریہ کے بیڈ کے ساتھ منسلک سائیڈ ٹیبل پر دھرا۔

"تمہیں جراثیموں سے ڈر لگتا ہے نا۔" صارم کی بات پر فاریہ کی شدید حیرت سے بھری آنکھیں اس پر گویا جم سی گئیں۔

"آپ کو کیسے پتا چلا۔" فاریہ کی آواز بے حد مدہم تھی بالکل کسی سرگوشی کی مانند۔

"یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ جراثیموں سے تو ہر کسی کو ڈر لگتا ہے۔ مجھے بھی لگتا ہے اور لگنا بھی چاہیے۔ آخر یہ ہمیں بیمار کرتے ہیں لیکن میں نے جراثیموں سے بچنے کا طریقہ ڈھونڈ لیا ہے اور سوچا کہ آپ کو بھی بتا دوں۔ یہ دیکھیں!" اینٹی جرم لوشن اور اسپرے بوتل صارم نے شاپنگ بیگ میں سے یہ چیزیں نکال کر گم صم سی بیٹھی فاریہ کے سامنے ڈھیر کیں۔

"یہ دیکھیں! اس سلوشن کی تھوڑی سی مقدار ہاتھوں پر لگانے سے ہر قسم کے جراثیم کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کو دھونے کی بھی ضرورت نہیں۔" صارم نے تھوڑا سا لوشن ہاتھوں پر ملتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایک اور بات... اگر کسی جگہ پر جراثیموں کے موجود ہونے کا شک ہو تو اس سلوشن کو اس اسپرے بوتل میں ڈال کر وہاں اسپرے کر دو۔ کام ختم۔ ویسے آپس کی بات ہے، تم یہ اسپرے اس جگہ پر بھی کر سکتی ہو، جہاں میں نے ٹاول لٹکایا تھا۔ وہاں کے جراثیم بھی مر جائیں گے۔" دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ فاریہ کا اعتماد جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور فاریہ کے چہرے کے ڈھیلے ہوتے عضلات صارم کی کامیابی کی دلیل تھے لیکن وہ ابھی بھی خاموش تھی بالکل خاموش۔

"دیکھو فاریہ! ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مضبوط رشتے سے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر تم چاہو تو تمہاری بے چینی اور گھبراہٹ کا خاتمہ میرے ہاتھوں ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ ڈر اور خوف کا خاتمہ کرنا ہی میرا پروفیشن ہے اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو تمہیں سوچوں کے اس گرداب سے آسانی سے نکال سکوں گا۔ آخر تمہارا شوہر ایک کامیاب سائیکاٹرسٹ ہے۔" اسے سوچنے کا موقع دیتے ہوئے صارم نے بریف کیس اٹھایا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کل کی بچی ہوئی دال نہیں کھانی۔ مجھے نوڈلز بنا کر دیں۔"

"نہیں بیٹا! ایسا نہیں بولتے۔ اتنی مزے کی دال ہے کھا کر تو دیکھو۔ آج میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کل آپ کے ماموں آئیں گے تو ان سے پیسے لے لوں گی پھر آپ کو نوڈلز بنا دوں گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو تمہارے پاپا کو اچھی جگہ نوکری مل جائے پھر میں تمہیں روز نوڈلز بنا کر دیا کروں گی۔" فرح بیگم نے فاریہ کو پیار سے سمجھایا۔

"مجھے پاپا سے بات نہیں کرنی۔ وہ گندے ہیں۔ مجھ سے پیار بھی نہیں کرتے۔" فاریہ نے منہ بسورا۔

"نہیں میرا بیٹا! ایسے نہیں کہتے۔ پاپا تو بہت اچھے ہیں۔" فرح بیگم کی بات ابھی منہ میں تھی، جب احمد صاحب آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔

"ذلیل عورت! میرے تکیے کے نیچے سے سو روپے تم نے اٹھائے ہیں نا۔ تمہیں لگا ہوگا کہ مجھے پتا نہیں چلے گا لیکن مجھے سب خبر ہے۔ نکالو میرے پیسے۔" فرح بیگم کے بال مٹھی میں جکڑے ہوئے اپنی لال سرخ آنکھیں تیزی سے گھماتے ہوئے وہ بے حد مضطرب تھے۔

"میں نے آپ کے پیسے نہیں لیے۔ وہ بیڈ سے نیچے گرے ہوئے تھے۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھے ہیں۔ خدا کے لیے میرے بال چھوڑیں۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔" اپنے بالوں کو احمد صاحب کی مضبوط گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بمشکل بولیں۔

دور کھڑی فاریہ کسی بت کی طرح ساکت کھڑی اپنی ماں کو روز کی طرح بغیر کسی وجہ کے اپنے باپ سے پٹتے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

صارم ابھی ابھی نہا کر باتھ روم سے باہر نکلا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا اپنے گیلے بالوں میں مسلسل انگلیاں پھیر رہا تھا۔ ادھ کھلے دروازے سے کمرے کے باہر کا منظر واضح طور پر آئینے سے جھانک رہا تھا۔ موبائل پر بزی ہونے کے باوجود اس کی ساری توجہ اپنے کمرے کے باہر مضطرب انداز میں کھڑی فاریہ پر تھی، جو شاید اندر آنے کے لیے اپنی ہمت مجتمع کر رہی تھی۔

"میں ابھی ای میل کرتا ہوں آپ کو۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو مجھے بتائیے گا۔ بس پانچ منٹ ویٹ کریں۔ میں لیپ ٹاپ آن کر رہا ہوں۔" صارم نے موبائل فون بند کرنے کے بعد اپنی رائٹنگ ٹیبل پر رکھا اور مکمل طور پر لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"پانچ۔ دس۔ پندرہ۔ بیس..." گھڑی کی سوئیاں بیس منٹ کا فاصلہ طے کر چکی تھیں۔ ای میل کر چکنے کے باوجود وہ ہنوز اپنے لیپ ٹاپ میں بزی تھا کہ فاریہ کا ازخود اس کے کمرے میں داخل ہونا ضروری تھا۔ یہ تو طے تھا کہ آج فاریہ کو اس سے بات کرنی ہی تھی۔ صبح سے شام تک کا یہ وقت فاریہ نے بہت مشکل سے کاٹا ہوگا۔ اس کے آنے کا پل پل انتظار کیا ہوگا۔ اپنی اذیت ناک کیفیت سے جان چھڑانے کا وہ خوب صورت سا خواب، جو صارم نے اسے دکھایا تھا، اس کی تعبیر پانے کے لیے وہ کتنی پرجوش ہوگی ایک سائیکاٹرسٹ ہونے کے ناتے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

صارم نے فاریہ کو ایک مضبوط راستہ، ایک پائیدار پل فراہم کر دیا تھا۔ لیکن اس پل سے صارم تک کا سفر اسے خود ہی طے کرنا تھا تاکہ اس کے پاس کسی موقع پر پیچھے ہٹنے کا کوئی جواز نہ رہے۔ صارم کو اس کی پیش قدمی کا انتظار کرنا تھا۔ سو وہ چپ چاپ انتظار کر رہا تھا۔

"خدا کے لیے صارم! مجھے اس تکلیف سے نجات دلوا دیں۔ مجھے بتائیں کہ اس اذیت سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مجھے پتا ہے، مجھ جیسی پاگل لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا آپ کے لیے ممکن نہیں۔ ایک بار بس ایک بار مجھے اس گھپ اندھیرے سے باہر نکال لیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں، خاموشی سے آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔" دستک دیے بغیر وہ اچانک ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اب بغیر کوئی تمہید باندھے آنسو بہاتے انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس سے مخاطب تھی۔

"ریلیکس فاریہ ریلیکس! یہاں بیٹھو اور آرام سے بات کرو۔" فاریہ کو کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں مخاطب تھا۔

"تمہارے مسئلے کا حل بتانے سے پہلے تمہیں ایک بات صاف بتا دوں کہ تم پاگل نہیں ہو۔ اچھی خاصی ذہین اور خوبصورت لڑکی ہو۔" مسکرا کر کہتے

ہوئے اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کے لیے تھوڑی دیر کو رکا مگر وہ سپاٹ نظریں لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"دوسری بات۔ تمہیں مجھ سے اپنی کیفیات شیئر کرتے ہوئے مکمل ایمانداری اور سچائی سے کام لینا ہوگا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری یہ کیفیت کب سے ہے۔" اپنی ذہانت سے بھرپور نگاہیں فاریہ پر ٹکائے وہ اس کی ہر ہر جنبش سے بہت سی باتیں کشید کر رہا تھا۔

"مجھے ہر جگہ جراثیم نظر آتے ہیں۔ بیڈ' صوفہ' زمین' کچن' باتھ روم کوئی جگہ ایسی نہیں ہے' جہاں پر میں ان سے چھپ سکوں۔ مجھے لگتا ہے یہ جراثیم مجھے بیمار کردیں گے۔ شدید بیمار.... پھر میں مرجاؤں گی۔ بالکل ویسے ہی۔ جیسے...." بولتے بولتے وہ یکایک چپ ہوئی۔

"اپنے آپ کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے میں بار بار ہاتھ دھوتی ہوں۔ بار بار نہاتی ہوں لیکن اپنے اردگرد جراثیموں کی موجودگی کا احساس میری جان نہیں چھوڑتا۔ اپنے کمرے کو میں کئی بار دن میں گرم پانی سے دھوتی رہتی ہوں۔ پورے گھر کو نہیں دھوسکتی اسی لیے کمرے سے باہر نکلتے وقت چادر لپیٹ لیتی ہوں۔ نہ جانے میرا ہاتھ کتنی بار جلا ہے۔ بغیر پکائے کوئی چیز نہیں کھاتی۔"

اب آنسو بڑے تواتر سے اس کے دودھ جیسے سفید اور مکھن جیسے ملائم گالوں سے پھیل رہے تھے۔ صارم کو فوراً" جلی ہوئی پھریاں یاد آئیں۔ اس نے سامنے پڑے ٹشو پیپر کے ڈبے سے سرعت سے دو ٹشو پیپر نکال کر اسے دیے۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کے نیچے براؤن حلقے اس کے رت جگوں کے گواہ تھے۔

"رات کو مجھے بہت ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ ان خوابوں کا خوف مجھے سونے نہیں دیتا پھر میں دوبارہ سو بھی نہیں پاتی۔ مٹی میں چھپے جراثیم روزانہ مجھے مٹی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے مار ڈالیں گے۔ اب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اور صارم اس کے آنسوؤں کو بہنے کا پورا پورا موقع دے رہا تھا۔

"ہر انسان کے اندر کسی نہ کسی چیز کا خوف ہوتا ہے فاریہ! تم بالکل تندرست اور نارمل ہو۔ البتہ کچھ میڈیسنز کی ضرورت ہے کیونکہ بعض اوقات دماغ میں موجود کیمیکلز کی مقدار میں کمی بیشی سے بھی اندر چھپا خوف انسان کی روٹین پر حاری ہونے لگتا ہے۔ بے تحاشا خوف دراصل ایک بیماری ہے' بالکل اسی طرح جیسے نزلہ' زکام کھانسی وغیرہ۔ پہلے تمہیں جراثیموں کی موجودگی کا وہم ہوتا ہے۔ پھر تم اس وہم کے بارے میں سوچتی ہو اور پھر خوف کا شکار ہو کر بار بار ہاتھ دھوتی ہو نہاتی ہو یا کمرے کو دھوتی ہو۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ نا؟"

فاریہ کے حیرت سے نیم والبوں کو دیکھ کر اس نے استفسار کیا اور اس کے تیزی سے اثبات میں سرہلانے پر مسکرا دیا۔

"تو پھر یقین رکھو' جیسے نزلہ زکام کھانسی وغیرہ علاج سے ٹھیک ہوجاتے ہیں ویسے ہی یہ بیماری بھی ٹریٹمنٹ کے بعد مکمل طور پر ختم ہوجاتی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں تمہاری اس بیماری کو جڑ سے ختم کردوں گا۔ بس تمہیں میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا اور جو میڈیسنز میں دوں گا' باقاعدگی سے کھانا ہوں گی۔ رہی بات رات کو ڈرنے کی تو میں ماما سے بات کرتا ہوں۔ وہ آج سے تمہارے کمرے میں سوجائیں گی۔" صارم نے غیر محسوس طریقے سے فاریہ کو بہت حد تک مطمئن کردیا تھا۔

انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کی آس لیے وہ رونا ترک کرکے نسبتاً" بہتر حالت میں کمرے سے جاچکی تھی۔

"کس کی طرح تمہیں مرنے سے ڈر لگتا ہے اور یہ ڈر کس طرح تمہاری زندگی میں شامل ہوا۔ بے شک تم نے ابھی مجھ سے چھپالیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم مجھ پر اتنا اعتبار کرنے لگو گی کہ اپنی زندگی کا ہر راز مجھ سے شیئر کرسکو۔ فی الحال یہ بہانہ ہی سہی۔"

گہری سوچ میں گم صارم موبائل کی بجتی بیل پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔



"یہ تم کیا کہہ رہے ہو صارم! فاریہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔ آئی کانٹ بلیو دس۔" میرے اکلوتے اور لائق فائق بیٹے کی شادی ایک ذہنی مریضہ کے ساتھ۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے حسن صاحب سے بات کرنی ہی ہوگی۔"

ثمینہ بیگم نے نفی میں سرہلاتے ہوئے تیزی سے موبائل پر نمبر ملایا۔

"ماما! یہ آپ کیا کررہی ہیں۔" صارم نے بجلی کی سی تیزی سے ثمینہ بیگم کے ہاتھ سے موبائل لے کر لائن کاٹی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا ماما! کہ یہ سب کچھ آپ کہہ رہی ہیں۔ میری ماما اتنی سنگ دل تو ہرگز نہیں ہوسکتی۔ ایک مجبور اور بے سہارا لڑکی کو ہم صرف اس وجہ سے کیسے چھوڑ دیں کہ وہ ایک معمولی سی ذہنی مرض کا شکار ہے اور مرض بھی ایسا جو قابل علاج بھی ہے۔"

"لیکن بیٹا!" ثمینہ بیگم متذبذب تھیں۔

"آپ تو جانتی ہیں ماما کہ ڈپریشن کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ میری ماما۔ ایک ماہر سائیکاٹرسٹ کی مدد کسی ڈپریسیو پرسن کو مرنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس بات پر مجھے یقین ہے۔ بس آپ کو کچھ عرصہ انتظار کرنا ہوگا اور ہاں ابھی آپ شادی کی بات نہیں کریں گی کیونکہ وہ ابھی اتنی بڑی تبدیلی کو قبول نہیں کرپائے گی۔ ویسے بھی کسی کے احسان کا قرض اتارنے کا یہ بہترین موقع ہے۔" ثمینہ بیگم کے پلٹنے کے تمام راستے بند کرتا ہوا وہ ان کو قائل کرچکا تھا۔



"روؤ نہیں فرح! دعا کرو کہ احمد بھائی جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں اور ویسے بھی انہوں نے کہاں جانا ہے۔ دو چار دن میں گھوم پھر کر خود ہی واپس آجائیں گے۔ اپنا نہیں تو اس کا ہی خیال کرلو۔" فرح بیگم کو دلاسا دیتے ہوئے عفت جہاں نے سہمی ہوئی فاریہ کو اٹھایا۔

"نہیں بھابھی! اب دعا کا کوئی فائدہ نہیں۔ پانچ دن ہوگئے ہیں احمد صاحب کو گھر سے گئے ہوئے۔ اگر عامر بھائی اس دن نہ آتے تو شاید احمد صاحب مجھے اور فاریہ کو مار ہی چکے ہوتے۔ پتا نہیں ہماری خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ وہ یکسر تبدیل ہوچکے ہیں۔ پتا نہیں ان پر کون سا جنون سوار ہوجاتا ہے بیٹھے بٹھائے مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ ویسے بھی بھابھی! جو گم ہوجائیں انہیں ڈھونڈ لیا جاتا ہے' مگر جو خود چھپ جائیں.... میں اکیلی عورت پانچ سالہ بچی کے ساتھ۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ اسے بھی زہر کھلادوں اور خود بھی کھالوں تاکہ جان ہی چھوٹے اس روز روز کے مرنے سے۔" زاروقطار روتی ہوئی فرح بیگم کا انداز یکایک ہی جارحانہ ہوا۔

"نہیں فرح! تم کیوں ہونے لگیں اکیلی اور بے سہارا۔ میں ہوں نا۔ تمہاری دو روٹیاں مجھ پر بھاری نہیں ہیں۔ اگر وہ پاگل مجھے مل بھی جاتا تو میں اسے جیل بھجوا دیتا۔ تم اپنا سامان پیک کرو۔ میں تمہیں ویسی زندگی تو نہ دے سکوں گا۔ جیسی تم گزارنے کی عادی ہو لیکن اپنی حیثیت کے مطابق جو ہوسکے گا' کروں گا۔ کیوں عفت!" عامر صاحب نے گم صم بیٹھی عفت بیگم کو پکارا جنہوں نے طوعاً" کرہاً" ہی اپنا سر اثبات میں ہلادیا۔



"آپ اس وقت یہاں!" فاریہ فریش ہو کر کمرے میں آئی تو اخبار پڑھتے ہوئے صارم کو اپنا منتظر پاکر شدید حیران ہوئی۔

"السلام علیکم!" صارم کے سلام کرنے پر فاریہ کو شرمندگی ہوئی۔

"وعلیکم السلام!" فاریہ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔

"آج بھی نیند کا دورانیہ کم رہا یا پھر کچھ بہتری آئی ہے؟" صارم نے اخبار رول کرکے سائیڈ پر رکھتے ہوئے گہری نظروں سے فاریہ کی طرف دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

"جی آج تو چھ سات گھنٹے آرام سے سوئی۔ آنٹی ساتھ تھیں۔ شاید اسی لیے۔" اپنی گھنی پلکیں جھکائے فاریہ نے آہستگی سے قیاس آرائی کی۔

"ویری گڈ!" صارم حقیقتاً" خوش ہوا۔ اچھے مستقبل کا یقین انسان کو بے فکر کردیتا ہے لیکن یہ بے فکری عارضی ہے۔ اسے مستقل کرنے کے لیے مزید محنت اور کوشش کرنا ہوگی۔ یہ بات جاننے کے باوجود فاریہ کا قدرے مطمئن چہرہ صارم کو بھی مطمئن کرگیا تھا۔

"دراصل میں تمہیں یہ میڈیسنز دینے آیا تھا۔ شروع تو رات کو ہی کرنی تھیں لیکن جب میں گھر آیا' تم سو چکی تھیں۔" صارم نے سفید شاپنگ بیگ کھولا۔

"ویسے ناشتا کیا ہے تم نے۔" چیک والی آف وائٹ شرٹ اور بلیک پینٹ پہنے خوشبوؤں میں نہائے صارم نے اپنے ہاتھوں پر اینٹی جرم سلوشن ملتے ہوئے فاریہ سے دریافت کیا۔

فاریہ کے گلے سے آواز نہیں نکلی لیکن سر نفی میں ہل گیا تھا۔

"مجھے پتا ہے' ابھی ناشتے کا ٹائم نہیں ہوا مگر آج مجھے جلدی کلینک پہنچنا تھا۔ اس لیے میں یہ لے آیا۔" بڑا سا جوس کا پیکٹ اور عمدہ سی پیکنگ میں پیک ڈسپوزیبل گلاس اسی سفید شاپر سے نکالتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ جوس بالکل اسٹیریلائزڈ ہے اور یہ گلاس بھی اور میرے ہاتھ بھی جرم فری ہیں تو کیا میں۔۔۔" گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے صارم نے فاریہ سے اجازت طلب کی۔ اس دفعہ بھی فاریہ نے ہولے سے اثبات میں سرہلایا تھا۔

جوس سے آدھا گلاس بھر کر صارم نے فاریہ کی طرف بڑھایا جسے اس نے آہستگی سے تھام لیا۔

"یہ میڈیسنز جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ اس کے استعمال سے ہوسکتا ہے' تمہیں بہت نیند آئے۔ سردرد اور متلی کی کیفیت بھی ہوسکتی ہے مگر گھبرانا نہیں۔ ایسا صرف ابتدا میں ہوگا۔ دراصل تمہارا جسم ان دواؤں کا عادی نہیں ہے نا۔ دوسری بات یہ کہ ان دواؤں کا اثر دیر سے ہوتا ہے لیکن دیرپا ہوتا ہے۔ اس لیے تھوڑی سی مستقل مزاجی کی ضرورت پڑے گی۔" صارم دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے مسکرایا۔

"مجھے آپ پر پورا یقین ہے۔ بس یہ بتائیں یہ کس طرح کھانی ہوں گی۔" گھونٹ گھونٹ جوس پیتی ہوئی فاریہ کا لہجہ پُریقین تھا۔

"اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں میڈیسنز میں خود کھلایا کروں گا۔" صارم نے مسکراتے ہوئے چھوٹی بڑی تین ٹیبلٹس اپنی ہتھیلی پر جمع کیں۔

"لیکن آپ تو اتنے مصروف رہتے ہیں پھر آپ یہ ذمہ داری کیوں اپنے سر لے رہے ہیں۔ آپ مجھے بتادیں' میں خود ہی کھالوں گی۔" فاریہ نے ہچکچاتے ہوئے صارم کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ٹیبلٹس کو اپنی نرم گداز ہتھیلی پر منتقل کیا۔

"تم شاید بھول رہی ہو فاریہ! کہ تم بذات خود میری ذمہ داری ہو۔ اور یہ میڈیسنز صرف صبح اور شام کے وقت ہی لینی ہیں۔ مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ تم فکر نہ کرو۔" صارم نے ایک اور گلاس کو پیکنگ سے نکال کر اسے منرل واٹر سے بھر کر فاریہ کے حوالے کرتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

فاریہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلا ارادہ ہی دیکھتی چلی گئی۔ وہ شہزادوں کی سی آن بان والا بندہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اتنا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی تھی۔ اس احساس کو محسوس کرکے اس کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑی تھی۔



"میری باجی شام کو چھ بجے تک پہنچ جائیں گی۔ تم ایسا کرو شامی کباب اور کوفتے ابھی بنالو۔ مرغی کا سالن اور سلاد رات کو ان کے آنے کے بعد بنالینا۔ روٹیاں بنانے کی ضرورت نہیں ہے' وہ میں بازار سے منگوالوں

گی۔" فرح بیگم کو ہدایات دیتے ہوئے عفت جہاں نے کمال مہربانی سے احسان کیا۔

"اور ہاں تمہارے بھائی آٹھ بجے تک آجائیں گے۔ لہٰذا سات بجے تک سب کچھ ریڈی ہوجانا چاہیے۔ تمہیں تو پتا ہے نا کہ تمہارا اتنا سا کام کرنا ہی انہیں کتنی تکلیف میں مبتلا کردیتا ہے' سو خیال رکھنا ورنہ اپنے بھائی کا گھر خراب کرنے کی ذمہ دار صرف اور صرف تم ہوگی۔"

شہادت کی انگلی اٹھائے فرح بیگم کو تنبیہہ کرتے وہ خدا کو بھولے بیٹھی تھیں۔

کمر میں اٹھنے والی ہلکی ہلکی ٹیسیوں کو نظر انداز کرتے فرح بیگم کمر کس کر کچن کی طرف بڑھیں کہ اتنا ڈھیر سارا کام نمٹنے میں وقت تو لیتا ہے۔

"ماما۔ ماما! دیکھیں مہوش اور سحرش نے مجھے مارا ہے اور میرا نیا رجسٹر اور پین بھی چھین لیا ہے۔" شدت سے روتی ہوئی فاریہ کچن میں داخل ہوئی تو اس کے نچے ہوئے بال اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر فرح بیگم تڑپ اٹھیں۔

"کیوں بیٹا! آپ کے ماموں نے انہیں بھی تو پین اور رجسٹر لاکر دیے تھے پھر انہوں نے آپ سے یہ چیزیں کیوں چھینیں۔ آپ نے کچھ کہا تھا؟" فاریہ پچھلے دس سالوں سے مہوش اور سحرش سے پٹتی چلی آرہی تھی۔ ہر بار فرح بیگم اس کے رونے پر دل پکڑ کر بیٹھ جاتیں لیکن اپنی جان سے پیاری بیٹی کا دفاع نہیں کرپاتی تھیں کہ جن بچوں کے باپ ان کی ذمہ داری دوسروں کے باپ پر ڈال دیتے ہیں۔ ان کے بچے دوسرے بچوں سے ایسے ہی پٹتے رہتے ہیں۔

"نہیں ماما! میں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر ماما! آج آپ مجھے منع نہیں کریں گی۔ میں آج ضرور ماموں کو سحرش اور مہوش کی شکایت لگاؤں گی۔" چپ چاپ آنسو بہاتی فرح بیگم کے بندھے ہوئے ہاتھوں نے اس میں اپنا دفاع خود کرنے کی ہمت پیدا کردی تھی۔

"نہیں بیٹا! ایسا نہ کرنا۔ میں۔۔۔ میں خود بات کروں گی۔ تم کچھ نہ کہنا میرا بیٹا۔" انہوں نے خوفزدہ ہو کر اسے مزید اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ انہیں یاد آگیا۔ ایک دفعہ انہوں نے سحرش کے بارے میں عامر بھائی سے بات کی تو عفت بیگم پورے دو ماہ ناراض ہو کر میکے بیٹھی رہیں۔ آئندہ قسم کھالی انہوں نے۔

"تم فکر نہ کرو۔ مہوش اور سحرش آئندہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔" فرح بیگم نے اسے بہلایا۔

فاریہ کے آنسو اب تھم چکے تھے۔ وہ بے رحمی سے لب کاٹتی ہوئی آسمان کو گھور رہی تھی۔ نیلے آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا سفید ٹکڑا سجا تھا۔ اس کی طرح ساکت اور خاموش۔



"اب کیسی طبیعت ہے فاریہ کی۔ سوتے میں ڈرتی تو نہیں ہے اب۔" گود میں کتاب دھرے بیڈ کے قریب پڑی کرسی کا فراغت سے بیٹھا صارم ثمینہ بیگم سے باتیں کررہا تھا۔ پچھلے دس دنوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ صبح فاریہ کو دوا کھلا کر جاتا اور پھر واپس آکر اسی کرسی پر بیٹھ کر اس کے جاگنے کا انتظار کرتا۔ میڈیسنز دینے کے بعد اس کے دوبارہ نیند میں جانے تک اس سے ہلکی پھلکی امید افزا باتیں کرنا اس کے لیے دنیا کا سب سے ضروری کام تھا جیسے۔۔۔ بیڈ پر محو خواب وجود اب اس کی زندگی میں اہم حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی زندگی بن چکا تھا۔

"اس کی ذہنی کیفیت کا تو کوئی خاص اندازہ نہیں لگا پائی ہیں۔ سارا دن تو سوئی رہتی ہے۔ جاگنے کے بعد بھی مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوتی۔ باتھ روم تک اس کے ساتھ جاتی ہوں کہ کہیں گر کر چوٹ نہ لگوالے۔ پہلے دن کی نسبت نیند کا دورانیہ کچھ کم ہوا ہے۔ اس کی حالت تو میرا دل دہلاتی ہے۔ سارا دن اس کے لیے دعائیں مانگتے گزر جاتا ہے۔"

بیٹے کی دلچسپی' فاریہ کی معصومیت اور بے بسی نے ان کی ابتدائی ناگواری کو پرخلوص سی فکر مندی میں بدل دیا تھا۔ ویسے بھی احسان کا بدلہ احسان ہی ہوا کرتا ہے اور وہ احسان فراموش ہرگز نہیں تھیں۔

اسے پانچ سات دنوں میں فاریہ کی نیند کا دورانیہ بھی نارمل ہوجائے گا اور کوآرڈینیشن سسٹم بھی ٹھیک ہوجائے گا۔ بس اس کے کھانے پینے میں تھوڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مچھلی' زیتون کا تیل' انڈے اور ڈرائی فروٹس اس کی اکثر ڈائٹ میں شامل کردیں۔"

"ہاں میں نے مینو سیٹ کرلیا ہے۔ باقی رہے ڈرائی فروٹس... یہ رہی ٹرے۔" ثمینہ بیگم نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی خوب صورت سے کور سے ڈھکی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ "جاگے تو خود ہی کھلا دینا۔ مجھے ذرا اپنے کمرے کی الماری سیٹ کرنی ہے۔ اتنی دیر تم اس کا خیال رکھنا۔ حالانکہ مجھے یہ بات کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" صارم کے گھنے بالوں کو پیار سے بگاڑتے ہوئے ثمینہ بیگم مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

وہ مسکراتے ہوئے فاریہ کی الماری کی طرف بڑھا اور دھلی ہوئی استری شدہ چادروں کے ڈھیر سے بڑی سی آف وائٹ کلر کی استری شدہ چادر نکال کر فاریہ کے سرہانے رکھتا ہوا وہ ذرا سا محتاط ہوا کیونکہ فاریہ کسمسانے لگی تھی۔

جاگنے کے بعد فاریہ سب سے پہلے اپنی چادر تبدیل کرکے اس پر موجود نادیدہ جراثیم سے چھٹکارا حاصل کرتی تھی۔ سوتے ہوئے بھی وہ اسی چادر کو اوڑھتی تھی۔ ابھی بھی وہ ہلکے اورنج کلر کی بڑی سی چادر میں ملفوف تھی اور صارم کے لیے فاریہ کا مطمئن ہونا دنیا کا سب سے اہم کام تھا۔ اب وہ دراز سے میڈیسنز نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بڑے سے ہال میں قطار در قطار سفید براق چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر رکھے ہوئے کھجور اور املی کی گٹھلیوں کے بڑے بڑے ڈھیر قطاریں بنا کر بیٹھی ہوئی عورتیں بڑی عقیدت سے پڑھ رہی تھیں۔ پھٹتے ہوئے دل اور خشک آنکھیں لیے انیس سالہ فاریہ اپنے دائیں بائیں اور سامنے قطاریں بنا کر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہی تھی جو پچھاڑیں کھاتی عفت ممانی اور زارو قطار روتی ہوئی سحرش اور مہوش کو دلاسا دے رہی تھیں۔ عفت مامی کے دل پر گھونسے کی طرح پڑتے ہوئے بین اسے اپنے دل کی آواز لگ رہے تھے۔

"کوئی نہیں جانتا ماموں! کہ آپ کے جانے سے ہم بھی بے اماں ہوئے ہیں۔ آپ کی موجودگی ہمارے لیے تپتی دھوپ میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی مانند تھی اور اب... اب تو کوئی روزن' کوئی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا نہیں ۔ کوئی ابر رحمت نہیں جو ہماری سلگتی زندگی پر ٹھنڈی پھوار کی طرح برسے۔ کاش ماموں! آپ اپنی بیماری ہم سے نہ چھپاتے تو شاید ہم آپ کو بچاپاتے۔"

اپنے دائیں جانب بیٹھی گم صم سی فرح بیگم کی پٹی بندھی ہوئی سرخ ہتھیلی سے اسے خوف محسوس ہوا جن کے مسلسل ہلتے ہوئے سفید ہونٹ اور لہو رنگ آنکھوں سے ٹپکتے آنسو کسی کو نظر نہیں آرہے تھے۔ مرنے والے کی بہن کو شاید کوئی دلاسے کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود فاریہ کی آنکھوں سے سیل رواں جاری ہوگیا۔ روتے ہوئے دو دن پہلے کا منظر اپنی تمام تر ہولناکی کے ساتھ اس کے ذہن کے کینوس پر ابھرا۔

"یہ لیں بھابھی! بھائی کو یخنی پلا دیں۔ بخار تو ابھی بھی کم نہیں ہوا۔ میرے خیال میں انہیں اسپتال لے چلتے ہیں۔ کہیں بخار زیادہ نہ ہوجائے۔"

یخنی کا پیالہ عفت جہاں کو پکڑا کر فرح بیگم نے عامر صاحب کے توے کی طرح جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو سچ مچ دہل گئیں۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ دو دن ہوگئے دوائی دیتے ہوئے۔ بخار تو ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا فاریہ! سحرش سے نمبر لے کر ایمبولینس منگواؤ۔ فرح! تم بچیوں کے پاس گھر پر رکنا۔ عامر کے ساتھ اسپتال میں جاؤں گی۔"

عفت بیگم کی بات منہ میں تھی جب ایک خوف ناک منظر نے وہاں موجود تمام افراد کو حقیقتاً" بے دم کردیا تھا۔ عامر صاحب کو الٹی آئی تھی اور شاید جسم کا سارا خون منہ کے راستے جسم سے باہر آگیا تھا۔ ماموں کو ہیپاٹائٹس سی ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں ٹھیک تو ہوجاؤں گی نا۔" فاریہ نے ہزار دفعہ کا پوچھا ہوا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

"کہو تو لکھ کردے دوں؟" صارم نے شرارت سے کہا۔ وہ ہلکا سا مسکرا دی۔

وہ دونوں شام کو لان میں ایک ساتھ واک کررہے تھے۔ فاریہ بڑی سی سفید چادر اوڑھے مطمئن سی اس کے ساتھ تھی۔

"گردن میں درد تو نہیں ہے نا اب؟" صارم نے ہلکا سا ترچھا ہوکر اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ درد تو اب بالکل ختم ہوگیا ہے۔ آنٹی روز تیل کی مالش جو کرتی ہیں' ورنہ گردن کے اوپری حصے میں ہونے والا یہ مستقل درد مجھے ایسے چمٹا تھا کہ مجھے بھول ہی گیا تھا کہ اس درد کے بغیر زندگی کیسی ہوتی ہے۔"

تاحد نظر پھیلا ہوا نیلا آسمان اور صارم کا ساتھ اسے تھکنے نہیں دیتا تھا۔ پچھلے بیس پچیس دنوں سے وہ اسے روزانہ شام کی واک کروا تا تھا اور واک کے بعد گہری سانس لینے کی لمبی لمبی مشقیں بھی۔ وہ حقیقتاً" فریش ہوجاتی تھی۔

"ہوں... اور نیند کا کیا حال ہے؟" صارم نے کچھ سوچتے ہوئے فاریہ سے پوچھا جس کے چہرے کے سنہرے پن میں گلابیاں گھل رہی تھیں۔ متوازن غذا اور بھرپور نیند کا اثر اس کے چہرے سے جھلکنے لگا تھا۔

"بہت اچھی ہے۔ سات آٹھ گھنٹے آرام سے سو جاتی ہوں۔ اب ڈراؤنے خواب بھی نہیں آتے۔ بس جراثیموں کا خوف جان نہیں چھوڑتا۔" فاریہ کے لہجے میں جھلکتا ہوا اطمینان یک دم بے اطمینانی میں بدلا۔

"فرض کرو فاریہ! اگر یہ جراثیم تمہیں لگ بھی گئے تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔" صارم نے چلتے چلتے رک کر اچانک اس سے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"کک... کیا مطلب آپ کا... آپ کو بھی تو جراثیموں سے ڈر لگتا ہے نا۔ آپ کو نہیں پتا کہ جراثیم انسان کو کتنی تکلیف دہ موت مارتے ہیں۔ اتنی اذیت ناک موت کہ جس کا تصور ہی انسان کو مارنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔" فاریہ کے چہرے کے عضلات اچانک ہی تن گئے۔ بھینچی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ وہ پھر سے وہی مضطرب پریشان حال فاریہ لگ رہی تھی۔

"نہیں فاریہ! موت اتنی ڈراؤنی نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھ رہی ہو۔ موت تو صرف ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقلی کا نام ہے۔ جیسے اس دنیا میں سانس لینا' دل کا دھڑکنا ضروری ہے' اسی طرح دوسری دنیا کی ضروریات میں ان چیزوں کا غیر فعال ہوجانا شامل ہے۔ موت تو انسان کو عالم سکون میں لے جاتی ہے۔ دنیا جہان کے غم بھلا دیتی ہے۔ اذیتوں سے نجات دیتی ہے' مگر صرف طبعی موت... خودکشی کی صورت میں اذیت ہے۔ یہاں بھی' وہاں بھی۔ تم ذہین لڑکی ہو۔ مجھ سے بہتر ہی جانتی ہوگی اس بارے میں... مگر یہ بتاؤ تمہیں موت سے ڈر کیوں لگتا ہے؟" صارم نے فاریہ کا چھپا ہوا ماضی کریدنے کی ہلکی سی کوشش کی اور وہ جو اس کی باتوں کو خاموشی سے سن رہی تھی۔ اس کے سوال پر چونک اٹھی۔

"کیا ہم کوئی اور بات کرسکتے ہیں؟" فاریہ نے واضح طور پر اس کا جواب دینے سے انکار کیا۔

"ٹھیک ہے پرنسس فاریہ! اگر آپ نہیں چاہتی ہیں تو ہم کچھ اور بات کرلیتے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ نماز پڑھتے ہوئے سجدہ لمبا کرتی ہیں یا بس..." پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نے ایک غیر متوقع سوال کیا تھا اور سوال ادھورا بھی شاید جان بوجھ کر ہی چھوڑا تھا۔

"جی۔۔۔ بس، تین دفعہ تسبیح پڑھتی ہوں، مگر یہ سوال۔۔۔" وہ متذبذب سی ہوئی اس سوال پر۔

"طویل سجدے سے اینزائٹی اور ڈپریشن جیسے امراض میں مبتلا ہونے کے چانسز بہت کم ہوجاتے ہیں۔ مالٹا کھاؤ گی۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اچانک ایک اور غیر متوقع سوال کیا۔ فاریہ حیران ہوتے ہوئے نفی میں سرہلا گئی مگر صارم نے ہاتھ بڑھا کر سبز رنگ کا کچا سا مالٹا توڑ لیا تھا اور اب مسکراتے ہوئے چھیل رہا تھا۔ نظریں فاریہ پر جمی تھیں۔ جو گڑبڑائی سی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ صارم نے وہ کچا سا مالٹا چھیل کر آدھا منہ میں رکھا اور آدھا مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھایا۔ فاریہ نے سہمی سہمی نظروں سے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صارم اس کی کیفیت سے خوب محظوظ ہورہا تھا۔ جیسے ہی اس نے کچا مالٹا پکڑنا چاہا۔ صارم نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"مت کھاؤ، اس میں بہت جراثیم ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے شرارت سے کہا اور بقیہ آدھا بھی اپنے منہ میں ڈال لیا۔ فاریہ زور سے ہنس پڑی۔

☼ ☼ ☼

"فاریہ! میں بھابھی سے ان کی سلائی مشین لے آئی ہوں۔ قمیص میں سلائی کرلوں گی، شلوار تم کرلینا۔ آہستہ آہستہ تمہیں سلائی بھی آجائے گی۔"

"ایک بات کہوں ماما!" فاریہ نے فرح بیگم کی آغوش میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

"کہو میری جان!" فرح بیگم نے اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیریں۔

"اب آپ کی صحت آپ کو سلائی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ کیا ہوجائے گا اگر میں ممانی کی بات مان کر کاسمیٹکس کی دکان میں سیلز گرل کی جاب کرلوں۔ وہ بھی خوش ہوجائیں گی اور ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ پیسے آجائیں گے اور پھر میں آپ کا علاج بھی آرام سے کروالوں گی۔ پچھلے دو سالوں میں آپ کی صحت بہت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔" فاریہ نے فرح بیگم کے لاڈ کا فائدہ اٹھا کر ان سے اجازت لینی چاہیے۔ فرح بیگم کی متحرک انگلیاں ساکت ہوچکی تھیں۔

"تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہیں کسی دکان میں نوکری کرنے کی اجازت دے دوں گی اور بھابھی کی خوشی کی بات مت کرو۔ ساری زندگی صرف اور صرف ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنی ہڈیاں گھسالیں۔ بدلے میں کیا ملا؟ بھائی کی موت کے بعد کیسی آسانی سے انہوں نے ہمیں الگ کردیا۔ حالانکہ بھائی کی پنشن سے اچھا خاصا گزارہ ہورہا ہے ان کا۔ تمہاری پڑھائی کا سہارا لینا چاہا تھا۔ میں نے بس ورنہ اپنا پیٹ کا بوجھ تو ہم اٹھا ہی لیتے۔ بھابھی کا مطالبہ کہ اس اسٹور نما کمرے کا کرایہ بھی دیں، میں نے وہ بھی مان لیا۔ مگر میری بیٹی دکان پر کام ہرگز نہیں کرے گی۔ تمہارے پیپرز میں دو ماہ ہی رہ گئے ہیں۔ آرام سے پیپرز کی تیاری کرو۔ بی اے کے بعد کسی اسکول میں ٹیچنگ کرلینا۔ میں تمہیں نہیں روکوں گی۔ مگر آج کے بعد اس نوکری کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔" دوٹوک لہجے میں اسے منع کرکے وہ سلائی مشین کی طرف بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"ماما کو یہ مرض کیسے ہوگیا۔ وہ تو بالکل ٹھیک تھیں۔ بس تھوڑی سی کمزور ہوگئی تھیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ماما کو ہیپاٹائٹس ہے۔" فاریہ کی کانپتی ہوئی آواز اور بہتے ہوئے آنسو اپنی ماں کو کھودینے کے ڈر کی چغلی کھا رہے تھے۔

"اصل میں آپ کے ماموں کو بھی ہیپاٹائٹس سی تھا۔ آپ نے ابھی مجھے بتایا کہ آپ کی ماما نے ان کے خون آلود کپڑے دھوئے تھے تو بس یہ بیماری تب ہی آپ کی ماما میں منتقل ہوئی تھی۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! ان کی چوٹ تو بہت چھوٹی تھی۔ ایسے کیسے جراثیم میری ماما کو لگ گئے۔" اسے یاد آیا۔ جب عامر ماموں نے خون اگلا تو ان کے خون آلود کپڑے فرح بیگم نے دھوئے تھے۔ ان دنوں ان کے ہاتھ پر چوٹ بھی لگی ہوئی تھی۔

"جراثیم بہت چھوٹے ہوتے ہیں مس فاریہ! اتنے چھوٹے کہ عام آنکھ سے انہیں دیکھا بھی نہیں جاسکتا۔ ایک آلودہ سوئی جراثیموں کے جسم میں جانے کے لیے کافی ہوتی ہے اور وہ تو پھر چوٹ تھی۔

آپ کی والدہ کے خون میں زہر موجود ہونے کے شواہد ملے ہیں۔ زہریلے مرکبات نے ان کے دل، جگر، گردے، دماغ غرض تمام وائٹل آرگنز کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہم پوری کوشش کررہے ہیں۔ آپ بھی دعا کریں۔ دماغ کو پہنچنے والے نقصان کی وجہ سے ان کی قوت گویائی بھی متاثر ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر مسلسل بول رہا تھا لیکن وہ کہاں سن پارہی تھی۔ "آپ دعا کریں" یہ الفاظ اس کے دماغ پر کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

"یا اللہ! میری ماما کو بچالینا۔ اگر ماما کو کچھ ہوگیا تو میری دنیا اندھیر ہوجائے گی۔ مجھے اس آزمائش سے بچالے مولا! میری ماما کی زندگی بخش دے۔ رحم کر میرے مالک رحم کر۔"

بلک بلک کر روتی با آواز بلند دعا مانگتی ہوئی فاریہ نے اسپتال میں موجود حسن صاحب کی توجہ حاصل کرلی تھی جو کبھی کبھار ہی اسپتال کا چکر لگایا کرتے تھے اور ان کا یہ چکر کتنے ہی مریضوں کے لیے امید کی روشنی لے کر آتا تھا۔

"کون ہے یہ لڑکی۔" انہوں نے اپنے ساتھ کھڑے وارڈ بوائے سے پوچھا جو اسپتال میں موجود انتہائی ضرورت مند مریضوں کی نشاندہی کرتا تھا۔ دوسرے معنوں میں اسپتال کے امور میں حسن صاحب کا مشیر خاص تھا۔

"اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ اصل میں اسپتال والوں نے انہیں ایکسپائرڈ ادویات دے دی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس بچی کی ماں مرنے کے قریب پہنچ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے تو اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کی ماں کا یہ حال ادویات کی وجہ سے ہوا ہے۔" اس نے حسن صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے اس کی ماں کے پاس لے چلو۔" اس کی بات کے جواب میں حسن صاحب نے قطعیت سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور اگلے تین دنوں میں حسن صاحب اس کے انتہائی کٹھن حالات سے واقفیت حاصل کرچکے تھے اور فرح بیگم کے علاج معالجے کا خرچ اٹھا رہے تھے۔ عفت ممانی نے تو ویسے ہی اپنی آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں، عامر ماموں کے مرنے کے بعد تو گویا انہوں نے قطع تعلق ہی کرلیا تھا۔ وہ اس حد تک سنگ دل ہوچکی تھیں کہ فرح بیگم اسپتال میں داخل قریب المرگ تھیں، اور انہوں نے فاریہ کو بے آسرا چھوڑ دیا تھا۔ ایسے میں فاریہ کو حسن صاحب کا بڑا آسرا تھا۔ شاید یہ قدرت کی طرف سے انتظام تھا۔ ورنہ فرح بیگم کے مرنے کے بعد فاریہ کہاں جاتی۔۔۔

اور پھر یہی ہوا۔ ڈاکٹرز کے "سوری" کہنے کے بعد فاریہ "خون۔۔۔ خون۔۔۔ جراثیم ۔۔۔ جراثیم" چلاتی شدید ہذیانی ہوگئی تھی۔

"میری ماما۔۔۔ میرے ماموں۔۔۔"

اس کی چیخیں حسن صاحب کا دل بند کیے دیتی تھیں۔ اس بے سہارا لڑکی کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے انہیں صرف ایک ہی صورت نظر آئی کہ وہ اسے اپنے گھر لے جائیں مگر جب "کس حیثیت سے؟" کا سوال پیدا ہوا تو انہوں نے اپنی انتہائی وفاشعار بیوی اور بے حد فرماں بردار بیٹے کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ جسے حسن صاحب کی ہی طرح دردمند دل رکھنے والوں نے قبول کیا اور یوں حسن صاحب کے بیٹے صارم اور فاریہ کا نکاح ہوگیا۔

صارم اپنے والد کے حکم پر صرف تین دن کے لیے پاکستان آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ دیکھیے! اس ڈھکن کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔

بند ہی نہیں ہو رہا۔" پریشر ککر کے ڈھکن سے دھینگا مشتی کرتی فاریہ نے صارم کو کچن میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

"ادھر لاؤ۔" صارم نے ڈھکن بند کرنے میں مشکل سے دس سیکنڈ کا وقت لیا۔

"تھینک یو سوچ! آپ نے اتنے آرام سے کرلیا۔ میں آدھے گھنٹے سے اسے بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔" لائٹ پرپل کلر کا اسٹائلش سا سوٹ پہنے وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"مائی پلیژر! ویسے کیا پکایا جا رہا ہے۔" صارم نے بڑے سے پتیلے میں ابلتی ہوئی دالوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"حلیم!" اس نے مسکرا کر بتایا۔ "صارم۔۔۔ ایک بات کل رات سے مجھے بہت پریشان کر رہی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے انکل مجھے نظر انداز کر رہے ہیں۔ ان تین ماہ میں انہوں ایک بار بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ حالانکہ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔" اس نے دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے دو سیب دھو کر صارم کی طرف بڑھائے۔

"فاریہ! تمہارے ساتھ بچپن میں کیا ہوا تھا؟" صارم نے بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔ فاریہ بری طرح چونکی۔ ایسا غیر متوقع سوال۔۔۔ وہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹی۔

"فاریہ۔۔۔ آج تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی۔"

"آپ جائیں یہاں سے۔ مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں۔" فاریہ اٹک اٹک کر بولی۔ صارم کے سامنے اپنے ماضی کے کھلنے کا ہولناک تصور اسے اندر تک لرزا گیا تھا۔

"اپنی ذات کی سچائی کو اون کرنا سیکھو۔ فاریہ! پریشانی سے بھاگ کر نہیں بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا ہی اصل جیت ہے۔ آج تمہیں مجھ پر اپنی ذات کا اسرار کھولنا ہی ہوگا فاریہ!" صارم پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔

تذلیل، اہانت اور بے عزتی جیسے الفاظ سے بھرا اس کا ماضی۔۔۔ وہ کیسے بتا پائے گی صارم کو۔

"یہ ہمارے رشتے کا بھی تقاضا ہے فاریہ!" اس نے فاریہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

بے بسی سے فاریہ کی آنکھیں بھرنے لگیں۔



"میں، میرے پاپا اور میری ماما۔۔۔ ڈھائی مرلے کے خوب صورت گھر میں بڑے اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ میرے پاپا ایک اسکول میں ٹیچنگ کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ شہر میں مرکزی شاہراہ پر ایک اچھی خاصی دکان تھی۔ جس کے کرائے اور پاپا کی تنخواہ سے بہت اچھا گزارا ہو جاتا تھا۔ میں میٹرک کر رہا تھا۔ جب میرے پاپا کی ایک ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔

پاپا کے بعد زندگی بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ ان کی موت کے بعد ماما کے لیے دکان کے کرائے اور پاپا کی قلیل سی پنشن میں گھر کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ان مشکل دنوں میں میرے ایک دوست نے مجھے پیٹرول پمپ پر کام کرنے کا مشورہ دیا تو ماما نے سختی سے منع کر دیا۔ گردن میں ہونے والی شدید تکلیف کو نظر انداز کیے اپنی بے ترتیب ہوتی شخصیت سے بے خبر میری ماما نے دن رات لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے میری پڑھائی کا خرچ اٹھایا۔

ہارٹ اسپیشلسٹ بننا میرا اولین خواب تھا۔ پری میڈیکل کی ٹف پڑھائی اور ماما کی سخت مشقت میرے لیے واقعی بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ میں پڑھائی وڑھائی چھوڑ کر کسی فیکٹری میں چھوٹی موٹی ملازمت کرلوں۔ لیکن میرا یہ کہنا ماما کی آنکھوں کو آنسو دے جاتا تھا اور میں ان پانچ، سات سالوں کے چٹکی بجاتے گزرنے کی دعا کرتا اور پھر زور و شور سے پڑھائی میں مصروف ہو جاتا تھا۔

ایف ایس سی میں میری ٹائنٹی سکس پرسنٹ ایج نے مجھے آسمان کی بلندیوں پر لا کھڑا کیا۔ میں انٹری ٹیسٹ دینے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب میرے دوست روحیل نے مجھ سے کہا کہ اس کے انکل لائق فائق طالب علموں کو اسکالر شپ پر پڑھنے کے لیے انگلینڈ بھجوا رہے ہیں۔ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ جاب بھی کر سکتا ہوں اور میرا ڈاکٹر بننے کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔ گھر کے حالات بھی بہتر ہو جائیں گے۔ ان خوش آئند سوچوں نے مجھے میری ماما کے مقابل لا کھڑا کیا۔ بڑی مشکل سے اپنی جان دینے کی دھمکی دے کر میں نے ماما کو مجبور کیا کہ وہ دکان بیچ دیں۔ مین بازار میں ہونے کی وجہ سے دکان اچھے داموں بک گئی۔ اچھے دنوں کی امید لیے میں نے دس لاکھ روپے روحیل کو دے دیے اور بچ جانے والے پانچ لاکھ ماما کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے لیکن میری ساری تدبیریں الٹی ہو گئیں۔ روحیل نے مجھے دھوکا دیا۔ وہ میری آستین کا سانپ تھا۔ میرے دیے ہوئے پیسوں سے وہ اپنے خوابوں کی جنت تعمیر کرنے دبئی بھاگ گیا۔ ایسے میں ایک طرف ماما کا نچڑا ہوا سفید چہرہ مجھے بے تحاشا شرمندہ کر دیتا۔ وہیں مستقبل ایک سوالیہ نشان کی طرح ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ناچتا رہتا تھا۔ وہ بہت مشکل وقت تھا۔ اتنا کہ دوسرا سانس لینے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کیسا بیٹا تھا میں کہ اپنی ماں کی زندگی کو سہل بنانے کے بجائے اذیت ناک بنا بیٹھا تھا۔ بے عزتی اور شرمندگی کا گہرا احساس ہر وقت میرا احاطہ کیے رکھتا اور پھر یہی احساس ایک اذیت ناک ڈپریشن میں بدل گیا۔ پورے چھ ماہ میری ماما میرے علاج کے لیے اسپتالوں میں دھکے کھاتی رہیں۔ وہیں اسپتال میں میری ملاقات حسن صاحب سے ہوئی۔ اگر وہ مجھے نہ ملتے تو شاید میں کبھی اس اذیت ناک تکلیف سے باہر نہ نکل پاتا۔ انہوں نے مجھے زندگی کی سچائیوں اور کٹھنائیوں کو فیس کرنے کا گر سمجھایا۔ مجھے بتایا کہ زندگی ہمارے طے کردہ فارمولے کے حساب سے نہیں چلتی۔ ہمارا کام صرف جدوجہد کرنا ہے۔ نتیجہ اللہ کی ذات پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ ہمارے بہت بڑے محسن ہیں۔ نہ صرف میری ذہنی کیفیت کو نارمل کرنے میں، بلکہ ہمارے تیزی سے ختم ہوتے سرمائے کے ساتھ انہوں نے کپڑے کا کاروبار شروع کیا۔ اپنا طے شدہ منافع لینے کے علاوہ انہوں نے کبھی ایک پائی کی بھی ہیرا پھیری نہیں کی۔ اپنی محنت اور صلاحیت سے فقط دو سال کے قلیل عرصے میں انہوں نے ہمارا سرمایہ تین گنا بڑھا دیا تھا۔

ان کے مشورے پر میں نے دوبارہ انٹری ٹیسٹ دیا اور میڈیکل کالج جوائن کرلیا۔ حسن صاحب سے میرا لگاؤ اتنا بڑھا کہ میری خواہش اور اصرار پر میری ماما نے حسن صاحب سے نکاح کرلیا۔ مجھ بن باپ کے بچے پر انہوں نے اپنی ساری شفقت نچھاور کر دی۔ میں تو اپنی اسٹڈیز میں بزی رہا اور انہوں نے چھوٹے سے کاروبار کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور پھر ان کی خواہش پر میں نے نفسیات جیسے حساس شعبے میں اسپیشلائزیشن کیا اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔

تم بتاؤ۔۔۔ بے عزتی، شرمندگی، دکھ، تذلیل اور تکلیف کا کون سا ایسا رنگ ہے جو میں نے نہیں دیکھا۔ ہمارے رشتے میں سچائی بہت اہم ہے لیکن شاید میں تمہارا اعتماد جیت نہیں پایا۔" صارم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اس میں پانی ختم ہو گیا ہے۔ ایک آدھ منٹ کی دیر اور ہو جاتی تو گوشت جل جاتا۔" گہری سنجیدگی سے اپنے ماضی میں جھانکتے ہوئے ہوئے صارم نے یکایک ابلتی ہوئی دالوں پر توجہ دی اور چولہا بند کر دیا۔ فاریہ عجیب سی کیفیت میں کھڑی تھی۔

"وہ مم۔۔۔ میں۔۔۔" شرمندہ سی فاریہ کے کچھ کہنے کی کوشش میں ہونٹ کپکپا گئے۔

"فاریہ! تم صبح سے کچن میں ہو۔ تھک گئی ہو نا۔ ہٹو! باقی کا کام میں دیکھ لوں۔"

ثمینہ بیگم کے کچن میں آنے سے فاریہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ اپنے بے جان ہوتے ہوئے ہاتھوں کے باعث چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر پائی۔

"آپ کا ماضی قابل شرم ہوتا تو پوچھتی۔۔۔ کیسے

بتاتے ہیں آپ۔" اس کے تلخ سوال پر صارم نے بغیر کسی جھجک کے اپنا آپ کھول کر رکھ دیا تھا اس پر۔۔۔ اور ثمینہ بیگم کے آنے کے بعد اسے شرمندہ سا وہیں چھوڑ کر کچن سے جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ اتنے بڑے اسپتال میں نفسیاتی امراض کے ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ بننا کوئی معمولی بات نہیں۔"

"مبارک ہو بیٹا! اللہ کا بہت بہت شکر ہے کہ تمہیں اتنی بڑی کامیابی ملی۔"

حسن صاحب اور ثمینہ بیگم کی پرجوش اور فخر سے بھرپور آوازیں فاریہ کو لاؤنج میں کھینچ لائیں۔ جہاں کھڑے تینوں نفوس کے چہرے خوشی کے گہرے احساس کے زیر اثر جگمگا رہے تھے۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہی ممکن ہوا ہے پاپا! اگر آپ میرا ساتھ نہ دیتے۔ ہمیں سہارا نہ دیتے تو کامیابی کا لفظ میرے لیے محض ایک خواب ہوتا۔" سچائی اور احسان مندی کے جذبات سے صارم کا لہجہ حقیقتاً" بھاری ہو گیا۔

"صارم اب اپنی زندگی میں مکمل طور پر سیٹل ہو چکا ہے۔ فاریہ کی طبیعت بھی بہتر ہے اور اب مجھے کوئی بہانہ نہیں سننا۔ میرے خیال میں اگلے اتوار کو باقاعدہ ایک تقریب منعقد کر لی جائے۔ چلو صارم! تم فاریہ کو لے کر بازار جاؤ۔ شادی کا ڈریس پسند کرو اور ساتھ ہی کارڈز بھی پرنٹنگ کے لیے دے آنا۔" فاریہ کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ صارم کی کامیابی بھول کر ان دونوں کی شادی کا موضوع لے بیٹھیں۔

فاریہ نے گڑبڑا کر حسن صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے۔ لیکن خوشی ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"چلیں فاریہ!" گاڑی کی چابی ہاتھ میں پکڑے مسرور سا صارم نہ جانے کب اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوا۔

ایک ٹھنڈی سانس یخ بستہ ماحول کے حوالے کر کے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میرے پاپا مجھے اور میری ماما کو بے یارومددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں ایک ایسے بزدل آدمی کی بیٹی ہوں، جس نے اپنی ذمہ داری اٹھانے کے بجائے زندگی کے خاردار راستے پر اپنی بیوی اور بیٹی کو در در بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ یقین کریں صارم! میں اپنے باپ سے اتنی نفرت کرتی ہوں کہ اگر کبھی وہ ظالم شخص میرے سامنے آگیا تو میں اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دوں گی۔" ادب و آداب کا خیال رکھنے والی فاریہ کا بے ادب لہجہ اس کا اپنے باپ سے نفرت کی انتہا کو ظاہر کر رہا تھا۔

"میں بہت چھوٹی تھی، جب پاپا۔۔۔" اتنی ساری کتھا صارم کو سنا چکنے کے بعد اس کے لب تو خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن خوب صورت سیاہ آنکھیں مسلسل موتی برسا رہی تھیں۔ گاڑی ہلکے سے جھٹکے سے ایک خوب صورت ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی۔

"ماما کی وفات کے بعد تو جیسے ہیپاٹائٹس کے جرمز کے ساتھ ساتھ مجھے ہر طرح کے جرمز تنگ کرنے لگے۔ قریب تھا کہ میں اس خوف سے مر جاتی۔ یقیناً" میں سروائیو نہ کرپاتی، اگر کچھ اور عرصہ میری یہی کیفیت رہتی، لیکن پھر آپ میری زندگی میں کسی مسیحا کی طرح آئے اور میری ہر وقت کی گھبراہٹ ختم ہو گئی۔ آپ میرے محسن ہیں صارم! مگر مجھے لگتا تھا، ذلت و غربت سے بھرا میرا ماضی جاننے کے بعد کہیں آپ مجھے چھوڑ نہ دیں۔ بس اسی ڈر سے میں آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کرتی تھی مگر میں اب مزید آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔"

ریسٹورنٹ کے نرم گرم سے ماحول میں وہ سادگی و روانی میں اپنی دل کی بات بھی کہہ گئی۔ صارم ہولے

سے مسکرا دیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے فاریہ! میں تمہارے پاپا کے بارے میں پہلے سے نہیں جانتا تھا؟" آرام سے کہی گئی صارم کی بات پر فاریہ کی آنکھیں پھیلی تھیں۔

"ایسی ڈراؤنی شکلیں بنا کر میری طرف نہ دیکھو۔ تمہارے حسن انکل میرے پاپا ہیں مگر میرے نزدیک یہ ساری باتیں بے معنی ہیں فاریہ! اگر کچھ معنی رکھتا ہے تو وہ صرف تم ہو اور ہمارا رشتہ۔ تمہارا ماضی کریدنا میری مجبوری تھی۔ نفسیاتی امراض کی جڑیں ہمیشہ ماضی سے جڑی ہوتی ہیں۔ مجھے تمہارے خوف کی اصل وجہ ڈھونڈنی تھی اور تمہارے خوف کی اصل وجہ خون ہے۔ یہ بات مجھے پاپا نہیں بتا پائے تھے۔ ویسے بھی وہ نہیں جانتے تھے کہ تمہیں نفسیاتی پرابلم ہے۔"

"تمہیں پتا ہے فاریہ! جب پاپا نے مجھے فون کیا اور کہا کہ میں تم سے نکاح کرلوں تو مجھے بہت عجیب اور کچھ حد تک برا بھی لگا تھا لیکن نہ جانے نکاح کے بولوں میں کیا جادو تھا کہ میں کسی مقناطیسی کشش کے زیر اثر تمہاری طرف کھنچتا چلا آیا۔ تم شاید نہیں جانتیں فاریہ! کہ تمہاری تکلیف اور اذیت مجھے کس کرب سے دوچار کرتی تھی۔ یہ بیماری ختم ہونے میں وقت لیتی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود میں نے انتہائی صبر سے تمہارے نارمل ہونے کا انتظار کیا ہے۔ علاج کے ساتھ دعائیں بھی مانگیں۔ تمہارے لیے میری فکرمندی، تمہیں نارمل کرنے کے لیے میری کوششیں، میرا خلوص، احسان نہیں تھا، محبت تھی۔ بے لوث، پرخلوص اور انتہائی شدید محبت جو صارم سکندر کو فاریہ احمد سے ہے۔ ہاں فاریہ! میں تم سے۔۔۔ اپنی شریک حیات سے، بہت محبت کرتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟"

صارم نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔ وہ فوراً" سے پیشتر ہاں کرنا چاہتی تھی مگر حیا اور جھجک آڑے آگئی۔ صارم نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر اس کی پریشانی کا خیال کر کے خاموش رہا اور کافی پی کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھ جاؤ فاریہ!"

وہ صارم کے سوال میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ ریسٹورنٹ سے باہر آکر صارم گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور فاریہ بیٹھنا بھول گئی۔ اس کے لہجے پر وہ چونکی اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کا دل بہت خوش تھا۔ دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرنے کے لیے کھینچا مگر اس کا نرم و نازک سا ہاتھ گاڑی کے دروازے میں دب گیا۔ سی کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی آنکھیں بھر آئیں، ساتھ ہی دہشت بھی عود کر آئی۔

"خون۔۔۔ خون صارم!" فاریہ کا گلابیاں گھلا سنہرا اور سفید رنگ اپنی انگلی پر بوند برابر خون دیکھ کر زردی کی انتہاؤں کو چھونے لگا۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ جبکہ اس کا زخمی ہاتھ صارم کے مضبوط ہاتھوں میں دبا تھا۔ اس طرح فاریہ کی انگلی پر موجود خون کی وہ تھوڑی سی مقدار ویسی کی ویسی ہی تھی۔

"ریلیکس فاریہ! تمہیں اپنے خوف کا سامنا کرنا ہوگا۔ اپنے خوف کو نکال دو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" فاریہ نے بند آنکھوں سے نفی میں سر ہلایا۔

"میری طرف دیکھو فاریہ! اگر مجھ پر یقین ہے تو آنکھیں کھولو۔" نرمی سے کہتے ہوئے صارم نے اس کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔

"گڈ۔۔۔ اب سوچو اس وقت کون سی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔"

"یہ جراثیم مجھ میں منتقل ہو رہے ہیں صارم!" فاریہ نے روتے ہوئے گھٹی آواز میں جواب دیا۔ یک ٹک دیکھتے ہوئے وہ خوف کی شدت سے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"اچھا۔۔۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت تمہارے ذہن میں کیا امیج بن رہا ہے۔ یعنی اگر تمہاری سوچ ثابت ہو گئی تو کیا ہوگا۔" صارم نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"مم۔۔۔ میں اسپتال میں ہوں۔ خون کی الٹیاں کر رہی ہوں۔ مجھے کوئی بیڈ نہیں ملا۔ میں مر گئی ہوں۔ سب مجھ پر مٹی ڈال رہے ہیں اور اب۔۔۔ اب مجھے

سانس نہیں آرہا صارم! میں... اسے صاف کردیں صارم! ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔" فاریہ نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا۔ جس پر خون کی ننھی سی بوند موجود تھی۔

"دیکھو فاریہ! نارمل انسان اپنی خوفناک سوچوں کو نظرانداز کردیا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ حقیقت اور سوچ میں فرق کرسکتے ہیں۔ تمہیں بھی اپنے خیالات اور حقیقت کی دنیا میں فرق کرنا ہے اور یہ سب کچھ کیسے کرنا ہے، میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ایسا کرو اپنی آنکھیں بند کرو اور تین گہری سانسیں لو۔ اب تصور کرو کہ تمہارے ذہن میں ان بھیانک خیالات کی ٹرین چل رہی ہے۔ ایک کے بعد ایک برا اور اذیت ناک خیال اس ٹرین میں سوار ہوتا جارہا ہے۔ تم اس ٹرین کے نیچے دبی ہوئی ہو۔ یہ ٹرین تمہیں کچل رہی ہے... اب تم اٹھو اور کھڑی ہو اور اس ٹرین سے کچھ فاصلے پر جاکر کھڑی ہوجاؤ... کیا تم ایسا کرپا رہی ہو؟" صارم نے نرمی سے پوچھا۔ فاریہ نے آنکھیں میچے میچے سر ہلایا۔

"ٹھیک۔ اب اس ٹرین کو غور سے دیکھو۔ تم اس کے شکنجے سے نکل آئی ہو۔ یہ تمہارے اوبسیشن (وہم) ہیں۔ ان کو گزر جانے دو۔ اب آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو۔ گڈ! اب کیسا محسوس کررہی ہو؟"

فاریہ کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے جیسے خوف کے تاثرات نہیں تھے۔

"جب وہم ذہن میں سماجائے تو تصور میں اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ خوف بھی دراصل ایک تصور ہے۔ جو گھیرتا ہے تو چھوڑ بھی دیتا ہے۔ بس کوشش ضروری ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا فاریہ! میری بات؟"

صائم نے بہت پیار سے پوچھا اور ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھایا۔ "لو صاف کرو۔" صارم کو لگا جیسے فاریہ نے ایک لمحے کو سانس روکی ہو، مگر بہرحال اس نے خون صاف کرکے ٹشو پیپر پھینک دیا۔



"واؤ!" اپنے کمرے کی لائٹس آن کرتے ہی صارم کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

پورے کمرے کی دیواروں پر بڑے چھوٹے لاتعداد شیشے چپکے ہوئے تھے جو کمرے میں موجود دو بلبوں کی پاور دس گنا بڑھا چکے تھے۔ جھلملاتے ہوئے شیشوں سے منعکس ہوتی روشنی رقص کرتے ہوئے ستاروں کی طرح پورے کمرے میں گردش کررہی تھی۔ دروازے کے عین سامنے موجود دیوار پر سلور گلیٹر سے بھرا ہوا ایک پیپر چپکا ہوا تھا اور اس دیوار کے ساتھ رکھی میز کو بھی ڈھیر سارے سلور گلیٹر سے بھر دیا گیا تھا۔ غضب کی جھلملاہٹ نے کمرے کے اس کونے کو بڑی اچھی طرح نمایاں کیا گیا تھا۔ ٹیبل پر جابجا جلتی ہوئی موم بتیاں اور ان کے درمیان چاکلیٹ کیک پر کریم سے "کانگریچولیشن" لکھا ہوا تھا۔ صارم حیران سا آہستہ آہستہ چلتا ہوا ٹیبل کے قریب پہنچا تو جہاں ماحول کی خوب صورتی اور واضح ہوئی وہیں میز پر رکھے ایک خوب صورت سے کارڈ نے اس کی توجہ کھینچی۔ کارڈ کھولتے ہی مسحور کن خوشبو کا ایک جھونکا اس کی حس شامہ سے ٹکرایا۔ اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کارڈ کھولا۔

تو ملا ہے تو یہ احساس ہوا ہے مجھ کو
یہ میری عمر محبت کے لیے تھوڑی ہے
ایک ذرا سا غم دوراں کا بھی حق ہے جس پر
میں نے وہ سانس بھی تیرے لیے رکھ چھوڑی ہے
تجھ پہ ہوجاؤں گی قربان، تجھے چاہوں گی
میں تو مر کر بھی میری جان تجھے چاہوں گی

آپ کی اپنی
مسز صارم

محبت کا یہ خوب صورت اظہار اسے سرشار کرگیا۔ صارم نے مسکراتے ہوئے کارڈ نیچے کیا تو دائیں جانب کھڑی فاریہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ شاکنگ پنک اور سلور امتزاج پر مشتمل انارکلی فراک پہنے اپنے کرلڈ بالوں کو ایک کندھے پر ڈالے وہ اسٹائلش سی لڑکی فاریہ ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

"اتنے حسین سرپرائز کے لیے شکریہ لیکن یہ مبارک بادی کس لیے؟"

"اس دن آنٹی اور انکل نے آپ کو اسپتال بنانے پر مبارک بادی تھی لیکن میں نہیں دے پائی تھی تو اس لیے..." فاریہ کی اٹھتی گرتی گھنی پلکیں اور گلابی رنگ سے رنگے یاقوتی ہونٹ اس کی خوب صورتی میں اضافہ کررہے تھے۔

"تو پھر ماما اور پاپا کی طرح وش کرونا۔" صارم شوخ ہوا۔ فاریہ نے مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ڈالا اور بھاگنے ہی لگی تھی کہ صارم نے بڑے بڑے دو قدم اٹھا کر اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا مگر اس کوشش میں اس کا پاؤں بری طرح ٹیبل سے ٹکرایا تھا۔ اس کی ہلکی سی کراہ پر فاریہ تڑپ گئی۔

"اور کریں الٹی سیدھی حرکتیں، حد ہے۔" وہ اسے ڈپٹتے ہوئے یکدم نیچے بیٹھ کر اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ چکی تھی۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرکے فاریہ نے ٹشو پیپر اٹھانے کا بھی تکلف نہیں کیا اور اپنے دوپٹے سے ہی اس کی انگلی سے نکلتا ہوا خون صاف کردیا۔ اس کے چہرے پر صارم کو چوٹ لگ جانے پر ملال تھا۔ کسی خوف کا کوئی شائبہ ہرگز نہیں تھا۔

صارم مطمئن سا اسے اپنی خون آلود انگلی کی رومانوی سی ٹریٹمنٹ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ "فاریہ صحت یاب ہوچکی ہے۔" اس نے گہری سانس بھر کر کرسی کی پشت پہ سر ٹکا دیا۔ دل کو ہر طرح سے قرار تھا۔



"تمہیں پتا ہے نا کہ وہ اپنے باپ سے کتنی نفرت کرتی ہے۔ کیسے بتاؤں اسے کہ اس کی در، در بھٹکتی زندگی کا ذمہ دار اس کا بدنصیب باپ میں ہوں۔ اسپتال میں وہ اپنے باپ کو کوستی رہی اور میں خون کے آنسو پیتا سنتا رہا۔ میری بے بسی کا اندازہ لگاسکتی ہو تم ثمینہ!" کتنا دل تھا میرا کہ فرح کا علاج کسی اچھے اسپتال میں ہو اور فاریہ میری بیٹی... پورے استحقاق سے اپنے باپ کے پیسے کو استعمال کرسکے لیکن خوف... کہ وہ یہ جانتے ہی میرے منہ پر تھوک دے گی اور میں اسے دیکھنے سے بھی محروم ہوجاؤں گا۔ یہ خوف مجھے ہمیشہ سچ بولنے سے روکتا رہا...

اسے چھونے کو، گلے لگانے کو اس کے منہ سے بابا جیسا میٹھا لفظ سننے کو میرا دل مچلتا رہتا ہے۔ اسی تڑپ کو چھپانے کے لیے میں اس سے بات تک نہیں کرتا کہ کہیں جوش، جذبات میں میرا راز اس پر عیاں نہ ہوجائے۔ کتنا بدنصیب باپ ہوں میں، جو بجائے اس کے کہ اپنی بیٹی کو اپنے زندہ ہونے کا مان دوں۔ اس سے اپنی شناخت چھپائے پھرتا ہوں۔

اپنے کمرے میں ثمینہ بیگم سے بات کرتے ہوئے حسن صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور ان کے لیے چائے لے کر آئی فاریہ کے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے ٹرے کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ اس بھیانک انکشاف پر چائے کی ٹرے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پوری قوت سے زمین سے ٹکرائی تھی۔ گرم گرم چائے نے اس کے پاؤں کو جلادیا۔ ثمینہ بیگم اور حسن صاحب چونک کر دروازے کی طرف لپکے۔ حیران اور گم صم کھڑی فاریہ یک ٹک اپنے جلے ہوئے پاؤں اور ٹوٹے ہوئے کپ کی کرچیوں کو گھور رہی تھی۔ حسن صاحب پر سلگتی ایک نظر ڈال کر وہ ان کرچیوں کی پروا کیے بغیر تیزی سے بھاگی۔

"مجھے طلاق چاہیے۔ مجھے آپ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں جوڑنا۔"

دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دبائے ہوئے فاریہ نے اپنی بات بڑی مشکل سے پوری کی تھی کہ اس تقاضے کے پورا ہونے کے بعد شاید اس کی سانس نے بھی بند ہوجانا تھا لیکن دل پر لگنے والی چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ خود اذیتی کی انتہا پر پہنچ گئی۔

"کیا کہہ رہی ہو فاریہ... اور یہ تمہارا پاؤں... کیا ہوا؟" لاؤنج میں ٹی وی دیکھتا صارم اس اچانک افتاد پر ہڑبڑا اٹھا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے فاریہ کے جلے ہوئے زخمی پاؤں کو دیکھ لیا تھا۔

... آپ کی سچائی ... آپ کو پتا تھا کہ حسن انکل میرے پاپا ہے، پھر آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھے اپنی زندگی کی بدترین تکلیفوں کی وجہ بننے والے انسان کے گھر میں اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ ایک پل بھی نہیں۔“ فاریہ نے تقریباً ”چیختے ہوئے کہا۔

”فاریہ! ایسا نہیں ہے۔ پاپا نے مجھے روکا تھا۔ وہ تمہیں خود بتانا چاہ رہے تھے یہ بات۔ میں نے صرف ان کا کہنا مانا ہے فاریہ اور ویسے بھی جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، اس میں حسن انکل کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اصل میں...“

صارم نے فاریہ کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے صوفے پر بٹھایا۔ ثمینہ بیگم آگے بڑھیں۔

”تمہارے پاپا نے خودکشی کرنے کے لیے گھر چھوڑا تھا۔ انہوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی فاریہ!“ ثمینہ بیگم نے تاسف سے حسن صاحب کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھا۔

”وہاں پر موجود افراد نے جس وقت انہیں اسپتال پہنچایا۔ ان کی ذہنی اور جسمانی حالت انتہائی مخدوش ہو چکی تھی۔ ایک سال... پورا ایک سال حسن صاحب ہوش و حواس سے بیگانہ رہے۔ کاروبار میں ملے دھوکے نے ان کی ذہنی حالت کو تباہ کرکے انہیں انتہائی شکی بنا دیا تھا۔ ان دنوں انہیں ہر انسان پر یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ ان کو دھوکا دے کر ان کا مال سمیٹ کر چلا جائے گا۔ ایک سال بعد جب ان کی ذہنی حالت قدرے بہتر ہوئی تو انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن تمہارے ماموں تم دونوں کو لے کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے کہ بے حد تلاش و بسیار کے باوجود بھی حسن صاحب تمہیں ڈھونڈ نہ پائے۔ انہیں اسی اسپتال میں باورچی کی نوکری مل گئی۔ ان ہی دنوں صارم ڈپریشن کا شکار رہا۔ میں بہت پریشان تھی۔ حسن صاحب کی توجہ اور شفقت اسے نارمل زندگی کی طرف کھینچ لائی اور پھر صارم کے مجبور کرنے پر حسن صاحب نے مجھ سے نکاح کر لیا۔ لیکن ان تیرہ چودہ سالوں میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب انہوں نے تمہیں یاد نہ کیا ہو۔ میں تمہیں ان کی میڈیکل ہسٹری دکھاؤں گی۔ تم سمجھ دار ہو۔ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہو، لیکن حقائق کو نظر انداز مت کرنا بیٹا۔“ ثمینہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”بیٹا! تم حسن صاحب کی اکلوتی اولاد ہو۔ وہ تمہیں اپنے گلے لگانے کے لیے بن جل مچھلی طرح تڑپتے رہے تھے۔ انہیں اس قصور کی سزا نہ دو جو انہوں نے نہیں کیا۔ انہیں معاف کر دو بیٹا! ان کی سالوں کی بے سکونی کو سکون مل جائے گا۔“ ثمینہ بیگم نے فاریہ کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے کہا۔ جس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر ان کے ہاتھوں پر گرے، جو اس بات کا ثبوت تھے کہ آج ایک باپ کو اپنی کھوئی ہوئی لاڈلی بیٹی واپس مل گئی ہے۔ صارم کے چہرے پر بھی سکون اتر آیا۔ اس نے ایک نظر صوفے پر بالکل ساکت بیٹھے حسن صاحب کو دیکھا۔ ان کے گالوں پر بہتے آنسو ان کے زندہ ہونے کے گواہ تھے۔ ورنہ وہ یوں بیٹھے تھے جیسے جم چکے ہوں۔

”فاریہ بیٹا اٹھو۔“ انہوں نے فاریہ کو اشارہ کیا۔

”مجھے معاف کر دیں پاپا... میں آپ کو غلط سمجھتی رہی، میں...“ فاریہ نے روتے ہوئے ان کے گھٹنے پکڑے۔ حسن صاحب تڑپ کر سیدھے ہوئے اور اسے سینے میں بھینچ لیا۔

”نہیں میرے بچے... میں نے تمہارے ساتھ، تمہاری ماں کے ساتھ واقعی بہت غلط کیا۔ میں اللہ کی مرضی پر اپنے آپ کو رضامند نہ کر سکا۔ میں سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ اللہ کی مرضی کو تسلیم نہ کرنے والے، اپنے حالات کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل نہ کرنے والے لوگ اپنا وجود، اپنا وقار، اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ مایوسی گناہ ہے اور کیوں گناہ ہے۔ ان گزرے ہوئے سالوں نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔

دیکھو بیٹا! آج میرے پاس دولت، جائیداد سب کچھ ہے، جن کے بارے میں میرا گمان تھا کہ اس کے بغیر میری ذات ادھوری ہے۔ لیکن دیکھو میں پھر بھی ادھورا ہوں۔ باپ اپنی بیٹیوں کے گھر بساتے ہیں اور میں کیسا بدنصیب باپ ہوں جس کی وجہ سے اس کی بیٹی کا گھر ٹوٹ رہا ہے۔“ وہ تڑپ کر رو لے۔ فاریہ نے آگے بڑھ کر ان کے آنسو صاف کیے۔

”میری شادی میں پندرہ دن رہ گئے ہیں پاپا... اور آپ کو پتا ہے نا بیٹی کی شادی میں باپ کی موجودگی کتنی اہم ہوتی ہے۔“

فاریہ کی عام سی بات میں بہت معنی پوشیدہ تھے۔ جہاں حسن صاحب کی بے ترتیب دھڑکنوں کو قرار ملا، وہیں پاس کھڑے صارم کے سینے سے بھی اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔



بھاری لہنگے اور اسٹائلش سی جیولری نے فاریہ کو جہاں جنت سے اتری ہوئی حور بنا دیا تھا وہیں آف وائٹ نفیس گولڈن کڑھائی والی شیروانی نے صارم کی خوب صورتی میں ڈھیر سارا اضافہ کر دیا تھا۔ سر پر گولڈن اور کاپر شیڈ کا کلاہ جمائے کسی وجیہہ شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

کمرے کی دیواروں پر اور چھت پر جا بجا اصلی سرخ گلاب چپکائے گئے تھے۔ ایسے کہ چھت کا بال برابر حصہ بھی خالی نہیں تھا۔ فرش پر گلاب کی پتیوں کے ڈھیر نے فرش کو بالکل چھپا دیا۔ جہازی سائز گولڈن بیڈ کے چاروں اطراف بیلے کی کلیوں سے گھری مسہری نے کمرے کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ گلاب کے پھولوں اور کلیوں کی مہک نے کمرے کے ماحول پر جیسے جادو کر دیا تھا۔ کلاہ اتار کر اس نے بیڈ پر بیٹھی فاریہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے کھڑا کیا اور ٹیرس کی طرف چلا۔ فاریہ نا سمجھی کے ساتھ بس اس کی بات مانتی گئی۔

"آنکھیں بند کرو۔" فاریہ نے اچھے بچوں کی طرح کہنا مان لیا۔

"اب کھولو۔" اس کی آنکھیں کھولتے ہی وہ بولا۔ "کانگریچولیشن۔"

صارم نے نہ جانے کون سا بٹن دبایا تھا کہ پورا ماحول یکدم ننھے ننھے بلبوں سے روشن ہوگیا۔ ٹیرس کی چھت میں ٹنگے ڈھیروں بلب سورج کی روشنی کو مات دے رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے ٹیبل پر ڈھیر سارا گولڈن گلٹر گرا کر اسے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس پر ریڈ کلر کی ٹرے میں سفید رس گلوں سے کانگریچولیشن کے الفاظ لکھے گئے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی فاریہ نے صارم کو ایسے ہی مبارک باد دی تھی۔

"تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں یہ سرپرائز کیوں دیا ہے؟"

"ہماری شادی کے لیے۔" فاریہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا تو اس کے شعاعیں لٹاتے روپ کا احاطہ کیے خوب صورت دوپٹے کے موتی بھی ہولے ہولے ہلنے لگے۔

"بالکل نہیں۔" صارم نے دلچسپی سے اس کے دوپٹے پر ٹنگے سنہری موتیوں کا رقص دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر۔" فاریہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، صارم نے ایک چمکتا ہوا بہت بڑا سا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

اپنے نغمات میں جذبات رچانے کے لیے
میں نے دھڑکن کی طرح دل میں بسایا ہے تجھے
میں تصور بھی جدائی کا بھلا کیسے کروں

اپنی قسمت کی لکیروں سے چرایا ہے تجھے
تجھ پہ ہوجاؤں گا قربان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی میری جان تجھے چاہوں گا

تمہارا شوہر نامدار
صارم سکندر

محبت کا یہ خوب صورت اظہار اسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا گیا۔

فاریہ جس کی پلکیں بار حیا سے اٹھ نہیں پا رہی تھیں۔ اس فائل نما کارڈ کو کھولتے ہی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پائی۔ صارم کے گلے جا لگی۔

"فرح احمد ٹرسٹ برائے امراض جگر۔"

"پاپا کی خواہش پر میں نے اپنا اسپتال تمہاری ماما کے نام پر رکھ دیا فاریہ! یہ میرے اور پاپا کی طرف سے تمہیں اور تمہاری ماما کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے، تمہیں یقیناً پسند آیا ہوگا۔"

فاریہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر تحفہ کیا ہوسکتا تھا۔



وہ ایک ہرا بھرا نخلستان تھا۔ سرسبز نرم گھاس نے مٹی کو ڈھانپا ہوا تھا۔ وہاں موجود ڈھیروں پھول ٹھنڈی ہوا کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ پانی کا نیلا چشمہ روانی سے بہہ رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ اس کے بالکل سامنے زمین سے آسمان تک ایک کمان کی شکل میں پھیلی ہوئی سات رنگوں سے سجی دھنک نے اس منظر کو خوب صورت ترین بنا دیا تھا۔ اس رنگین سیڑھی سے ماما نیچے اتر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ماموں بھی تھے۔ سفید چمکتے ہوئے لباس میں وہ دونوں بے حد مطمئن تھے۔ اب ماما اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ بازو پھیلائے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ اچانک تیز ہوائیں چلنا شروع ہوئیں۔ فاریہ نے گھبرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ لیکن تاحد نظر اڑتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرائی اور دوڑتی ہوئی فرح بیگم کے کھلے بازوؤں میں جا سمائی۔ ماما اسے پیار کر رہی تھیں۔ ماموں بھی مسکرا رہے تھے۔ سکون اور خوشی کے بے پایاں احساس سے سرشار ہو کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔





حیا بخاری



اس بار گرمیوں میں خدا نے خاص کرم کیا اور اگست کے اوائل اور جولائی کے آخری ایام جو خیبر پختونخواہ کے گرم ترین دنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ خاصے ٹھنڈے رہے۔ ایک دو دن اگر شدید گرمی پڑ جاتی تو تیسرے روز ہی گھر گھر کے آنے والے کالے بادل، دل کو بھاتی ٹھنڈی ہوائیں اور کبھی تیز تو کبھی مدھم پھواروں کی رِم جِھم، تن من کی ساری کوفت اڑا لے جاتی۔

آج بھی دن بہت خوش گوار تھا۔ نائلہ جھٹ پٹ سارا کام نپٹانے میں لگی رہی۔ اماں زہرہ اسے یوں تیزی سے ہاتھ چلاتا دیکھ کر مسکراتیں اور دل ہی دل میں اس کی ہدایت کے لیے بھی دعا گو ہوتیں۔ انہیں اچھی طرح اپنی بہو کی اس تیزی کا سبب پتا تھا۔

نائلہ کی شادی کو دو سال ہونے کو آئے تھے اور اماں زہرہ ان دو سالوں میں نائلہ کی ہر خوبی، خامی سے بالکل ایک ماں کی طرح آگاہ تھیں۔ اس کے گھر کے کام کاج کے علاوہ بس دو تین ہی دوسرے شوق تھے، مگر جنون کی حد تک۔

پہلا وہ مارننگ شوز کی دیوانی تھی۔ جب تک لائٹ نہ جاتی اس کا ٹی وی کے آگے سے اٹھنا محال تھا۔

دوسرا خواتین کے رسالوں میں اس کی جان تھی۔ رات کو ڈرامہ چھوڑ دیتی۔ مگر اپنے پسندیدہ ناولز ضرور پڑھتی۔ اماں کو اس کے ان دونوں شوق پہ اعتراض نہ تھا، مگر اس کا تیسرا جنون اماں زہرہ کے لیے نہ صرف

ناقابل قبول تھا بلکہ انہیں سخت ناپسند بھی تھا۔ نائلہ کو پڑوسیوں کی دیوار سے تانکا جھانکی کرنے اور ٹوہ لینے کی بہت بری عادت تھی۔ پہلے پہل تو اماں زہرہ نے اسے خوب سمجھانے کی کوشش کی، مگر انہیں نائلہ کے اس شوق پہ خاموش ہونا ہی پڑا۔ اب وہ صرف اس کی ہدایت کی دعا کر سکتی تھیں۔

نائلہ نے جلد ہی کام نبٹا لیے اور اماں کی توقع کے عین مطابق صحن کی دائیں دیوار کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی کرسی پہ پاؤں جما کے اس پار جھانکنے لگی۔ سامنے ہی سلیم صاحب بیگم کے ساتھ بحث کرتے نظر آئے۔ اس کے تراشیدہ ہونٹوں پہ بڑی ہی دلفریب مسکراہٹ ابھری۔

"میرے پاس نہیں ہیں پیسے تمہاری فضول خرچیوں کے لیے۔" ان کا لہجہ اتنا کڑک دار تھا کہ خود نائلہ بھی کانپ گئی۔

"میں آپ سے پیسے کب مانگ رہی ہوں۔ بس آپ ہمارے ساتھ چلے چلیے گا تاکہ لوگ بات نہ بنا سکیں کہ شیخ صاحب کے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے اور آپ نہ آسکے۔ آخر کو اتنے پرانے پڑوسی ہیں ہمارے اور پڑوسیوں کے حقوق کتنے زیادہ ہیں یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔" مسز سلیم کے لہجے میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا وہی ازلی اعتماد۔

"ہمم۔ ٹھیک ہے۔" سلیم صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تحفے تحائف کے لیے ایک پیسہ نہیں دوں گا۔" ان کی کنجوسی تو ساری کالونی میں مشہور تھی۔

"ہاں ہاں۔ نہ دیں۔ بس اگر وہاں کوئی تحائف کا پوچھے تو کہہ دیتا آپ کہ آپ نے ہی لیے ہیں۔ میں شام کو آپ کو تحائف کی تفصیل بھی بتا دوں گی۔"

مسز سلیم اطمینان سے کہتی اندر چلی گئیں۔ سلیم صاحب نے سرہلا کے باہر کی راہ لی تو نائلہ بھی مسکراتی نیچے اتر آئی۔ موبائل کے دن بھر کے پیکیج کے استعمال کے لیے اسے بہترین ٹاپک مل چکا تھا۔ جو بات مسز سلیم صرف اپنے اور اپنے شوہر تک محدود رکھنا چاہتی تھیں۔ اس نے زیادہ نہیں تو کالونی کی چند دوستوں تک تو لازمی پہنچانی تھی۔

☼ ☼ ☼

سب سے پہلے اس نے کالونی کی دوسری قطار میں تیسرے بنگلو میں رہنے والی عظمیٰ کو یہ بریکنگ نیوز رپورٹ کی اور پھر خوب چٹخارے لینے کے بعد جب فون رکھ کر واپس مڑی تو اماں زہرہ کو تنبیہی نظروں سے خود کو گھورتا دیکھ کر چونک گئی۔

"کیا ہے اماں پھر کیوں ایسے دیکھ رہی ہیں؟" وہ نظریں چرائی برآمدے میں پڑے جھولے میں جا بیٹھی۔ اماں اس کے سامنے پڑی کرسی پہ بیٹھ گئیں۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو نیکی جو بھی ہے۔" اماں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ خاموش رہی۔

"دیکھو بیٹا! اگر وہ اپنے شوہر کی عزت رکھ رہی ہے تو تمہیں کیا حق پہنچتا ہے اس کی یوں ہر ایک کے سامنے بے عزتی کرو۔" اماں زہرہ نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہر ایک کے سامنے کہاں کی اماں۔ صرف اپنی سہیلیوں کو تو ہی بتایا ہے میں نے۔" اس نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔

"اور ان سہیلیوں نے اپنی چند دوستوں کو بھی شاید یہ بات بتا دی ہو۔" اماں نے عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"میری سہیلیاں ایسی نہیں ہیں اماں۔" وہ تیزی سے بولی۔

"انسان اپنی دوستی سے پہچانا جاتا ہے بیٹا۔ جب تم ایسا کر سکتی ہو تو تمہاری دوست کیوں نہیں۔" اماں زہرہ نے اپنے تئیں اسے تازیانہ مارا تھا، مگر نائلہ ان کی بات سنتی تب نہ۔

دیوار کے پار سے شور ابھرا تھا اور وہ اس طرف دوڑ چکی تھی۔

اماں سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

آج شیخ صاحب کے بیٹے کا ولیمہ تھا اور حسب معمول مسز سلیم لباس اور زیورات میں ساری خواتین پہ سبقت لے گئی تھیں۔ محض چند کے علاوہ باقی تمام کالونی کی رہائشی خواتین کے منہ بنے ہوئے تھے، مگر خوش اخلاق سی مسز سلیم ہر کسی سے یوں مسکرا کر بات کرتیں کہ مزید دل جلا دیتیں۔

"دیکھو تو۔ کتنی صفائی سے جھوٹ بول رہی ہیں کپڑے شوہر نے دلائے۔ زیورات ساس جی نے خرید دیے۔ ارے یہ تو بھلا ہو نائلہ کا۔ جو ان کے گھر کے سارے معاملات سے واقف ہے۔ ورنہ ہم تو ان کی اس قدر خوش گوار زندگی کا سوچ سوچ کے ہی کڑھتے رہتے۔" نائلہ کی بہترین دوست سلمیٰ کا تو پارہ ہائی تھا۔

"ہاں یار! ٹھیک ہے بندہ سسرال کی عزت بچا کے رکھے، مگر دوستوں سے کیا چھپانا۔ اب مجھے دیکھو۔ اس وقت تک آرام نہیں آتا جب تک ساس نندوں کی ساری کارروائی تم لوگوں کے گوش گزار نہ کر لوں۔" یہ فیر تھری کی نجمہ تھی۔ جس کی نائلہ سے خوب نہیں تو اچھی ضرور بنتی تھی۔

"قسم سے یار۔ میں تو جو تم لوگوں کو بتا دیتی ہوں۔ وہ تو ان معاملات کا پاؤ بھی نہیں ہے۔ ورنہ بھوسیروں کے حساب سے باتیں ہوتی ہیں میرے پاس۔ مگر کیا کروں اکیلی جان اور یہ اتنا بڑا گھر۔" نائلہ نے ہاتھوں کو جہاں تک ممکن تھا پھیلاتے ہوئے پہلی مرتبہ ان کی بات چیت میں حصہ لیا۔

"ان کے گھر تو روز نیا فساد، نئی لڑائی۔ مسز سلیم تو خود ساس کو وہ کھری کھری سناتی ہیں کہ اللہ معاف کرے۔" اس نے باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اور دیکھو تو سلیم صاحب کی کتنی تعریفیں کرتی ہیں، مگر خدا کی قسم ذرا جو وہ ان کا لحاظ کرتے ہیں۔ صبح کے نکلے رات گئے واپس آتے ہیں۔ مجھے تو عورتوں وورتوں کا چکر لگتا ہے۔" نائلہ نے سرگوشی کی۔

"پھر بھی ایک بات تو ماننی پڑے گی یار! مسز سلیم اپنے گھر والوں سے ہیں بہت مخلص۔ بہت پیار کرتی ہیں وہ اپنی فیملی سے۔" یہ شیخ صاحب کی منجھلی صاحبزادی کرن تھی۔ نائلہ کی باتوں کی ایک اور دیوانی۔

"ہاں۔ یکطرفہ پیار۔ وہ بھی ساری فیملی سے۔" نائلہ نے مذاقاً قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اس کی سب دوستوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی پر مارننگ شو آرہا تھا۔ اینکر کی چیختی آواز، مہمانوں کی بے لگام ہنسی اور مہمانوں کی تالیاں اور بے ہنگم شور سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ اماں زہرہ نے قرآن مجید پہ بھرپور توجہ مرکوز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر اتنے زیادہ شور سے ان کا ارتکاز بالآخر ٹوٹ ہی جاتا۔ انہوں نے لاحول پڑھتے ہوئے تلاوت چھوڑ دی۔ اور قرآن پاک الماری میں رکھ کر لاؤنج میں چلی آئیں۔ جہاں نائلہ مزے سے مونگ پھلی کھاتی کان پھاڑتے شور سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"نائلہ۔ بیٹا آواز نیچی رکھو۔ کیا سارے محلے کو آواز سنانا ضروری ہے۔" انہوں نے غصے پہ قابو پاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ تو نائلہ خوب بدمزہ ہوئی۔ اس نے جلدی سے آواز کافی کم کر دی۔

"اماں! آپ تو بس میرے ہر کام میں کیڑے نکالا کریں، سارا دن کام کاج میں گزر جاتا ہے۔ یہی ایک پروگرام شوق سے دیکھتی ہوں۔ اس پر بھی آپ۔" وہ سخت برہم تھی۔ اماں زہرہ تاسف سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"اب کر تو دی آواز کم۔ اور کیا چاہیے آپ کو۔" انہیں وہیں کھڑا دیکھ کر وہ اور تپ گئی۔

"نہیں کچھ نہیں بیٹا۔" وہ کہہ کر پلٹنے لگیں کہ دفعتاً ان کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔

"ہاں نائلہ!" انہوں نے دوبارہ نائلہ کو مخاطب کیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کل سے ساتھ والے گھر میں بہت خاموشی ہے۔

عجیب سا سناٹا چھایا محسوس ہو رہا ہے۔ میں سوچ رہی تھی تم جا کے دیکھ آؤ ذرا۔" اماں کے کہنے پر اس کا منہ سا بن گیا۔

"ہاں۔ میں بھی حیران ہوں، کل سے بالکل خاموشی ہے اس طرف۔

کل تو میں دیوار پہ بھی چڑھی تھی۔ گاڑی بھی نہیں تھی اور باہر صحن میں بھی کوئی نہیں تھا۔ کیا پتا کہیں گئے ہوئے ہوں۔ پھر مجھ سے نہیں جایا جاتا۔ کون سنے مسز سلیم کی باتیں۔ اپنی فیملی کی تعریف میں پورے پورے قصیدے سنانے لگتی ہیں وہ۔" اس کے لہجے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔

"یہ اس کا صبر ہے بیٹا۔ ورنہ سلیم جیسے بندے کے ساتھ گزارا کرنا کہاں آسان تھا۔ سگی چچا زاد اس کو چھوڑ کے جا چکی ہے۔ یہ تو طاہرہ کا دل ہے۔ جو اس کے ساتھ گزار رہی ہے۔" اماں کی بات سن کر نائلہ کی آنکھوں میں حیرت اور لبوں پہ شدید مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"اماں اس کا مطلب آپ بھی ہماری ہم دیوار کی پوری خبر رکھتی ہیں۔" اسے لگا اماں کی نصیحتوں کا بدلہ چکانے کا اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔

"استغفار کرو لڑکی۔" اماں تو کانپ گئیں اس کی بات کا مفہوم سمجھ کے۔

"اللہ معاف کرے۔ میں کیوں کرنے لگی یہ بدتر کام۔ پھر میں اچھی طرح جانتی ہوں پڑوسیوں کے کیا حقوق ہیں۔ تب ہی تمہیں بھی سمجھاتی ہوں کہ ان کی زندگی کی ٹوہ لینا اور ان کے معاملات کو یوں دوسروں کے آگے اچھالنا چھوڑ دو۔" اماں نے بھی آج سارے لحاظ ختم کر دیئے۔

"تو آپ کو کیسے پتا یہ سب۔" اس نے بے شرموں کی طرح آنکھیں مٹکائیں۔

"اس دن جب تم میکے گئی ہوئی تھیں تو حسن (ان کے بیٹے) کے لیے کھیر بنائی۔ سوچا ہم دیوار ہیں، ان کا بھی حق بنتا ہے۔ سو وہ دینے چلی گئی۔ بس پھر اس کی ساس کی زبانی پتہ چلا سب۔ ورنہ طاہرہ تو اتنی شریف بچی ہے کہ منہ سے اف تک نہیں کرتی۔" اماں نے بات ختم کرتے ہوئے اسے بھی متنبع کیا۔

"اور تم اپنے آپ پہ غور کرو بیٹا۔ پڑوسیوں کی ٹوہ کے بجائے ان کی خیر خیریت بھی پوچھ لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی اس خواہ مخواہ کی ضد میں اپنا اعمال نامہ خراب کر بیٹھو۔" تیز لہجے میں کہتی وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نائلہ نے ہونہہ کہہ کے دوبارہ ٹی وی کی آواز بڑھا دی۔



آج سلمیٰ کے بڑے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ وہ سب دوستیں اکٹھی ہوئیں تو حسب معمول اپنے پسندیدہ ٹاپک پہ شروع ہو گئیں۔ سب ہی اپنے اپنے پڑوسیوں کا حال احوال سنا رہی تھیں بڑے شوق سے۔ نائلہ بیزاری سے خاموش بیٹھی ان کی بات چیت سنتی رہی۔ تبھی نجمہ کا دھیان اس پر پڑا۔

"نائلہ۔ تم کیوں چپ بیٹھی ہو۔" اس نے نائلہ کے کندھے پہ جھٹکا دے کر کہا۔ وہ بے دلی سے مسکرا دی۔

"ہاں۔ نائلہ واقعی۔ ہم سب دوستوں میں سب سے مزیدار اور چٹ پٹی خبریں تو تمہارے پاس ہی ہو سکتی ہیں۔ کوئی بریکنگ نیوز دو۔" سلمیٰ نے اسے اکسایا۔

"یار واقعی۔ مزہ تو مجھے بھی نہیں آ رہا۔ مگر سچ بتاؤں تو اس یار میرے پاس بھی کوئی خبر نہیں ہے۔ پانچ چھ روز ہو گئے۔ ہماری دیوار کے پار تو خاموشی ہی چھائی رہتی ہے۔" نائلہ کے لہجے سے افسوس ظاہر تھا۔

"مسز سلیم کے گھر میں خاموشی۔" نجمہ کے لہجے میں حیرت سے زیادہ تمسخر تھا۔

"سچ پوچھو تو میں تو آج آئی ہی اس لیے کہ نائلہ سے مسز سلیم کے بارے میں تازہ ترین معلومات لوں گی۔" کرن مایوس ہوئی۔

"سچ یار۔ میں تو خود حیران ہوں۔ کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ سلیم صاحب کا مسز سلیم کے ساتھ جھگڑا نہ ہو۔ مگر پچھلے کئی دنوں سے واقعی خاموشی ہے۔" نائلہ نے ان سب کو ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کی۔

"السلام علیکم۔" نہایت قریب سے آئی جانی پہچانی آواز سن کر ان سب کو کرنٹ سا لگا تھا۔

"ارے مسز سلیم آپ۔ کیسی ہیں۔" دل ہی دل میں خدشات میں گھری وہ سب متغیر چہرے لیے ایک ساتھ ہی بول اٹھیں۔ مسز سلیم بے ساختہ مسکرا دیں۔ ان سب کو وہ کافی کمزور لگیں۔

"یار کہیں انہوں نے سب سن تو نہیں لیا۔" نائلہ نے کرن کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ کندھے اچکا گئی۔

"میں ٹھیک ٹھاک۔ الحمد اللہ۔" وہی نرم لہجہ اور مدہم سی مسکان۔

"آپ لوگ کہیں گئے ہوئے تھے کیا۔ کافی دنوں سے نظر نہیں آئے۔" نائلہ کے دل کی بات زبان پہ آ ہی گئی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ ٹوہ لینے کی یہ عادت اسے آج کتنی مہنگی پڑنے والی تھی۔

"جی۔ ہم لوگ اسپتال میں تھے۔" مسز سلیم نے نم لہجے میں نائلہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ نائلہ کو ان کی آنکھوں میں عجیب سا کچھ محسوس ہوا۔ مگر وہ سمجھ نہ پائی۔

"کیوں خیریت ہے۔" نائلہ نے ہی دوبارہ استفسار کیا تھا۔

"ارے واہ۔ میں نے تو سنا ہے آپ کو ہمارے گھر کی ہر خبر معلوم ہوتی ہے۔ تو یہ بات کیسے مس کر دی آپ نے۔" نرم لہجے میں اچانک ہی کڑواہٹ در آئی تھی۔ اور نائلہ کو لگا کہ جیسے کچھ بوجھ سا اس کے دل و دماغ پہ آ گرا اس کے لب ایک دوسرے میں پیوست ہو کے رہ گئے تھے۔

"خیر سلیم کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ پورے چار دن اسپتال میں رہے ہیں۔ کل ہی گھر واپس آئے ہیں۔ اچھے ہیں اب۔" نرم خو مسز سلیم جلدی ہی اپنی جون میں واپس آ گئی تھیں اور ان سے معذرت کرتی آگے بڑھ گئیں۔

وہ سب کی سب دوستیں آج خاموش بیٹھی رہ گئی تھیں۔ اور نائلہ کو ایک دم سے اپنے اندر ایک خالی پن سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر قدرے کونے میں بیٹھی اماں زہرہ کے پاس آ بیٹھی۔

"بالآخر وہ دن آ ہی گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔" اس نے حیرت سے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔

"میری دعا قبول ہو گئی۔ میں تمہیں کتنا سمجھاتی رہی بیٹا۔ مگر شاید خدا تمہیں یہ سبق خود دینا چاہتے تھے۔"

جب ہم دوسروں کی عزت اچھالتے ہیں۔ تو محفوظ خود بھی نہیں رہتے۔ دوسروں کا احترام کرنا ہی تو ایک مسلمان کا شیوہ ہے۔ اور پھر پڑوسی، پڑوس کا حق تو بہت زیادہ ہے بیٹا۔ خود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پڑوسیوں کے بارے میں اتنی تاکید فرمائی کہ مجھے خیال ہوا ہمسایہ جائیداد میں، وراثت میں بھی حصہ دار ہو جائے گا۔ اور پھر ان کی خیر خیریت جاننے کی بجائے ان کی آزمائشوں، ان کے ذاتی معاملات کی ٹوہ لینا اور پھر ان کا مذاق اڑانا۔ یہ تو گناہ کی بدترین شکل ہوئی بیٹا اس حساب سے تو۔" نائلہ کا جھکا سر مزید جھک گیا۔

"لیکن پھر بھی بیٹا۔ اللہ بہت رحمٰن رحیم ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ سچے دل سے توبہ کرو۔ اور آئندہ پڑوسیوں کے معاملے میں اس پاک ذات سے ہمیشہ ڈرتی رہنا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شیخ صاحب کی بیوی کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ اور وہاں سے اٹھتے ہوئے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ کل صبح سب سے پہلا کام نہ صرف یہ کرے گی کہ مسز سلیم کے گھر ان کے شوہر کی عیادت کے لیے جائے گی۔ بلکہ اپنے گھر کی اس دیوار کو بھی اب صرف اپنی ہم دیوار سے تعلق داری کے لیے استعمال کرے گی۔ نہ کہ کن سوئیاں لینے کے لیے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے خدا سے معافی مانگ لی تھی۔ اب اسے مسز سلیم سے معافی مانگنی تھی۔ جو تھوڑا مشکل کام سہی۔ مگر نائلہ جانتی تھی کہ اس کے بعد اس کے لیے آسانی ہی آسانی تھی۔

☼

خلوی بنتِ حوّا

وہ بات ادھوری

"اماں نے کیا کیا ہے میرے لیے۔ شاکر کی ہی ہمیشہ طرف داری کی ہے اور اسی کا فائدہ دیکھا ہے۔ ابا کے مرنے کے بعد جب میں نے پڑھائی جاری رکھنا چاہی تو یہ کہہ کر روک دیا کہ بیٹا! ہم اخراجات پورے نہیں کرسکتے۔ لہٰذا تم اب کمانے کی طرف توجہ دو لیکن جب شاکر نے آگے پڑھنے کی بات کی تو اپنے زیور بیچ کر بھی اسے پڑھانے کو تیار ہوگئیں۔ یہ بھلا کون سا انصاف ہے۔"

صابر گھنٹے بھر سے اماں کے خلاف نہایت جوش و خروش سے تقریر کررہا تھا۔ شمسہ ہمیشہ کی طرح سر جھکائے منہ پر قفل چڑھائے سن رہی تھی۔

ہمیشہ یہ ہی ہوتا تھا۔ اماں جب بھی صابر سے کسی نئے خرچے کا ذکر کرتیں، اسے اماں نہایت بے انصاف لگا کرتیں۔ اب بھی اماں نے عائشہ کے جہیز کے لیے رقم مانگی تو صابر کے پچھلے زخم پھر جاگ گئے۔ اب اگلا مرحلہ یقیناً "ہادیہ والے واقعہ پر اپنی مظلومیت بیان کرنا تھا۔

شمسہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اسے صابر کی یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں لیکن وہ پھر بھی خاموش ہی رہتی۔ کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ

"جب کوئی کسی کی برائی کرے تو اس کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤ بلکہ خاموش رہو۔"

یہ بات اس نے اپنے پلو سے باندھ لی تھی۔ پھر اس کے پیشِ نظر یہ بات بھی تھی کہ کون سا صابر اماں کے سامنے کہتے ہیں کہ ان کی بے عزتی ہوتی یا اماں ناراض ہی ہوتیں۔ بند کمرے میں ہی کہتے ہیں۔ اماں تو سن نہیں پائیں گی اور صابر کا دل بھی ہلکا ہوجائے گا۔ پھر ہوتا بھی یہی تھا۔ بھڑاس نکال کر وہ ہلکا پھلکا ہوجاتا اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں جُت جاتا اور شمسہ دل ہی دل میں اپنی ذہانت کو داد دیتی۔ اسی ذہانت کی بدولت چند سال سکون سے گزر گئے۔

وہ اس کی شادی سے چند روز پہلے کی بات تھی۔ شمسہ ہاتھ میں ڈائجسٹ تھامے "سنہرے الفاظ" پڑھ رہی تھی۔ اسی میں ایک جملہ وہ بھی تھا کہ جب کوئی کسی کی برائی کرے تو اس کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤ... امی کے پکارنے پر وہ باہر صحن میں پہنچی، جہاں وہ بہت ساری چیزیں پھیلائے اس کی منتظر تھیں۔ بس پھر اسے دوبارہ وہ ڈائجسٹ پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ یہاں تک کہ وہ پیا دیس سدھار گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے ٹرے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور ٹھٹک گئی۔ اماں کہہ رہی تھیں۔

"ارے اس چڑیل کا نام بھی مت لو۔ سامنے تو بڑی اچھی بنی پھرتی ہے لیکن اپنے کمرے میں گھستے ہی اصل حالت میں آجاتی ہے۔ میرا صابر مجھ سے ناراض ہوکر غصہ میں میرے خلاف بولنے لگتا ہے تو اس کی تو مانو دلی مراد بر آتی ہے۔ بجائے منع کرنے کے چپ چاپ سنتی اور خوش ہوتی رہتی ہے کم بخت..."

اماں آگے بھی کچھ بولنے کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن مہمان خواتین کی نظریں دروازے کی سمت اٹھتی دیکھ کر مجبوراً" مڑ کر دیکھنے لگیں۔ جہاں زرد پڑتی رنگت لیے شمسہ ہاتھوں میں ٹرے تھامے کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اماں نے چہرے کے تاثرات تو بدل لیے لیکن آنکھوں سے جھانکتی نفرت کو نہ چھپا سکیں۔

شمسہ لرزتی ٹانگوں سے بمشکل تمام ٹرے میز پر رکھ کر کمرے کی طرف چلی گئی۔

وہ حیران تھی، پریشان اور پشیمان بھی کہ آخر اتنے عرصے بعد اماں کو اس سے کیونکر شکایت ہوئی... اور پھر ان خواتین سے کیوں کہہ رہی ہیں۔ اس سے شکایت تھی تو اس سے کہتیں نا... تاکہ وہ ان کی غلط فہمی دور کرتی لیکن انہوں نے تو اس وقت وار کیا جب کہ وہ وضاحت دینے کی پوزیشن میں بھی نہ رہی تھی۔

کچھ عرصے سے اماں کے رویے میں تناؤ کو وہ اب سمجھی تھی۔ یقیناً" کسی دن انہوں نے ساری گفتگو سن لی ہوگی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ میکے پہنچ گئی۔ اماں سمجھیں ناراض ہوکر گئی ہے۔ لیکن پھر بھی نہ روکا مگر وہ ناراض نہ تھی۔ اماں یہ بات نہیں جانتی تھیں۔ ساری رات شمسہ یہ سوچتی رہی کہ کیا اس نے غلط طرزِ عمل اختیار کیا تھا جو اس کے سالوں کا صبر یوں لمحوں میں ضائع ہوگیا۔ وہ فخر سے بتایا کرتی تھی کہ وہ اماں کی پسندیدہ بہو ہے۔ اس سے کہاں غلطی ہوئی۔ یہ ایک سوچ ساری رات اسے پریشان کرتی رہی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہوگئی تھی۔ اسی کیفیت میں اسے اپنا پرانا شوق یاد آگیا، جو وہ اکثر میکے آکر پورا کیا کرتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اسٹور روم میں چلی گئی۔ کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر وہ کمرے میں لے آئی اور جھاڑ کر لیمپ کی روشنی میں پڑھنے لگی۔

آخری صفحات میں "سنہرے الفاظ" پڑھتے ہوئے وہ چونک سی گئی۔ یہ چار سال پرانا وہی رسالہ تھا، جو وہ اپنی شادی کے دنوں میں پڑھ رہی تھی اور جب اس کی امی نے اسے آواز دی تو وہ رسالہ اوندھا رکھ کر صحن میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا تھا...

آج چار سال بعد وہی رسالہ اور وہی "سنہرے الفاظ" اس کے سامنے تھے... جہاں وہی لکھا تھا، جس پر وہ چار سال سے عمل کررہی تھی مگر اب اسے لگا، اس بات پر عمل کرکے اس نے غلطی کی۔ کیونکہ وہ بات ادھوری تھی۔ وہ اپنا سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہ گئی۔ لیمپ کی روشنی میں "سنہرے الفاظ" چمک رہے تھے۔

"جب کوئی کسی کی برائی کرے تو اس کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤ بلکہ خاموش رہو۔ اگر تم اسے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے..."

☼



اک شخص، جو شہر میں آیا تھا

میں جب بھی ڈوب کے لکھتا ہوں
سب لوگ یہ مجھ سے کہتے ہیں
نظموں سے عشق خدا جیسا
غزلوں میں کیف اُداسی کا
کس دوست نے تم کو سونپا ہے
مرا اک جواب ہمیشہ سے
اک شخص، جو شہر میں آیا تھا
کچھ روز وہ میرے ساتھ رہا
مجھے لہجے کے امرت رس میں
اس نے کچھ ایسا رنگ دیا
ہر نازک دل موہ لینے کا
مرے لفظوں کو آہنگ دیا
پھر سوچ کے تانے بانے میں
اُلجھا کر مجھ کو چھوڑ گیا
کچھ دن سے اس کی یاد یونہی
اس دل پہ دستک دیتی ہے
اور پاؤں میں زنجیر پڑی
کب ہم کو جانے دیتی ہے
کب دل میں اس کی آس نہیں
یہ بات الگ وہ پاس نہیں

ارشد ملک

یہ کہنا تھا قیامت ہو گئی ہے
مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے

تمہیں چاہیں یا تم سے دُور جائیں
میرے اندر بغاوت ہو گئی ہے

مجھے اک چاند نے پاگل کیا ہے
سمندر کی سی عادت ہو گئی ہے

محبت ہو ہی جائے گر کسی سے
یہ مت کہنا، محبت ہو گئی ہے

ذرا سی بات پہ پُرنم ہیں آنکھیں
نہ جانے کیسی طبیعت ہو گئی ہے

کسی کا حُسن ہی ایسا ہے شاید
غزل کہنے کی عادت ہو گئی ہے

شاہد اقبال شاہد

کیا زمیں، کیا آسماں کچھ بھی نہیں
ہم نہ ہوں تو یہ جہاں کچھ بھی نہیں

دیدہ و دل کی رفاقت کے بغیر
فصلِ گُل ہو یا خزاں کچھ بھی نہیں

پتھروں میں ہم بھی پتھر ہو گئے
اب غمِ سُود و زیاں کچھ بھی نہیں

کیسے کیسے سرکشیدہ لوگ تھے
جن کا اب نام و نشاں کچھ بھی نہیں

ایک احساسِ محبت کے سوا
حاصلِ عمرِ رواں کچھ بھی نہیں

کوئی موضوعِ سخن ہی جب نہ ہو
صرف اندازِ بیاں کچھ بھی نہیں

آفاق صدیقی



ملن کی ساعت کو اس طرح سے امر کیا ہے
تمہاری یادوں کے ساتھ تنہا سفر کیا ہے

سُنا ہے اس رُت کو دیکھ کر تم بھی رو پڑے تھے
سُنا ہے اس بارش نے پتھروں پر اثر کیا ہے

گھٹن بڑھی ہے تو پھر اسی کو صدائیں دی ہیں
کہ جس ہوا نے ہر اک شجر کو بے ثمر کیا ہے

ہے تیرے اندر بسی ہوئی ایک اور دُنیا
مگر کبھی تُو نے اتنا لمبا سفر کیا ہے؟

بہت سی آنکھوں میں تیرگی گھر بنا چکی ہے
بہت سی آنکھوں نے انتظارِ سحر کیا ہے

انس معین

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"مجھے اس طرح حد سے بڑھا مت دینا جس طرح عیسائیوں نے ابن مریم (عیسیٰ) علیہ السلام کو حد سے بڑھا دیا تھا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔"

(صحیح بخاری - 3445)

حضرت علیؓ کا اُدھار،

قصاب آواز لگا رہا تھا۔ "تازہ گوشت ہے لے لو۔"

وہاں سے حضرت علیؓ کا گزر ہوا۔ قصائی نے آپ کو بھی آفر پیش کی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "آج میری جیب اجازت نہیں دیتی۔"

قصاب بولا۔ "میں آپ سے اُدھار کر سکتا ہوں۔"

آپ نے حکمت آمیز جملہ ارشاد فرمایا۔

"یہ اُدھار میں اپنے پیٹ سے کیوں نہ کرلوں جس کو میں جنت میں اس سے بہتر غذا کھلا سکتا ہوں۔"

قوال افضل گھمن - گجرات

ازراہِ ہمدردی،

ایک شخص کے ہاتھ بڑی رقم لگ گئی اور اسے اہل ذوق میں شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے کا جنون سا ہو گیا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے ایک دفعہ محفل موسیقی منعقد کروائی، جس میں ملک کے عظیم وائلن نواز کو اپنے فن کے جوہر دکھانے کے لیے بلایا۔ وائلن نواز نے اسٹیج پر جاتے ہوئے اپنے فن سے دلی وابستگی کے مدِنظر میزبان کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ حیران ہوں گے کہ جو ساز آج میں آپ کے سامنے بجاؤں گا وہ تقریباً ایک سو سال پرانا ہے۔"

میزبان نے ازراہ ہمدردی جواب دیا۔ "آپ خاموشی سے اپنا کام کریں۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی کو اس نقص کا پتا نہ چلے۔"

مسرت الطاف احمد - کراچی

پہلا کام،

سکاچ بہت کنجوس ہوتے ہیں۔ بی بی سی کے ایک ذہنی آزمائش کے پروگرام میں سوال کیا گیا۔

ایک اسکاچ جوڑا ہوٹل کے ایک کمرے میں مقیم ہے۔ صبح جب شوہر کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے۔ بتائیے اس صورت حال میں سکاچ سب سے پہلا کام کیا کرے گا۔ وہ مردہ دفن کرنے والوں کو فون کرے گا یا پولیس کو فون کرے گا یا...؟"

جناب! وہ سب سے پہلے ہوٹل کے منیجر کو فون کرے گا۔" امیدوار نے جواب دیا۔

"کس مقصد کے لیے؟ اور کیا پیغام دے گا؟"

"صبح کا ناشتہ صرف ایک شخص کے لیے آئے۔"

"جواب صحیح ہے لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"میں خود ایک اسکاچ ہوں۔"

عذرا ناصر - کراچی

دُکھ،

اللہ تعالیٰ جس کو اپنے آپ کو یاد دلانا چاہتا ہے اسے دُکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ

کر لیتا ہے۔ دُکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے۔ پھر اس سے نیک اعمال خودبخود اور بہ خوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دُکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے۔ اس پر صابر اور شاکر ہی چڑھ سکتا ہے۔"

(بانو قدسیہ کی کتاب "دست بستہ" سے اقتباس)

رضوانہ شکیل لاڈ - لودھراں

بُرائی،

حضرت سلیمان علیہ السلام سے پوچھا گیا۔

"وہ کون سی بُرائی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی نفع نہیں دیتی؟"

فرمایا۔ "تکبّر۔"

حنا سلیم اعوان - آخون باندی

دعوت،

حضرت سلیمان نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی

"اللہ تعالیٰ! میں ایک سال تک آپ کی مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "تم نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا ایک مہینہ کر لیتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا۔ "تم نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا، ایک ہفتہ کر لیتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا۔ "تم نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا۔ صرف ایک دن تو کرنے دیں۔"

اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی۔

انہوں نے جنات، ہوا، انسانوں، پرندوں کو حکم دیا۔ "کھانا لگاؤ۔"

جب کھانا لگ گیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا۔ "اپنی مخلوق کو بھیج دیں، کھانا تیار ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔ "زمین والوں کو بھیجوں یا پانی والوں کو؟"

انہوں نے کہا۔ "پانی والوں کو بھیج دو۔"

تو ایک مچھلی باہر نکلی اور سارا دستر خوان برتنوں سمیت کھا گئی۔ اور کہنے لگی "اور دو۔"

حضرت سلیمان حیرت سے منہ میں انگلی دبا کر کھڑے تھے، کہنے لگے۔

"تو سب کھا گئی اور کہاں سے دوں؟"

وہ بولی۔ "مہمان کو کوئی طعنے دیے جاتے ہیں۔ سلیمان! آج تو میں بھوکی رہوں گی۔ میرا اللہ مجھے روزانہ ایسے تین لقمے دیتا تھا۔ سلیمان! یہ تیرا کام نہیں۔ تیرے رب کا ہی کام ہے کہ وہ سب کو کھلاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ سمندر میں چلی گئی۔

فرزانہ طفیل - واہ کینٹ

ہیئر ڈریسر کا رنر،

ع "میرا اُسترا کیسا تھا، جس سے میں نے آپ کا شیو بنایا؟"

و "اچھا... !تو تم اُسترے سے میرا شیو بنا رہے تھے، میں تو سمجھا کہ اس کام کے لیے تم ریگ مال استعمال کر رہے ہو۔"

ع "سر! میں شیو بنانے کے لیے آپ کے منہ پر جھاگ بنانے لگا ہوں، آپ اپنا منہ بند کر لیں۔"

و نہیں... پہلے تم اپنا منہ بند کرو۔"

ع سر! آپ کس طرح اپنی حجامت بنوانا پسند کریں گے؟"

و تمہاری آواز سنے بغیر۔"

ثمرہ، اقراء - کراچی

کارکردگی،

فرانس کا مشہور کامیڈین لوئی بیان کر رہا تھا۔

"ہالی وڈ میں ایک فلمی ستارے کی شادی کا کارڈ میرے پاس ایک گھنٹہ دیر سے پہنچا۔ میں فوراً جائے شادی پر پہنچا۔ شادی میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ طلاق کا منظر دیکھنے کے لیے۔"

موتی مالا،

☆ قابلیت اور کردار زندگی میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں قابلیت آپ کو بلندی تک پہنچاتی ہے جبکہ اچھا کردار

آپ کو ہمیشہ بلند رکھتا ہے۔

٭ ہمسفر وہ نہیں جو آپ کا ساری زندگی ساتھ نبھائے بلکہ ہمسفر تو وہ ہے جو آپ کو لمحوں میں پوری زندگی دے جائے۔

٭ اچھا سوچیے اور اچھا بولیے کیونکہ بدزبانی اور بدگمانی جو ایسے عیب ہیں، جو انسان کے ہر کمال کو زوال میں بدل دیتے ہیں۔

٭ طاقت کی ضرورت جب ہوتی ہے جب کچھ برا کرنا ہو، ورنہ دنیا میں سب کچھ پانے کے لیے آپ کے اخلاق ہی کافی ہیں۔

٭ انسان مکان بدلتے ہیں، رشتے بدلتے ہیں، دوست بدلتے ہیں لیکن پھر بھی دکھی رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنا رویہ نہیں بدلتے۔

٭ زندگی جینے کے دو راستے ہیں۔ بھول جاؤ انہیں جنہیں معاف نہیں کر سکتے اور معاف کر دو انہیں جنہیں بھول نہیں سکتے۔

٭ پریشانی خاموش ہونے سے کم، صبر کرنے سے ختم اور شکر کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

کنسلٹنٹ

بل سرسبز پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کے بڑے سے گلے کو چرا رہا تھا کچے راستے پر دور سے دھول اڑاتی ہوئی ایک شان دار جیپ نمودار ہوئی۔ بل کے قریب سے گزرتے ہی جیپ رک گئی۔ ڈرائیور نے اسے قدرے ریورس کیا اور انجن بند کر کے نیچے آ گیا۔

وہ بیش قیمت سوٹ میں ملبوس قیمتی پرفیوم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ آنکھوں پر رے بین کا چشمہ جما ہوا تھا۔ اس نے بل سے کہا۔

"اگر میں تم کو بتا دوں کہ اتنے بڑے ریوڑ میں تمہاری بھیڑوں کی تعداد کتنی ہے تو کیا تم ایک بھیڑ مجھے دے دوگے؟"

بل کو دلچسپی محسوس ہوئی۔ اس نے کہا۔ "ہاں دے دوں گا۔"

نووارد نے اپنی جیب سے ٹیبلٹ نکالا اور اسے الیکٹرانک نوٹ پیڈ سے منسلک کیا اور انٹرنیٹ پر ناسا کا پیج نکالا۔ صفحہ ملتے ہی اس نے سیٹلائٹ سے چلنے والے جی پی ایس کو جوڑا۔ اس پر کھیلتے ہوئے اس نے بل کی چراگاہ کا تعین کیا۔ اس کا ڈیٹا بیس نکالا اور تقریباً ساٹھ اسپریڈ شیٹس پر پیچیدہ فارمولوں میں الجھے رہنے کے بعد اپنے چھوٹے سے پرنٹر پر ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ نکالی اور بل سے کہا۔

"اس وقت یہاں 15862 بھیڑیں موجود ہیں۔"

"بالکل درست۔" بل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اب تم ایک بھیڑ لے سکتے ہو۔"

وہ ریوڑ کے قریب گیا اور ایک جانور کو اٹھا کر اپنی جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔

وہ لوٹا تو بل نے کہا۔ "اب اگر میں تمہارے پیشے کے بارے میں بتا دوں تو کیا تم مجھے میرا جانور واپس کر دوگے؟"

نووارد راضی ہو گیا۔ بل نے کہا۔ "تم کنسلٹنٹ ہو؟"

وہ حیران رہ گیا۔ "بالکل درست۔ تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟"

"بہت آسان سی بات ہے۔" بل نے اطمینان سے کہا۔ "تم بن بلائے میرے پاس آئے۔ دوسری پہچان یہ تھی کہ تم ایک ایسے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے جس کا جواب میں پہلے سے جانتا تھا اور اس کے معاوضے میں ایک بھیڑ کے طلب گار تھے۔ تیسری اور آخری پہچان یہ تھی کہ تمہیں یہ تک نہیں پتا تھا کہ یہاں کون کون سے جانور ہیں۔ تم نے بھیڑ کے بجائے میرا کتا اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا ہے۔ مہربانی کر کے اب اسے واپس کر دو۔ وہ بہت بے ضرر ہے صرف بھٹکنے والی بھیڑوں پر غراتا ہے۔"

عذرا، اقصیٰ۔ کراچی



میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

رضوانہ شکیل راؤ ———— لودھراں

کچھ حسن و عشق میں فرق نہیں، ہے بھی تو فقط رسوائی کا
تم ہو کہ گوارا کر نہ سکے، ہم ہیں کہ گوارا کرتے ہیں

حنا خورشید ———— دعولہ

تم نے کیسا رابطہ رکھا
نہ ملے ہو نہ فاصلہ رکھا
جھوٹ بولا تو عمر بھر بولا
تم نے اس میں بھی ضابطہ رکھا

کرن نعمان ———— نامعلوم شہر

اب خوف نہیں کوئی مجھے راہ گزر سے
میں دور نکل آیا ہوں پتھر کے نگر سے
اک موڑ پہ ہم اجنبی بن کے بھی ملیں گے
یہ بات تو معلوم تھی آغازِ سفر سے

رباب فاطمہ، ثمینہ عشرت ———— موچھا میانوالی

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں
آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

ام مناہل ———— ایبٹ آباد

مدتیں ہو گئی ہیں چپ رہتے
کوئی سنتا تو ہم بھی کہتے

اکرم ———— گاؤں گوریکی ضلع گجرات

چاہت میں کیا دنیا داری، عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا، سمجھانے دو، ان کی اپنی مجبوری
میں نے دل کی بات رکھی، اور تو نے دنیا داروں کی
میری عرض بھی مجبوری تھی، ان کا حکم بھی مجبوری

شمع مسکان ———— جام پور

نتیجہ پھر وہی ہو گا، سنا ہے چال بدلے گا
پرندے پھر وہی ہوں گے، شکاری جال بدلے گا
بدلنے ہیں تو دن بدلو، بدلتے ہو تو ہندسے ہی
مہینے پھر وہی ہوں گے، سنا ہے سال بدلے گا

ربیعہ عکس ———— جام پور

اپنا کام ہے صرف محبت، باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے، جب چاہے من جائے
کیا کیا روگ لگے ہیں دل کو، کیا کیا ان کے بھید
ہم سب کو سمجھانے والے، کون ہمیں سمجھائے

فائزہ بلال اقرا ———— جام پور

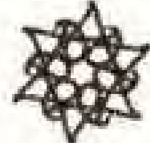
جدا ہونے کا اندیشہ جدا ہونے سے پہلے تھا
وہ مجھ سے انتہائی خوش خفا ہونے سے پہلے تھا
جنوں کا دور گزرا تو مجھے بھی بھول بیٹھا وہ
نمازِ عشق تھا لیکن قضا ہونے سے پہلے تھا

عائشہ اختر بٹ ———— سرگودھا

میں کیسے سوچ سکتا تھا مجھے وہ چھوڑ جائے گا
بہت ہی باوفا وہ بے وفا ہونے سے پہلے تھا

رافعہ ارشد ———— لیاری کراچی

زندگی تجھ سا منافق بھی کوئی کیا ہو گا
تیرا شہکار ہوں اور تیرا ہی مارا ہوا ہوں
سامنے پھر مرے اپنے ہیں سو میں جانتا ہوں
جیت بھی جاؤں تو یہ جنگ میں ہارا ہوا ہوں



امت الصبور

خواتین کی ڈائری

اقصیٰ مریم ملغانی کی ڈائری سے

نیلے، دھند لکے آسمان پر صبح کے ستارے کی کھوج، اور اس کے مل جانے پر امید اور زندگی کی نئی کرن پھوٹ پڑتی ہے۔ عشق، چاہت، رنگ، یادیں، دل، آنگن سب کے سب سنگی بیلی بن جاتے ہیں۔ ٹمٹماتے تارے کی مدھم سی لو آنکھوں میں چاندنی بھر دیتی ہے اور پھر ہر شدیپ گوہر جب نصیر ترابی کا لکھا گاتی ہیں، سماں بندھ جاتا ہے۔ آپ بھی پڑھیں۔

یہ جو اک صبح کا ستارہ ہے
زندگی تیرا گوشوارہ ہے
اے مقدر کوئی حساب تو رکھ
کون جیتا ہے کون ہارا ہے
رفتہ رفتہ یہ ماجرا بھی کھلا
دل کے سودے میں سب خسارہ ہے
کیسی افتاد پڑ گئی آخر
وقت گزرا نہیں گزارا ہے

عشق کے درمیان بھول گئے
کیا تمہارا ہے کیا ہمارا ہے
رنگ بھی کھل رہا ہے چاہت کا
کس نے منظر کو یوں سنوارا ہے

آنکھ بھرنے لگی ہے یادوں سے
شور دریا ہے چپ کنارہ ہے
یہ دبے پاؤں کون آیا ہے
کس کی آہٹ نے پھر پکارا ہے
یہ جو اک صبح کا ستارہ ہے

راضیہ بلوچ کی ڈائری سے

زندگی کی شاہراہ پر ٹکرانے والے کچھ مسافر ہماری سوچوں کا کچھ حصہ چپکے سے اپنے نام کر جاتے ہیں اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ گزرتے وقت میں کسی کے لہجے کا خلوص، گفتگو کی شیرینی، سادگی اور آنکھوں کی چمک ماضی کی اوٹ سے جھانکتی ہے اور اپنے ہونے کا یوں احساس دلاتی ہے کہ ہم خود فراموشی پر سوائے انگشت بدنداں ہونے کے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔ یہ خوب صورت غزل آپ سب بہنوں کے نام۔

دشت احساس میں ہم اتنے اکیلے کب تھے
دکھ تو پہلے بھی تھے پر اتنے گھنیرے کب تھے

ہم تو نکلے تھے ہواؤں کا مقدر لے کر
ہم کسی موڑ پہ دم لینے کو ٹھہرے کب تھے

جاگتے بیت گئیں دشت میں صدیاں کتنی
یہ بھی اب یاد نہیں ہم کو کہ سوئے کب تھے

بغض کی دھوپ سے ہم بھاگ کے جاتے تو کہاں
شہر احباب میں وا دل کے دریچے کب تھے

ہر طرف شاخوں پہ لٹکی تھی صبا خاموشی
رات کے پیڑ میں آواز کے جھولے کب تھے

سعدیہ نازلی دعا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ نظم آپ سب بہنوں کی نذر۔

سیاہ رات کی ڈولی، ادھورے دن کے کہار
اداس دھوپ کی پائل، خموش پھولوں کے ہار
چمن میں تتلی کوئی ہے، نہ ہی کلی پہ نکھار
اکیلے پیڑ خزاؤں کے زخم گنتے ہوئے
ٹھٹھرتی تیز ہواؤں کے بین سنتے ہوئے
ہیں کتنی ان کہی بے نام، بے زبان چاہتیں
جو اپنی مٹھیوں میں آس کا گلال لیے
دھنک کے رنگ میں لپٹی سمے کی چال لیے
نئے برس کی دلہن کے انتظار میں ہیں
ایسا برس جو نئے من کے میت لائے گا
جو دھڑکنوں سے ہیں بچھڑے، وہ گیت لائے گا
محبتوں کی زمین، آسمان ملائے گا

حرا قریشی کی ڈائری سے

ڈائری کے قلب مژگاں پر تحریر پروین شاکر کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

آنکھوں نے کیسے خواب تراشے ہیں ان دنوں
دل پر عجیب رنگ اترتے ہیں ان دنوں

رکھ اپنے پاس اپنے مہ و مہر اے فلک
ہم خود کسی کی آنکھ کے تارے ہیں ان دنوں

دست سحر نے مانگ نکالی ہے بارہا
اور شب نے آکے بال سنوارے ہیں ان دنوں

اس عشق نے ہمیں ہی نہیں معتدل کیا
اس کی بھی خوش مزاجی کے چرچے ہیں ان دنوں

اک خوشگوار نیند پہ حق بن گیا مرا
وہ رت جگے اس آنکھ نے کاٹے ہیں ان دنوں

نمرہ، اقراء کی ڈائری سے

ایک اچھے شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کی شاعری کسی خاص وقت یا دور کے لیے نہیں ہوتی۔ وہ ہر دور کی آواز ہوتی ہے۔ حبیب جالب عوامی شاعر تھے۔ انہوں نے ہمیشہ آمریت کے خلاف آواز بلند کی۔ ایک سابق ڈکٹیٹر کے خلاف غداری مقدمے کے پس منظر اور عوامی مسائل کے حوالے سے یہ غزل پڑھی گئی۔ قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

میں غزل کہوں تو کیسے کہ جدا ہیں میری راہیں
میرے اردگرد آنسو، میرے آس پاس آہیں

نہ وہ عارضوں کی صبحیں، نہ وہ گیسوؤں کی شامیں
کہیں دور رہ گئی ہیں، میرے شوق کی پناہیں

نہ فریب دے سکے گی ہمیں اب کسی کی چاہت
کہ رلا چکی ہیں ہم کو تیری کم سخن نگاہیں

کہیں گیس کا دھواں ہے، کہیں گولیوں کی بارش
شب عہد کم نگاہی تجھے کس طرح سراہیں

میں زمیں کا آدمی ہوں مجھے کام ہے زمیں سے
یہ فلک پہ رہنے والے مجھے چاہیں یا نہ چاہیں

کوئی دم کی بات ہے یہ، کوئی پل کی بات ہے یہ
نہ رہے گا کوئی قاتل نہ رہیں گی قتل گاہیں

نہ مذاق اڑا سکیں گی میری مفلسی کا جالب
یہ بلند بام ایوان، یہ عظیم بارگاہیں





نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی.
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نورین۔۔۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

جنوری کے شمارے میں ایک قاری بہن نے جس کہانی کے بارے میں پوچھا ہے' وہ بہن افشاں آفریدی کی کہانی ہے۔ عنوان تھا۔ "بساط دل بھی عجیب شے ہے" یہ شعاع میں فروری 2005ء میں شروع ہوئی تین اقساط پر مشتمل تھی۔ اپریل میں اختتام ہوا۔

ج۔ نورین بہت شکریہ۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نہ صرف شعاع اور خواتین کے پرچوں کو سنبھال کر رکھتی ہیں بلکہ ان میں شائع ہونے والی تحریریں یاد بھی رکھتی ہیں۔ افشاں آفریدی کا یہ ناول بہت جلد کتابی شکل میں آرہا ہے۔

ربیبہ عکس۔۔۔ جام پور ضلع راجن پور

"ہمارے نام" میں اپنا خط نہ پاکر تھوڑا سا دکھ ہوا' لیکن نظر جب ردا کے نام پر پڑی تو خوشی ہوئی۔ ردا جی مشہور شاعرہ تو نہیں' لیکن بہت باصلاحیت ہیں۔ ہمارے شہر کے کئی ایسے شاعر گزرے ہیں جو عمر بھر گمنام رہے اور گمنامی میں ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ قاضی فیض ایسے ہی شعرا میں سے ہیں۔

"اسیرزات" کے اختتام نے رلادیا۔ دلشاد نسیم کا یہ منفرد نوعیت کا افسانہ پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے صبوحی کوئی فرضی کردار نہیں بلکہ جیتی جاگتی حقیقت ہو۔ بہت جاندار کہانی تھی۔ آخر تک معیار برقرار رہا۔ باقی احمد پوری کی غزل بہت پسند آئی اور ثمینہ اکرم کی نظم بہت اچھی ہے۔

ج۔ ربیبہ! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہوسکا۔ ردا جی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی کہ وہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کریں تو کامیاب ہوں گی۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آصفہ' مہ جبیں' جویریہ۔۔۔ ملتان

ہم آپ کے پرچوں کے باقاعدہ قاری ہیں۔ جوکہ ہمیں ہمارے ابو جان لاکر دیتے ہیں۔ جس چیز نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا' وہ یہ ہے کہ خواتین کا معیار آج سے چودہ پندرہ سال پہلے جیسا نہیں رہا۔ آج کل کی کہانیوں میں کوئی چارم نہیں ہے۔ وہی گھسی پٹی کہانیاں اور روایتی ساس بہو کے جھگڑے کہانیاں پاکستان کے غریب طبقے کی عکاسی کرتی ہیں۔ پاکستان میں ویسے ہی فرقہ وارانہ فسادات نے ملک کی جڑیں کھوکھلی کردی ہیں۔ ہر جگہ بارود کا کھیل ہورہا ہے مسائل و مشکلات میں گھرے عوام آپ کے شمارے سے لطف اندوز ہونے کے بجائے مزید فرسٹریشن کا شکار ہورہے ہیں۔ خواتین کی ٹائٹل گرل ہمیشہ پرانے فیشن کے کپڑوں میں نظر آتی ہے۔ پورے شمارے میں قسط وار تحریروں کی بھرمار ہے۔ قسط کے انتظار میں کہیں ہماری زندگی کی قسط ہی نہ نکل جائے۔

گزارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ مکمل اور رومانٹک تحریروں میں اضافہ کریں ویسے تو لوگ فلموں اور ڈراموں میں بہت سی قابل اعتراض چیزیں دیکھتے ہیں' لیکن اگر تحریروں میں ذرا سا رومانس آجائے تو اعتراض اور پابندیاں عائد کردی جاتی ہیں۔

ج۔ آصفہ' جویریہ اور مہ جبیں! آپ کی شکایت بجا ہے' ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ خواتین میں خوشگوار ہلکی پھلکی کہانیاں دی جائیں' لیکن ہماری مصنفین کا کہنا ہے کہ جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں' وہاں خواب دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ تلخ حقائق نیندیں اڑا دیتے ہیں تو وہ قارئین کو خواب کیسے دکھائیں۔ ہم آپ کی شکایت ان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ ٹائٹل کے لیے ہم خیال رکھیں گے کہ آئندہ جدید ڈریسز میں تصاویر دی جائیں۔

قسط وار کہانیاں دینا ہماری مجبوری ہے۔ اچھی کہانی اگر بہت طویل ہو تو ایک قسط میں شائع کرنا ممکن نہیں ہوتا اور صرف اس بنا پر ریجیکٹ بھی نہیں کرسکتے کہ کہانی طویل ہے۔ مجبوراً "قسطوں" میں دینا پڑتی ہے۔

زینب طاہر۔۔۔ نامعلوم شہر

مجھے آپ کا رسالہ بہت پسند ہے' خاص طور پر ماہ تمام اور کوہ گراں تھے ہم' میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ میری بھابھی بھی بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔

ج۔ زینب' بہت شکریہ۔۔۔ اپنی بھابھی کا بھی ہماری طرف سے شکریہ ادا کردیں۔

ایمل نور' نورالہدیٰ۔۔۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

خواتین اور شعاع کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہمارا موسٹ فیورٹ ناول "بن مانگی دعا" ہے' بہترین رائٹر نمرہ احمد' عمیرہ احمد' سمیرا حمید اور سائرہ رضا ہیں۔ نمرہ احمد کے نئے ناول کا انتظار کررہے ہیں۔

سلسلہ کرن کرن روشنی اسلام کے بارے میں نالج میں اضافہ کرتا ہے۔

ج۔ ایمل نور اور نورالہدیٰ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' ان شاء اللہ اپریل میں نمرہ کا نیا ناول شروع کررہے ہیں۔

لاریب' ماہ زیب۔۔۔ چونیاں

ہماری سب سے زیادہ پسندیدہ کہانی "کوہ گراں تھے ہم" ہے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ ماہ نور کی طبیعت' سعد کا ایثار اور سادگی اچھی لگتی ہے۔ "بن مانگی دعا" میں ایبہا معیز کی ہی منکوحہ ہے' لیکن کہانی میں تجسس برقرار رکھنے کے لیے اس رشتے کو مبہم سے انداز میں بیان کیا جاتا ہے واضح طور پر کہیں بھی ذکر نہیں' سروے میں قرۃ العین ہاشمی اور انیقہ انا کے جوابات ہمیشہ اچھے لگتے ہیں' لیکن اس بار انیقہ کی کمی محسوس ہوئی بہت۔

ہمیں عائشہ فیاض کے خط بہت اچھے لگتے ہیں' لیکن وہ خط لکھتی کبھی کبھار ہیں' ان کے خط سے ہی افسانے کا مزہ ملتا ہے (جو کبھی وہ لکھیں تو) تو ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معوذتین سورۃ فلق اور سورۃ الناس کو کہتے ہیں۔ اعوذ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں پناہ مانگنا۔ اور پناہ سورۃ الناس اور سورۃ فلق میں ہی مانگی گئی ہے۔

کراچی کی ایک نامعلوم بہن نے جس کہانی کے بارے میں پوچھا ہے اس کہانی کا نام تھا "بساط دل بھی عجیب شے ہے" اور اس کہانی کی مصنفہ افشاں آفریدی تھیں۔ یہ ناول فروری 2005ء اپریل 2005ء تک تین اقساط میں شعاع میں چھپا تھا۔

خنساء محی الدین نے ٹائٹل کے بارے میں جو تجویز دی ہے وہ مکمل طور پر تو شاید قابل عمل نہ ہو' لیکن سال میں ایک مرتبہ جیسے بہار نمبر وغیرہ کے نام سے کسی ایک شمارے پر پھول یا قدرتی مناظر وغیرہ دیے جائیں اور پھر بہنوں کی پسند ناپسند کو مدنظر رکھ کر آئندہ کے لیے پلان کیا جائے۔

ج۔ لاریب اور ماہ زیب! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پروف کی غلطی کی وجہ سے غلط شائع ہوگیا۔ اس شمارے میں تصحیح کی جارہی ہے۔

افشاں آفریدی کے ناول کے بارے میں ہمیں بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں اور ہم ایک خوشگوار حیرت کی کیفیت میں مبتلا ہیں کہ ہماری قارئین کی یادداشت اتنی اچھی ہے وہ ہمارے پرچوں کی تحریریں اتنے ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں' انہیں یاد رکھتی ہیں۔

ٹائٹل کے بارے میں آپ کی تجویز اچھی لگی۔

مومنہ افضل راؤ۔ پیرس روڈ سیالکوٹ

۔ خواتین اور شعاع پچھلے بارہ سال سے پڑھ رہی ہوں۔

خیر خط لکھنے پر میں اس لیے مجبور ہوئی جب کچھ بہنوں کے خطوط نظروں سے گزرے۔ میرے بابا جان تبلیغی جماعت کے بہت سرگرم رکن ہیں۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے جب مختلف خطوط میں پڑھتی ہوں کہ ان کو رسائل پڑھنے پر بہت منفی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے والد، بھائی یا شوہر کی طرف سے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرے والد محترم جب چالیس دن کے لیے یا سہ روزہ کے لیے جاتے ہیں تو ہاکر کو وہاں سے کال کرکے پوچھتے ہیں کہ میری بیٹی کو رسائل پہنچا آئے۔ خود یہاں ہوں اور مجھے وقت پر رسائل نہ ملیں تو خود جاکر بک شاپ سے لے کر آتے ہیں۔ مجھے آج تک کبھی ڈانٹ تو کجا انہوں نے منع تک نہیں کیا۔ میں تمام قارئین سے التجا کروں گی کہ خدارا کسی ایک بندے کی وجہ سے آپ سب کو ایک ہی ترازو میں مت تولیں۔

اس ماہ کا شمارہ بھی پچھلے ہر شمارے کی طرح لاجواب تھا۔ سب کاموں سے فارغ ہوکر چپس، اسنیکس اور ڈرائی فروٹ کے ایک ڈھیر کے ساتھ میں رسالہ پڑھتی ہوں اور بلاشبہ پورے مہینے میں وہی میرا پسندیدہ وقت ہوتا ہے۔

اور ایک بات کہ کیا میں بھی رنگا رنگ سلسلہ میری خامشی کو بیاں ملے اور آپ کا باورچی خانہ میں حصہ لے سکتی ہوں؟

"بن مانگی دعا" بہت اچھا لکھا گیا۔ صالحہ کے غلط فیصلے، بلکہ جذباتی قدم پر دل سے دکھ ہوا۔ مگر جس انسان کو اپنی عزت خود پیاری نہ ہو اس کو کون سمجھا سکتا ہے "آنے والا وقت" بہت لطیف تحریر تھی۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ "اسیر ذات" نے دل کو اداس کیا۔ "اب یوں کرتے ہیں" میں مجھے حمیدہ بی بی کی لاجک سمجھ نہیں آئی۔ ہم تو دعا کرتے ہیں ہماری بھابیاں آئیں اور گھر کو سنبھال لیں۔ خانہ عنکبوت بہت منفرد تحریر مگر پھر داڑھی والے حضرات پر آبجیکشن کچھ کلین شو حضرات اس سے بھی زیادہ دقیانوسی ہوتے ہیں۔ باقی تحریریں بھی بے حد اچھی تھیں۔

خاص طور پر "میری محبتوں کا کارواں" اور اب "کرمیری رفوگری" اس ماہ کی سپرہٹ تحریریں تھیں۔

"ماہ تمام" میں مجھے تقی اور شفا کے ملنے پر بے حد خوشی ہوئی اور سماہر جیسی بھابھی اللہ تعالیٰ کسی کو نہ دے۔

ج پیاری مومنہ! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی خاص طور پر آپ کے والد کے بارے میں جان کر کہ وہ آپ کو خود پرچہ لاکر دیتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ہمارے مذہب میں عورت کو جتنی عزت دی گئی ہے کسی بھی مذہب میں عورت کا اتنا احترام نہیں ہے۔ جو مرد حضرات مذہب کے نام پر اپنی عورتوں پر غیر ضروری پابندیاں عائد کرتے ہیں، ان پر شک کرتے ہیں در حقیقت وہ مذہب اسلام کی روح سے ناواقف ہیں اور اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔

نازیہ جمال کی کہانی میں حمیدہ بی بی کو کام کرنے کا شوق نہیں تھا۔ دراصل بہو کی گھر میں اہمیت اور تعریف دیکھ کر وہ عدم تحفظ کا شکار ہوگئی تھیں۔ ساری زندگی انہوں نے خود کام کرکے اہمیت اور تعریف سمیٹی تھی۔ انہیں لگا کہ ان کی اہمیت کم ہورہی ہے اس لیے انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا۔

مومنہ! آپ خواتین کے ہر سلسلے میں حصہ لے سکتی ہیں، پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

انیلہ قیصر گل۔ پیرووال ناروال

خواتین سے وابستگی اتنی پرانی ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی اسے اپنے گھر (میکے میں) تقریباً "14 سال سے پڑھ رہی ہوں اس سے پہلے میری بڑی بہنیں منور قیصر، شائستہ قیصر اور عشرت بانو پڑھا کرتی تھیں۔ جب بھی خط لکھنے کے بارے میں سوچتی تو یہی خیال آتا کہ نہیں ابھی نہیں۔ ابھی سمجھنے کا شعور اور ہوجائے۔ ابھی تو لکھنے کا سلیقہ نہیں

حالانکہ بہت بار بہت سی کہانیوں کو پڑھ کر بے اختیار دل چاہا کہ اس پر تبصرہ کروں۔

اس ماہ سب سے پہلے تو ٹائٹل بلاشبہ کہ اچھا تھا۔ سب سے پہلے کہنی سنی پڑھی۔ عنیزہ سید کے ناول کا سحر جوں کا توں برقرار ہے گو کہ ہمیں پہلے بھی اندازہ تھا کہ کھاری بلال سلطان کا ہی بیٹا ہے اور اب تجسس صرف اس بات کا ہے کہ رابعہ آپا کا قلزا ظہور سے سامنا ہونے پر کیا حقیقت سامنے آتی ہے۔ ہمارا (مطلب میرا، باجی منور، ایڈووکیٹ شایان قیصر نبیلہ قیصر) کا خیال ہے کہ ماضی میں چلنے والا

دوسرا کردار شہناز بیگم کا ہے جو فاطمہ وغیرہ کی کزن ہے اور شاید سعد سلطان کی والدہ بھی۔ دوسرا طویل ناول بن مانگی دعا افسوس سے کہوں گی کہ کچھ خاص متاثر نہیں کررہا۔ حالانکہ عفت سحر بہت اچھی رائٹر ہیں۔ ناولٹ میں محبت کا کارواں بس ٹھیک ہی لگا، بقیہ ناولٹ میں یوں کرتے ہیں نازیہ جمال کا بہت مزے کا لگا یہ کیسا ہیر پھیر ہے بس ٹھیک ہی تھا۔ ماہ تمام شروع سے ہی کچھ خاص پسند نہیں۔ ہاں اب جو آمنہ آپی نے جوڑی بنائی ہے شفا اور تقی کی وہ اچھی لگی۔ اسے برقرار رہنا چاہیے۔ افسانوں میں اسیر ذات نے اپنا اسیر کرلیا۔ تمام رائٹر کو اچھا لکھنے پر ڈھیروں مبارک باد رفوگری سائرہ آپی کے ناول پر تبصرہ محفوظ ہے۔

ج پیاری انیلہ! آپ نے اتنا عرصہ صرف یہ سوچ کر خط نہیں لکھا کہ آپ کو اظہار کا سلیقہ نہیں۔ پسندیدگی اور محبتوں کے اظہار کے لیے خوبصورت الفاظ کی نہیں جذبوں کی سچائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سچ میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہ خود بخود دل میں جگہ بنالیتا ہے۔ جی ہاں ثمینہ اکرم وہی ہیں جو لیاری کراچی سے خط لکھتی ہیں۔

نادیہ خضر۔ لاہور

خط لکھنے کی وجہ "اب یوں کرتے ہیں" جو "نازیہ جمال" نے تحریر کی ہے یہ کہانی میری اپنی زندگی کی کہانی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں "فائقہ" کو گھر کی بات بتانے والی بہن مل گئی اور ہمیں کوئی مل نہ سکا۔ پھر بھی اس "کہانی" کو پڑھ کر زخم ہرے ہوگئے کیونکہ 14 سال ساتھ گزارنے کے بعد بھی اگر آپ کا ہم سفر آپ کی کسی بات پر یقین نہ کرے تو زندگی گزارنی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوجاتی ہے۔ اتنے سالوں میں فرق یہ آیا ہے کہ اب بچے (میرے ماشاء اللہ چار بچے ہیں بڑی جڑواں بیٹیاں ہیں جو ساڑھے گیارہ سال کی ہیں) بھی بابا کو دیکھ کر رہ جاتے ہیں اور یہی بات ہے کہ بچوں کے سامنے اپنی بات کی نفی ہوتے دیکھ کر غصہ ہی آتا ہے اور میں بھی کوئی "ستی ساوتری" نہیں ہوں کہ بس چپ چاپ بات سنوں۔ ایک کی دس سناتی ہوں مگر کیا حاصل۔ جو دراڑ دلوں میں آگئی ہے، وہ چیخنے چلانے کے باوجود ہنوز برقرار رہتی ہے۔ اب کئی دفعہ خاموش بھی ہوجاتی ہوں کیونکہ رونا بھی اب نہیں آتا لیکن ایک اداسی سی ہے جو مٹائے نہیں مٹتی۔

خیر میری طرف سے "نازیہ جمال" کو ڈھیر ساری مبارک دیں کیونکہ یہ کہانی میری کئی غیر شادی شدہ بہنوں، بیٹیوں کے کام آنے والی ہے۔ کیونکہ اکثریت ساسوں کی ایسی ہی ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی چھپ کر وار کرتا ہے اور کوئی سامنے سے۔ بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ ہنستے ہنستے ہی وار کا توڑ ہوجائے۔ ویل ڈن۔

ج نادیہ! میاں بیوی سے زیادہ قربت کا رشتہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا، ایک شخص اگر آپ کے قریب رہ کر آپ کو نہ جان سکا نہ سمجھ سکا اور آج بھی اسے آپ پر یقین نہیں ہے تو اس کی ذمہ دار آپ کی ساس نند یا کوئی بھی تیسری ہستی نہیں ہے بلکہ اچھا ہو کہ آپ دل سے ان سب کو معاف کردیں۔ اس سے آپ کو سکون ملے گا اور یہ جو اتنی چھوٹی عمر میں آپ بڑھاپے کی باتیں کررہی ہیں۔ اپنے اندر نئی امنگ محسوس کریں گی۔ ساری پچھلی باتیں بھلادیں اس میں بہتری ہے۔

ایک ضروری بات ایک کی دس سنا کر کبھی بھی سکون نہیں ملتا بلکہ دل پر مزید بوجھ آگرتا ہے کم از کم ہمارے ساتھ تو ایسا ہی ہے۔ خاموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے، ویسے بھی آپ کے بچے بڑے ہورہے ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے وہ بھی ڈسٹرب ہوتے ہوں گے۔

اور یہ بھی نوٹ کرلیں اکثریت ساسوں کی ایسی نہیں ہوتی۔ بہت سے گھروں میں بہت خوشگوار ماحول بھی ہوتا ہے۔

ام کاشف۔ چکوال

تقریباً "عرصہ دس سال سے آپ کے تینوں ماہناموں کی خاموش قاریہ ہوں۔

خواتین و شعاع میں بہت سے ناول ایسے تھے جو دل کو چھو گئے جن میں "جنت کے پتے" سرفہرست ہے۔ بلکہ نمرہ احمد کی ہر تحریر دل پر اثر کرتی ہے۔ اب جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا، وہ ہے نگہت سیما کی منفرد تحریر (زمین کے آنسو) بے مثال رائٹر کی بے مثال تحریر۔ نگہت سیما میرے ہی شہر میں رہنے والی ہیں۔ میں ان سے رابطہ کرنا چاہتی ہوں۔

ج ام کاشف آپ اپنا فون نمبر لکھ کر بھجوادیں ہم نگہت کو دے دیں گے۔ نگہت آپ سے رابطہ کرلیں گی۔ خواتین کی

پسندیدگی کے لیے شکریہ

ساره مریم' طوبیٰ' ایشاع۔ چک NP,444 سنجر پور

ٹائٹل گرل اچھی تھی بس تھوڑی سادہ ہوتی۔ سب سے پہلے آمنہ ریاض کی تحریر ماہ تمام پڑھی۔ کیا خوب لکھتی ہیں آپ آمنہ جی! اتنی اچھی تحریر۔ ہمارے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ بہت بہت اچھی طرح تحریر ہے۔ ہمارے "تقریباً" سارے اندازے درست ہی نکل رہے ہیں۔ عنیزہ سید کے ناول میں ماہ نور کا انداز بہت اچھا لگا۔ عفت جی کی تحریر اچھی جارہی ہے۔ ماضی پڑھ کر اچھا لگ رہا ہے۔

"سائرہ رضا" کی تحریریں ہمیشہ بہت لمبی ہوتی ہیں اسی لیے کبھی نہیں پڑھیں۔ اس بار پڑھی بہت اچھی تھی۔ بالکل ہمارے گھر جیسا ماحول۔ ہمارے گھر میں بھی سارے لوگ تبلیغ پہ جاتے ہیں۔ ہم بھی جوائنٹ فیملی میں رہتی ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی ٹی وی نہیں ہے پر دو کمپیوٹرز ہیں۔ ان کی طرح ہم بھی چوری چھپے کوئی پنجابی مووی دیکھ لیتی ہیں جبکہ ضوفی ہمیں چھوٹی پھوپھو کی طرح لگتی ہے۔ خاص طور پر تب جب سیاست پر بحث کرتی ہے۔ گل افشاں رانا کی تحریر اچھی لگی۔ نعیمہ ناز کا افسانہ بہت زبردست تھا۔ بہت ہنسی آئی پڑھ کے۔ نازیہ جمال کا ناولٹ اچھا تھا۔ خواتین کی ڈائری میں لاریب کا انتخاب اچھا لگا۔ "میری خامشی کو بیاں ملے" میں کوثر خالد آپ کو پڑھ کر اچھا لگا۔ "میری بیاض سے" ثمینہ تنویر اور مہر گل کے شعر زیادہ اچھے لگے۔

ج مریم اور ایشاع! آپ کے اندازے درست ثابت ہوئے۔ وہ گاڑی سے ٹکرانے والی لڑکی ابیہا ہی ہے' یہ جان کر حیرت ہوئی کہ طوالت کی بنا پر آپ نے سائرہ رضا کی تحریریں نہیں پڑھیں۔ آپ کے پاس پرانے پرچے محفوظ ہوں تو انہیں نکال کر سائرہ رضا کی تحریریں پڑھیں۔ آپ کو یقیناً "افسوس ہوگا کہ پہلے کیوں نہیں پڑھیں۔

آمنہ ریاض اور دوسری مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

امبر گل۔۔۔ جھڈو

سال نو کا خواتین ملا تو ٹائٹل اچھا لگا' سروے میں رابعہ قادری اور قرۃ العین کے جوابات بہت اچھے لگے آغا عشنا شاہ کا انٹرویو ان ہی کے جیسا لاابالی سا لگا۔ پھر بڑھے اپنے فیورٹ سلسلے وار ناولز کی جانب' عنیزہ سید کی تحریر کی تعریف تو ممکن نہیں آفرین' آفرین۔ عفت جی کے ناول میں کہانی کے کرداروں پر سے آہستہ آہستہ پیاز کے چھلکے کی طرح پرتیں اتر رہی ہیں۔ صائمہ بشیر کا ناولٹ بہت ہلکی پھلکی کامیڈی' کچھ سنجیدہ سی نصیحتیں اور پانی والی بوتلوں کی ٹینشن' سب نے مل کر تحریر کو خوبصورت بنادیا تھا' پھر جناب باری آئی' نازیہ جمال کی اب یوں کرتے ہیں' میں حمیدہ خالہ کی بہو نے جتنے کام کر کر دکھائے' مجھے تو اسی وقت شک ہونے لگ گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تو ضرور ہوگی دراصل ہم سب ایسے ہی ہوگئے ہیں نا آج کل کہ نہ تو بہت زیادہ اچھائی + سچائی ہمیں ہضم ہوتی ہے اور نہ ہی برائی اور کام چوری پسند آئی ہے۔ نارمل سی تحریر لگی مجھے تو۔

ویسے اس بار خواتین کی سب سے بہترین تحریر مجھے گل افشاں رانا کا ناولٹ' میری محبت کا کارواں۔ شروع کے پیراگراف سے ہی تحریر نے دل کو چھو لیا گویا' اور نجانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ یہ جیسے کوئی سچی کہانی ہو' بالکل خود پر بیتی ہوئی ہر بات ہو۔

- "خانہ عنکبوت" اچھا لگا پھر طرز تحریر بہت شاندار تھا ثمینہ عظمت کا افسانہ بہت اچھا لگا دو صفحوں کے افسانے کو 100 پرسینٹ مارکس دیئے ہیں۔ ویسے ثمینہ جی ریکویسٹ ہے پلیز اچھا مزاحیہ سا ناول لکھیں نا پلیز کیونکہ پیاری فائزہ اور نمرہ کے مکمل ناولوں کو تو اب ہم ترس ہی گئے ہیں۔

خاتون کی ڈائری میں لاریب اور سعدیہ کی منتخب کردہ نظمیں دل کو بہت بھائیں' یاسرہ رضوی کا انٹرویو اچھا لگا بہت اچھی پرفارمر ہیں' سرما کے کھاجوں میں سے میں نے بھی ایک ترتیب ٹرائی کی یعنی آسان والی اور بریڈ کا حلوہ بنایا جو کہ میرے اور ابو جی کے حساب سے بہت شاندار رہا۔

ج پیاری امبر! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے سروے کے جوابات شائع نہ ہوسکے۔ تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔

نوشابہ منظور۔ بھریا روڈ

اس ماہ کا خواتین 5 کو ملا سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا' کچھ صفحات پلٹ گئے' پر نظر ڈالی پھر جلدی جلدی عنیزہ سید کے پاس بھاگے اس ماہ کی قسط میں دو انکشاف ہوئے ایک تو یہ کہ کھاری رابعہ آپا کا نہیں فلزا ظہور کا بیٹا ہے' دوسرا ماہ نور ہی سعد کے دل کی ملکہ ہے۔ اب اگلے ماہ کے خواتین کا انتظار ہے مکمل ناول ایک ہی تھا' وہ بھی اگلے ماہ کے ساتھ اس پہ تبصرہ اگلے ماہ ہی ہوگا۔ ماہ تمام بھی اچھا جارہا ہے تقی اور شفا کی فرش پہ بیٹھ کے کھانا کھانے کی سچویشن دیکھ کے ہنسی آئی۔ یوں کرتے ہیں بھی ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ اسیرذات پڑھ کے آنکھیں نم ہوگئیں۔

ہمارے نام میں فوزیہ ثمر بٹ اور انیقہ انا کی کمی محسوس ہوئی۔

ج پیاری نوشابہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ فوزیہ ثمر بٹ کا خط تو ہم شامل نہ کرسکے البتہ انیقہ انا نے بہت عرصہ سے خط نہیں لکھا۔ ہم بھی انہیں یاد کررہے ہیں۔

سائرہ عبید۔ ڈنگہ شہر

خواتین کی محفل مجھے بہت پسند ہے جہاں پر کوئی اپنی مرضی سے اپنا بیان ریکارڈ کروا سکتا ہے اور ایک خوبصورت محفل میں شرکت کرکے ایسا لگتا ہے کہ ہر کوئی (ہم میں سے) ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھا ہے اور خواتین ڈائجسٹ ہمارا موضوع بحث ہے۔

خواتین کے تمام سلسلے مجھے بہت بہت پسند ہیں۔ میں کہانیوں پہ تبصرہ نہیں کروں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواتین مجھے ابھی تک ملا ہی نہیں۔ شعاع اکر یکم دو یا تین کو مل سکتا ہے تو خواتین کیوں اتنا لیٹ ملتا ہے؟

ج پیاری سائرہ! ہمیں احساس ہے کہ خواتین ڈائجسٹ آپ تک بہت تاخیر سے پہنچتا ہے ہم کوشش کررہے ہیں کہ خواتین اور شعاع دونوں ساتھ ساتھ آپ تک پہنچ پائیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقراء۔ گوجرانوالہ

سب سے پہلے صفحات پلٹ گئے پڑھا رابعہ فیاض کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ لوگ اب تلاوت پاک کا بھی احترام نہیں کرتے پھر آنے والا وقت پڑھا علی کی بے بسی پر ہنسی آئی۔ میں نے پہلی بار ایسا پڑھا ہے کہ سسرال والوں سے ایک بیوی نہیں بلکہ شوہر تنگ ہے۔ ماہ تمام پڑھا۔ سماہر کے دماغ کی داد دینی پڑھے گی لیکن وہ اپنے کھودے کنویں میں خود ہی گر گئی۔ مجھے تو لگتا تھا کہ شفا کو چھوڑنے کی بات پہ شفا روئے گی لیکن کچھ نہیں۔ میں بھی تقی کی طرح حیران ہوئی۔ امی کی سات نمبر کی جوتی والی بات پڑھ کر مزا آیا کیونکہ میری بھی سات نمبر جوتی ہے (ہاہاہا)

شاہین رشید سے درخواست ہے کہ احمد شہزاد اور جنید خان کا انٹرویو لیں۔ میرے چھوٹے بھائی احمد نے کہا ہے کہ وہ میرے خط پوسٹ کردے گا۔

پیاری اقراء! صرف آپ ہی نہیں ہماری وہ تمام قارئین جو ہمیں خط لکھتی ہیں' ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ احمد آپ کا چھوٹا بھائی آپ کو لفافے لاکر دینے اور خط پوسٹ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے۔ اب آپ ہمیں ہر ماہ باقاعدگی سے لکھیے گا۔

آمنہ ریاض کے ناول میں شفا اور تقی دونوں ہی بہت مختلف اور منفرد کردار ہیں۔ ہمیں بھی کہانی کا یہ موڑ بہت اچھا لگا ہے۔ آمنہ بہت خوبصورتی سے ہلکے پھلکے انداز میں کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ نثار حسن۔ گوجرانوالہ

سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا لکھوں' کیسے لکھوں؟ اپنے احساسات وجذبات کو کیسے لفظوں کا روپ دوں۔ 15 دسمبر بھائی کی شادی کو پورے پانچ سال ہوئے' بھابھی جان بے تحاشا خوش کہ گزرے پانچ برس پانچ دن معلوم ہوتے ہیں۔ دوپہر کو دھوپ میں بیٹھی میرے ساتھ زندگی سے بھرپور قہقہوں کے ساتھ' رنگوں' موسموں' خوشبوؤں اور پھولوں کی باتیں کررہی ہیں کہ اچانک شام میں طبیعت

اعتذار

پچھلے ماہ بہن آمنہ سلیم نے معوذتین کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ پروف کی غلطی کی وجہ سے سورہ فلق اور سورہ افلاق لکھا گیا۔ قرآن پاک میں افلاق نام کی کوئی سورۃ نہیں ہے۔

معوذتین سورہ الفلق (قل آعوذ برب الفلق) اور سورۃ الناس (قل آعوذ برب الناس) کو کہتے ہیں۔

بگڑی یہاں (لدھیوالہ) گاؤں میں کوئی ڈاکٹر نہ ملا شہر گوجرانوالہ بھاگے۔ مگر سب بھاگ دوڑ لاحاصل۔ کاتب تقدیر نے ان کی زندگی کی ساعتیں اتنی ہی لکھی تھیں۔ قصور کس کا؟ یہاں ڈاکٹرز کی عدم موجودگی، اسپتال کی سہولت نہ ہونا کہ شہر جاتے جاتے بہت سے مریض رستے میں دم توڑ جاتے ہیں۔ میری بھابھی کم میری ماں مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ چار سالہ معصوم ارحم علی اور ڈیڑھ سالہ عبدالھادی کی صورت میں اپنا آپ ہمیں سونپ گئیں۔ مجھے کہتی ثنا کیا ہو تم اس عمر میں تو لڑکیاں ہنستی ہیں گیت گاتی ہیں اور تم اتنی اداس نہ رہا کرو۔ دیکھو میں کتنی زندہ دل ہوں۔ آہ۔ وہ زندہ دل لڑکی انہوں نے محض اپنی زندگی کی 26 بہاریں دیکھیں۔

اس دفعہ شمارے میں ابھی صرف ثمینہ عظمت علی کو پڑھا ہے۔ کیا خوب لکھا ثمینہ نے۔ پچھلی دفعہ بھی طنزو مزاح کے پیرائے میں لپٹی ان کی تحریر ——— "نشان محفل" شمارے کی سب سے بہترین تحریر تھی۔

ج ثنا! ہم آپ کے دکھ کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ آپ کی بھابھی کو فوری طور پر علاج کی سہولت نہ مل سکی، یہ واقعی بہت افسوس ناک ہے۔ دیہی علاقوں میں معمولی موسمی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی ڈاکٹر دستیاب نہیں ہوتا۔ کس کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائیں۔ حکومت قائم ہوئے دیر نہیں ہوتی اور تختہ الٹنے کی باتیں شروع ہوجاتی ہیں۔ منتخب حکمرانوں کا سارا وقت تو حکومت بچانے کی کوششوں کی نذر ہوجاتا ہے، وہ عوام کی بھلائی کے لیے کیا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی بھابھی کی مغفرت کرے اور ان معصوم بچوں کو آئندہ زندگی میں کوئی غم نہ دکھائے۔

ثمینہ واقعی بہت اچھا لکھتی ہیں خاص طور پر ان کی تحریروں میں پاکستان اور نظریہ پاکستان سے محبت کا جو رنگ جھلکتا ہے، وہ بہت اچھا لگتا ہے۔

رابعہ زماں۔ شاہراہ لاہور

افسانے سارے اچھے تھے لیکن سمیرا حمید کا "خانہ عنکبوت" دل کو چھو گیا۔ انہوں نے خدیجہ جیسی عورتوں کی گھٹن زدہ زندگی کو محسوس کروادیا، اس کے بعد اسیر ذات بھی اچھا تھا مگر اس کے اینڈ نے بہت اداس کیا، ناولٹ بھی اس دفعہ سارے ہی اچھے تھے۔ ماہ تمام کی اس دفعہ کی قسط پچھلی تمام اقساط کے مقابلے میں کچھ جاندار تھی۔ سب سے اچھا ہمیں محبتوں کا کارواں لگا۔

ہمارا فیورٹ ترین ناول "کوہ گراں تھے ہم" سستی کا شکار ہوگیا ہے۔ مکمل ناول "رفوگری" سائرہ رضا نے ہمیشہ کی طرح ایک مختلف اور قابل غور موضوع کو چنا، بڑی بے تابی سے اگلی اور آخری قسط کا انتظار ہے۔

ج پیاری رابعہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ پرانی مصنفین میں سے کچھ نے لکھنا چھوڑ دیا اور کچھ ٹی وی پر مصروف ہوگئی ہیں۔

رابعہ تحسین۔ ملتان

جنوری کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل میں صرف ماڈل کا ہیئر اسٹائل پسند آیا۔ لباس کچھ پرانا سا محسوس ہورہا ہے۔

"سروے" میں سے مجھے سیما ممتاز عباسی کے جوابات پسند آئے۔ "بن مانگی دعا" کی قسط اچھی ہے۔ عفت خوب محنت کررہی ہیں۔ "آنے والا وقت" کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں ناکام ہے۔ "اسیر ذات" دلشاد نسیم کی اچھی کاوش تھی۔ اینڈ میری توقعات سے بالکل برعکس ہوا۔

"اب یوں کرتے ہیں" پڑھ کر لبوں پر ہنسی آگئی۔ چلو بہرحال ٹھیک ہے۔

"خانہ عنکبوت" افسانوں میں سے بہترین افسانہ ہے۔ یہ ارشد صدیق جیسے صرف ذہنی مریض ہوتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔

"میری محبتوں کا کارواں" اچھا ناول ہے۔ افشاں نے اچھا لکھا۔

"ہوئے مر کے ہم جو رسوا" ثمینہ اپنے پرانے انداز میں لکھا کریں۔

"ماہ تمام" کی یہ قسط اچھی لگی۔ لیکن پلیز ایک بات کا دھیان رکھا کریں۔ نام کی ہیئت پر توجہ دیا کریں۔ ایک جگہ باقرلودھی کا نام "عبدالباقر" لکھا ہے جو کہ سراسر غلط ہے یہ بے احتیاطی بہت سنگین ہے۔ امید ہے آئندہ خیال رکھیں گی۔

واؤ! سائرہ رضا بھی حاضر ہیں۔ زبردست "اب کر میری رفوگری" کی یہ قسط تو پڑھ کر مزہ آیا۔

آپ سے ایک فرمائش ہے کہ پلیز ماہ نور بلوچ اور حسینہ معین کا انٹرویو ضرور شائع کریں ہوسکے تو بانو قدسیہ آپا کا تفصیلی انٹرویو بھی شائع کرنے کی کوشش کریں۔

ج رابعہ! آپ کی تعریف و تنقید کے لیے شکریہ۔

عبدالباقر واقعی غلط نام ہے آئندہ خیال رکھیں گے "کرن کرن روشنی" میں صحاح ستہ سے منتخب احادیث شائع کی جاتی ہیں۔ آپ اس کے لیے مضمون نہ بھجوائیں۔

انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچائی جارہی ہے۔

بشریٰ زین ـــــ اختر کرنانہ

ٹائٹل بہت خوب تھا۔ سب سے اچھا ثمینہ عظمت کا افسانہ لگا اور ناولٹ میں ماہ تمام۔ پہلے میاں پڑھنے نہیں دیتے تھے۔ اب وہ باہر چلے گئے ہیں تو۔

ج : پیاری بشریٰ! آپ میاں کی موجودگی میں ڈائجسٹ پر توجہ دیں گی تو وہ آپ کے پڑھنے پر پابندی تو لگائیں گے مرد عموماً" یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کی موجودگی میں ان کے علاوہ کسی اور پر توجہ دی جائے۔ آپ ڈائجسٹ کا مطالعہ اس وقت کریں جب وہ گھر پہ نہ ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رخسانہ عزیز ـــــ کلری ضلع چنیوٹ

سرورق بہت پیارا تھا۔ آغا عشنا شاہ سے ملاقات اچھی لگی۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول اچھا لگا۔ چلبلی سی تاباں مجاہد بہت کیوٹ لگی۔ ہمارے گاؤں میں تقریباً" سب لڑکیاں خواتین پڑھتی ہیں۔

ج : رخسانہ! بہت شکریہ۔

انعم ـــــ سکھر

دو دن پہلے پرچا ملا تو میں نے پورا پڑھ ڈالا ہے۔ جو کہانی بہت اچھی تھی۔

افراح ملک ـــــ چک 9 جنوبی ڈیانوالہ

خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میرے ٹیچر کا درجہ رکھتے ہیں۔ آج میں جو کچھ ہوں، ان کی بدولت ہوں۔

ج : افراح بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ شعاع اور خواتین سے آپ کو سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

شاہدہ مجید ـــــ خان پور

مجھے خواتین بہت پسند ہے۔ چودہ سال سے پڑھ رہی ہوں بلکہ آپ کے ادارے کے تینوں پرچے بہت پسند ہیں۔

ج : پیاری شاہدہ! خوش رہیں۔

رابی ـــــ شاہ جمال مظفر گڑھ

ڈائجسٹ سے رشتہ زیادہ پرانا نہیں مگر اس نے میری جو اصلاح کی ہے اس کا بیاں میں شدید لفظوں میں نہ کر سکوں۔ کوہ گراں تھے ہم اور ماہ تمام زبردست جارہے ہیں اور سائرہ رضا کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سائرہ رضا کمال لکھتی ہیں۔

ج : رابی! اس میں آپ کا بھی بڑا حصہ ہے، اچھی بات سن کر یا پڑھ کر وہی لوگ اثر لیتے ہیں جن میں اچھائی کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

ماہ وش ـــــ فیصل آباد

اس ماہ کا شمارہ لاجواب ہے۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔

ج : بہت شکریہ ماہ وش

سدرہ اصغر ـــــ L-95/15

"کوہ گراں تھے ہم" میرا فیورٹ ناول ہے۔ اب کر میری رفوگری سائرہ رضا جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں جاذب کی معصومیت، اس کی سوچ..... واؤ تاباں بہت لکی ہے۔

ج : پیاری سدرہ! اتنی جلد فیصلہ نہ کریں، تاباں کی قسمت کے بارے میں، یہ قسط پڑھ کر بتایئے گا کہ وہ کتنی خوش نصیب ہے اور کتنی بدقسمت۔



خبرگیا وگیں

واصفہ صابری



غنڈہ گردی

معروف (وار کے بعد کچھ کچھ مصروف) فلم اسٹار شان کہتے ہیں کہ پاکستان میں اردو کے مقابلے میں پنجابی فلموں کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے (چلو بھئی ایتھے تے گل ہی مک گئی) غنڈہ گردی پر مبنی فلموں میں کام کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں، فلم کے ہدایت کاروں کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مار دھاڑ کی جائے کیونکہ دیہاتی علاقوں میں ایسی فلموں کو پسند کیا جاتا ہے۔"

حالانکہ ایسا ہے نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر 'بول' 'خدا کے لیے' 'نکاح' اور 'موسیٰ خان' جیسی فلمیں کامیاب نہ ہوتیں۔

منفرد

جاوید شیخ ایک بار پھر اپنی نئی فلم کو منفرد اور عمدہ فلم کے طور پر فلم بینوں کے سامنے پیش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، جاوید شیخ کا اس بارے میں کہنا ہے کہ "وہ فلم بنانے کے لیے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے اسی لیے نئی فلم کے آغاز میں تاخیر ہوتی ہے لیکن اب جب کہ نئی فلم شروع کرنے کا ارادہ کرلیا ہے تو اس فلم کی موسیقی پر میری خصوصی توجہ ہے۔ (ہاں بھئی ہماری فلمیں میوزک کی بیساکھیوں پر تو چلتی ہیں اگر چلتی ہیں تو) کیونکہ فلم کی کامیابی میں میوزک اہم کردار ادا کرتا ہے میری پچھلی فلموں کے گیت بھی اس لیے ہٹ ہوئے کہ میں فلم کا میوزک منفرد انداز میں کرنا چاہتا ہوں۔

(جی ـــــ جی! انڈین گلوکاراؤں کی آواز میں) فلم میں پاک بھارت فنکاروں کو شامل کیا جائے گا۔



(جاوید جی! ان ہی فنکاروں کو، جنہوں نے آپ کو لیا تھا؟)

اکیڈمی

علی ظفر کا ان خوش قسمت فنکاروں میں شمار ہوتا ہے جنہیں پاکستان کے ساتھ ساتھ انڈیا میں بھی بہت پذیرائی ملی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں گلوکاری کے شعبے کو مضبوط بنانے کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات ضروری ہیں (علی ظفر! آپ بغیر حکومتی مدد کے انڈیا تک میں شہرت حاصل کرچکے ہیں) ورنہ گلوکاری کا شعبہ بھی فلم انڈسٹری جیسی مشکلات کا شکار ہو جائے گا۔ (حکومت کو کرنے کے کم کام ہیں۔ جو یہ بھی؟) اس لیے اس شعبے کو فعال بنانے کے لیے حکومتی سطح پر اکیڈمی کا قیام ضروری ہے۔ (بھئی آپ کھول لیں نا اکیڈمی ہر کام حکومت پر ڈالنے کا انجام..... آپ خود ہی دیکھ لیں۔)

تبدیلی

گزشتہ سال ریلیز ہونے والی فلم وار نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی یہی وجہ ہے کہ اب اس کا سیکوئل بنانے کی تیاری کی جا رہی ہے اور وار ۔ ٹو میں عائشہ





خان کی جگہ ماڈل اداکار عائشہ عمر جلوہ گر ہوں گی۔ عائشہ عمر آج کل بہت خوش ہیں کیونکہ ماڈلنگ، ٹی وی پہ اداکاری اور گلوکاری کے ساتھ ساتھ اب وہ فلم میں ہوں شاہد آفریدی کے مختصر سے کردار کے ذریعے فلم میں بھی انٹری دے چکی ہیں۔ عائشہ عمر کا کہنا ہے کہ اس فلم کی وجہ سے میں اپنے ٹی وی پروجیکٹ جلدی جلدی مکمل کروا رہی ہوں (ہاں کہیں کوئی اور ہی یہ کردار نہ لے اڑے) کیونکہ پاکستانی فلموں میں کام کرنے کے لیے یہ وقت بڑا اچھا ہے (جس کو کام مل جائے اس کے لیے)

خوش قسمتی

گلوکار عدیل چوہدری کو بھارتی پروڈیوسر ویویک کمار نے اپنی فلم "ردھ" میں بطور ہیرو کاسٹ کیا ہے (کیا ہو گیا گلوکار سے اداکاری ـــــ؟ اس فلم میں انہوں نے سلمان احمد (جو کہ جنون فیم ہیں) کو بھی ایک مختصر سا رول دیا ہے ساتھ ساتھ سلمان احمد نے فلم کے دو گانے بھی گائے ہیں۔ عدیل چوہدری نے بھی اس فلم میں ایک گانا گایا ہے۔ عدیل آج کل بہت خوش ہیں کہ انہیں انڈین فلم میں کام کرنے کا موقع ملا۔ کہتے ہیں کہ

وویک کمار جیسے ہدایت کار کے ساتھ کام کرنے کا موقع میرے لیے خوش قسمتی کا باعث ہے فلم کا میوزک دل کو چھو لینے والا ہے۔ کیونکہ یہ ایک میوزک لو اسٹوری ہے (جب ہی انہوں نے سارے گلوکار بھر لیے..... وہ بھی ہمارے!)

کوشش

مشہور ڈراما نگار سیما غزل نے کہا ہے کہ "ملک کی موجودہ صورت حال میں جب ہر شخص ذہنی اذیت کا شکار ہے (کیا آپ کے لکھے ڈرامے دیکھ دیکھ کر؟) ہمیں اپنے ڈراموں اور فلموں میں ایسے موضوعات دکھانے کی کوشش کرنی چاہیے جس کے مثبت اثرات ہوں (کاش ڈراما لکھتے وقت آپ یہ بات یاد رکھیں) انہوں نے مزید کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ ہماری فلموں میں اس طرف توجہ دی جا رہی ہے (اور ڈراموں میں ......؟)

اعلان

وینا ملک نے کہا ہے کہ وہ شوبز نہیں چھوڑ رہی ہیں اور نہ ہی ان کا مستقبل میں ایسا کچھ کرنے کا ارادہ ہے (سارے مولانا سن لیں!) پاکستان انڈسٹری نے ہی انہیں "زاہدہ بی بی" سے وینا ملک بنایا ہے (کیا خوب بنایا ہے!) وینا ملک نے فلم بنانے کا بھی اعلان کر دیا ہے جس کی کہانی وہ خود لکھ رہی ہیں (یا اللہ خیر) اور اس کا ڈائریکٹر پاکستانی ہو گا (یقیناً "انڈین تو یہ غلطی کرنے سے رہے) ہاں فلم میں اداکار دونوں ممالک سے لیے جائیں گے (آخر وینا ملک کو حق بھی تو ادا کرنا ہے ناں) لیکن اس سے پہلے وینا اپنے شوہر اسد بشیر خٹک کے ہمراہ عمرے پر پہنچ گئی ہیں پھر امریکا میں ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا جائے گا۔ وینا ملک کی خواہش تھی کہ امریکہ میں جب ان کی شادی ہو تو وہ سفید برائیڈل ڈریس میں ملبوس ہوں اور اب ان کی یہ خواہش پوری ہونے جا رہی ہے (کیا پاکستان میں وائٹ برائیڈل ڈریس نہیں پہن سکتی تھیں وینا......؟)

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ اللہ سے تو معافی کا طلب گار ہوں ہی مگر وہ جن کا قصور وار ہوں جن کے گھر امریکی فوج کے ہاتھوں تباہ ہوئے کہ میں پاکستان اور امریکہ کے اس گٹھ جوڑ میں مجرم ہوں اور ان پاکستانیوں سے بھی جنہیں دین کی راہ سے موڑ کر کفر کی راہ پر لگانے کی کوششیں آج بھی جاری ہیں اور وہ بھی جن کے بچے آج ہماری ہی فوج قتل کرتی ہے کہ آج امریکا سے جوڑا ہوا ناتا ہمیں اس مقام تک لے آیا ہے۔

(جنرل شاہد عزیز کا اعتراف..... یہ خاموشی کہاں تک)

☆ یہ لبرل جو آج یک زبان ہو کر فوج کی محبت میں دیوانے ہو رہے ہیں یہ لوگ طالبان کے تو مخالف ہیں لیکن بلوچ علیحدگی پسندوں کے اس عمل پر خاموش بلکہ خوش ہیں۔ حکیم اللہ محسود کو شہید کہنے پر سیخ پا ہیں لیکن نواب اکبر بگٹی کو خود شہید کہتے ہیں۔ حکیم اللہ محسود تو امریکی ڈرون میں نشانہ بنے ہیں جبکہ نواب اکبر بگٹی پاکستانی فوج کے ساتھ جنگ میں مرے ہیں۔

(سلیم صافی، جرگہ)

☆ گزرے اکتوبر میں نبیلہ کی بے گناہ دادی امریکہ کے ڈرون حملے میں ماردی گئی۔ نبیلہ بھی اس حملے میں زخمی ہوئی تھی۔ نبیلہ نے امریکی کانگریس کے ارکان کو ظلم کی ایسی داستان سنائی جس سے مترجم بھی رو پڑی۔ ملالہ کے ابا کے شیدائی امریکی صحافیوں نے کانگریس کمیٹی کی اس بریفنگ کا بائیکاٹ ہی نہیں بلکہ بلیک آؤٹ کیا۔

(بابر اعوان..... وکالت نامہ)

☆ تنخواہ لینے والا سپاہی شہادت کے متلاشی کا سامنا کرتے گھبراتا، آمنے سامنے مقابلے میں مجاہدین کا ہاتھ ہمیشہ بھاری رہتا۔

(جنرل شاہد عزیز..... یہ خاموشی کہاں تک)

☆ ایک محب وطن کا فون آیا ہے۔ آواز سے پریشان، پوچھنے لگا ہمارے صوبے میں شورش برپا ہے اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے فوج آئے تو ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟"

بنگلہ دیش میں عبدالقادر ملا کی پھانسی نے سوچنے اور پرکھنے کے انداز تو بدل لیے تھے۔

(حفیظ اللہ نیازی)

آپ کا باورچی خانہ

روبی گیلانی

ہماری والدہ مرحومہ کو ہر وقت یہی پریشانی کھائے جاتی کہ پتنگیں اڑانے والی، کرکٹ کھیلنے والی، بندر قلعہ کھیلنے والی یہ لڑکا نما لڑکی کیسے گھر اور کچن سنبھالے گی۔ گھنٹہ گھنٹہ سمجھانے کے بعد یہ بات کہہ کر خاموش ہو جاتیں۔

"چاچوں کی بگڑی، ماموؤں کی لاڈلی۔ کبھی نہیں سُدھرے گی۔"

وقت گزرتا چلا گیا۔ ایک دن اسکول سے واپس آئی تو ماں بخار سے تپ رہی تھیں۔ سارے کام ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ بستہ رکھا، وردی اتاری، جھاڑو پکڑی اور آناً "فاناً" صفائی کر دی۔

پھر فرائی پان میں دو آلو کاٹ کر سبز مرچ، ٹماٹر، نمک، ہلدی، گھی ڈال کر چولہے پر فرائی کر لیا۔ آٹا گوندھ کر چھوٹی چھوٹی روٹیاں بنالیں۔

جی ہاں..... چوتھی کلاس میں پڑھتی تھی اس وقت میں۔

ماں بہتے آنسوؤں کے درمیاں دیکھتی رہیں اور مجھے گلے سے لگا کر بہت روئیں کہ تو تو بہت سمجھ دار ہے۔

جی ہاں! میرا نام روبی گیلانی ہے۔ فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ سے تعلق ہے۔ ہم صرف دو بہنیں ہیں، راحیلہ گیلانی، امی اور بابا..... چھوٹے سے کنبے میں امی نے بے وفائی کی، بہت خاموشی سے شہر خموشاں کی مکین بن گئیں۔ ہیپاٹائٹس کی بیماری سے لڑنے والی میری ماں بہت بہادر خاتون تھیں۔

ماں کی وفات کے بعد شادی جلد اور ایمرجنسی ہوئی۔ میاں صاحب بہت چٹورے واقع ہوئے ہیں۔ اللہ نے اولاد جیسے انعامات سے نوازا۔ دو بیٹے علی فواد گیلانی اور علی برہان گیلانی بہت لاڈلے اور کھانے کے شوقین ہیں۔

ماں نے بچپن سے ہی عادت پختہ کروائی، قرآن اور نماز (الحمد اللہ) تہجد کی ادائیگی کے بعد نماز فجر تک تلاوت کرتی رہتی ہوں۔ وظائف مکمل کرتی ہوں پھر کچن کا رخ کرتی ہوں۔ ناشتا سادہ سا ہوتا ہے۔ مگر ہفتہ اور اتوار کو ناشتا اسپیشل ہوتا ہے۔

آلو کے اسپیشل پراٹھے

ترکیب :

رات کا گوندھا ہوا آٹا بالکل پتلا کرلیں۔ اس میں ایک آلو باریک کاٹ کرملالیں۔ تھوڑی سی چوپ کی ہوئی پیاز' ہرا دھنیا' ہری مرچ' نمک اور ثابت دھنیا بھی کوٹ کرملالیں۔ اس آمیزے کو توے پر ڈالیں' توے پر ڈالنے سے پہلے توے پر گھی لگانا نہ بھولیں۔ جب ایک طرف سے پک جائے تو اس کے اوپر گھی لگا کر سائیڈ پلٹ دیں۔ سنہری ہونے پر اتارلیں۔

دہی میں زیرہ اور نمک ڈال کر پھینٹ لیں۔ پراٹھوں کے ساتھ یہ بہت مزا دے گا۔ میرے بچے اور میاں بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

مکئی کی روٹی اور لسی کی چٹنی

ترکیب :

توا آگ پر رکھیں۔ ایک پیالہ مکئی کے آٹے میں ذرا سا نمک ڈال کر گوندھ لیں اور ذرا موٹا سا پیڑا بنا کے توے کے اوپر رکھیں اور ہاتھوں کی مدد سے ذرا ذرا سا توے پر پھیلا دیں۔ روٹی پکا کر اتارلیں۔

پتھر کی بڑی کونڈی میں ثابت سرخ مرچ' لہسن اور نمک ڈال کر کوٹ لیں۔ یہ مصالحہ گاڑھی لسی میں ڈال دیں اور مکئی کی روٹی بھی انگلیوں کی مدد سے چُورا کر کے ڈال دیں۔ پھر چمچ سے کھائیں اور کرارہ سا مزہ لیں۔

سردیوں کی سوغات' سوہن حلوہ!

ضروری اجزا :

دودھ	دس کلو
گندم کا آٹا	آدھا پاؤ
گڑ یا چینی	حسب ذائقہ

بادام' مونگ پھلی' کش مش حسب ذائقہ

ترکیب :

دودھ میں پسا ہوا آٹا ہاتھوں کی مدد سے گھول لیں۔ ساتھ تھوڑا سا عام سا آٹا بھی مکس کرلیں اور پھر آگ پر رکھ دیں۔ چمچہ برابر چلاتے جائیں۔ ذرا سا گاڑھا ہونے پر چینی شامل کردیں۔ اور جب آمیزہ اکٹھا ہو جانے لگے تو نیچے اتارلیں۔ میوہ ڈال دیں۔ الگ سے رکھی پراتوں میں پہلے گرم گھی لگالیں اور پھر ان میں آمیزہ ڈال کے پھیلا دیں۔ گرم گرم حلوے کو ٹکیوں کے مطابق نشان لگالیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ٹکیاں علیحدہ کرلیں۔ مزے سے کھائیں اور مجھے دعائیں دیں۔

کھانا بناتے ہوئے چند اصول ہیں میرے جو مجھے میری ماں نے سکھائے۔ ان ہی کی بدولت آج میں کامیاب ہوں۔ پیڑا بنانے سے لے کر تندور میں روٹی لگانے تک۔

(1) کچن میں ہمیشہ وضو کرکے جاتی ہوں۔
(2) سر ڈھانپ کے رکھتی ہوں۔
(3) بسم اللہ پڑھ کر برتن اٹھاتی ہوں۔
(4) درود پاک پڑھتے ہوئے پکانے کا عمل جاری رکھتی ہوں۔
(5) کھانا پکاتے ہوئے فضول بات چیت نہیں کرتی۔
(6) کبھی بھی کھانا پکاتے ہوئے درمیان میں کوئی دوسرا کام نہیں کرتی۔
(7) کھانا پکا کر درود پاک پڑھ کر پھونک مار کے کچن کا دروازہ بند کرتی ہوں۔
(8) سب سے پہلے غریب پڑوسی کا حصہ نکال کے خود دیتی ہوں۔ ان کی دعائیں اور اللہ کی مہربانی اور کھانے میں برکت۔



رات کے کھانے پر

صبا سحر

گھروں میں عموماً" دوپہر کی نسبت رات کے کھانے پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ کیونکہ رات کے کھانے پر گھر کے سب افراد بالخصوص مرد حضرات موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مہمانوں کی غیر متوقع آمد کے بھی امکانات ہوتے ہیں۔ ایسے میں کچھ اچھا اور کچھ نیا کر کے داد پانے کی کوشش میں ہم ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

پوٹلی نہاری

ضروری اجزا :

گوشت	ایک کلو
نلی	ایک عدد
ثابت گرم مسالا	حسب ضرورت
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
آٹا	آدھا کپ
نمک/تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کرکے گوشت اور نلی بھون لیں' پھر نمک' لہسن ادرک پیسٹ' سرخ مرچ اور ہلدی ڈال کر مکس کریں۔ سونف' چھوٹی بڑی الائچی' لونگ' دار چینی' زیرہ' بادیان کے پھول ململ کے کپڑے میں ڈال کر پوٹلی بنالیں اور گوشت میں پانی کے ساتھ ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ پانی خشک ہو جائے اور گوشت گل جائے تو نلی نکال کر گودا الگ کرلیں۔ ایک کپ پانی میں آٹا گھول کر گوشت میں شامل کردیں۔ نہاری گاڑھی ہونے لگے تو پوٹلی نکال دیں۔ اور نلی ڈال کر کترے ہوئے ہرے دھنیے اور ہری مرچ سے گارنش کرکے گرم گرم تندوری روٹیوں کے ساتھ پیش کریں۔

کوئی نئی ترکیب آزمانا چاہیں تو بنائیں لاشولی گوشت۔

تیل گرم کرکے کڑی پتا اور ثابت گرم مسالا ڈال کر تھوڑا سا فرائی کریں اور الگ نکال لیں۔ اسی تیل میں پیاز براؤن کرکے لہسن ادرک پیسٹ کے ساتھ نمک، ہلدی، پسی سرخ مرچ اور گوشت ڈال دیں۔ گوشت گل جائے تو باریک کٹے ٹماٹر اور ہری مرچ ڈال کر خوب بھونیں۔ روغن آجائے تو تھوڑا سا پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ پیش کرتے وقت پسا گرم مسالا اور فرائیڈ کڑی پتے اوپر سجادیں۔ مزے دار لاشولی گوشت تیار ہے۔

شلجم کے کباب

ضروری اجزا :

سفید شلجم	ایک کلو
چنے کی دال	آدھی پیالی
انڈا	ایک عدد
ڈبل روٹی	دو سلائس
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
نمک/ تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

شلجم چھیل کر دھولیں، پھر ابال کر پانی الگ کرلیں اور کانٹے کی مدد سے بھرتہ بنالیں۔ چھلنی میں رکھ دیں تاکہ اضافی پانی بھی نکل جائے۔ چنے کی دال میں چھ لہسن کے جوے، ادرک کا ایک بڑا ٹکڑا، سلائس اور چھ ثابت سرخ مرچ ڈال کر ابال لیں، پھر پیس کر شلجم میں ملادیں۔ کارن فلور اور انڈا بھی آمیزے میں ملادیں۔ ہری مرچ، پودینہ، دھنیا اور ایک پیاز باریک کاٹ کر مکس کریں اور گیلے ہاتھوں سے کباب بنا کر ہلکی آنچ پر ہلکے تیل میں تل لیں۔

کچھ منفرد کرنا چاہیں تو گولڈن کوائن بنائیں..... ایک کپ مٹر کے ساتھ دو آلو ابال کر میش کریں، پھر اس میں آدھا کپ ہری پیاز نمک اور سرخ مرچ ملالیں۔ ڈبل روٹی کو کٹر کی مدد سے گول کاٹ لیں۔ سلائس کو درمیان میں رکھ کر دونوں طرف آلو کا آمیزہ لپیٹ دیں۔ بیسن میں نمک مرچ ملا کر گھول لیں۔ آلو بریڈ کا کباب بیسن کے آمیزے میں لپیٹ کر فرائی کریں۔ گولڈن ہو جائے تو ٹشو پیپر پر نکال لیں اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

پوٹھوہاری پلاؤ

ضروری اجزا :

گوشت	آدھا کلو
ابلے سفید چھولے	ایک کپ
کشمش اور خشک خوبانی	پانچ کھانے کے چمچے
آلو/ شملہ مرچ	ایک ایک عدد
چاول	آدھا کلو
نمک/ تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

خوبانی اور کشمش کو آٹھ دس گھنٹے پہلے بھگودیں اور بیج نکال کر لمبائی میں کاٹ لیں۔ گرم تیل میں پیاز، لہسن چوپ کرکے ڈالیں پھر گوشت کے ساتھ زیرہ، دار چینی، سرخ پسی مرچ، ہلدی اور نمک ڈال کر بھونیں اور پانی ڈال کر گوشت گلنے کے لیے رکھ دیں۔ پھر آلو گلانے کے بعد چنے ڈال کر بھونیں۔ آخر میں چاول اور چار کپ پانی ڈال دیں۔ پانی خشک ہو جائے تو دم پر رکھ دیں۔ لمبائی میں کٹے ٹماٹر اور شملہ مرچ اور خوبانی و کشمش اوپر پھیلادیں۔ پیش کرتے وقت مکس کریں۔

چکن وائٹ میکرونی

ضروری اجزا :

چکن بون لیس	ایک کپ
ابلے ہوئے مٹر/ میکرونی	ایک ایک کپ
میدہ	دو کھانے کے چمچے
کریم اور دودھ	آدھا آدھا کپ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک/ سفید مرچ	حسب ذائقہ

ترکیب :

ایک چمچہ لہسن پیسٹ کے ساتھ چکن فرائی کرکے نکال لیں۔ اسی ساس پان میں مکھن، ایک چمچہ تیل اور میدہ ڈال کر ہلکی آنچ پر بھونیں، پھر دودھ، نمک اور سفید مرچ شامل کرکے پکائیں۔ آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو مٹر، میکرونی اور چکن ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

ڈرائی فروٹ پاستا بنانا چاہیں تو ایک پیکٹ پاستا ابال لیں۔ ایک پاؤ چکن کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کرلیں۔ ساس پان میں ایک چمچہ لہسن پیسٹ فرائی کرکے چکن، نمک، پسی سیاہ مرچ، چوپ کی ہوئی چار ہری پیاز، ایک کپ ابلے ہوئے مٹر اور آدھا کپ کترا ہوا میوہ ڈال کر فرائی کریں۔ پھر میکرونی یا پاستا شامل کرکے مزید دو منٹ فرائی کریں، پھر ڈش میں نکال لیں۔

فروٹ کریم ڈیلائٹ

ضروری اجزا :

دودھ	آدھا کلو
کریم	آدھا کپ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
چینی	آدھا کپ
خربوزہ، سیب، انار، کیلا	ایک ایک کپ

ترکیب :

دودھ گرم کریں۔ ساتھ ہی چینی ملادیں۔ آدھا کپ دودھ میں کارن فلور گھول کر وہ بھی پکتے دودھ میں شامل کردیں۔ گاڑھا ہو جائے تو اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ ڈش میں پہلے گاڑھا دودھ ڈالیں، پھر کیوبز میں کٹے فروٹس کے ساتھ آدھی کریم ڈال کر مکس کریں پھر باقی کریم اوپر ڈال کر فریج میں رکھیں اور ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

گرین سوپ

ضروری اجزا :

کھیرا	ایک عدد
پالک	ایک کپ
یخنی	تین کپ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب :

پالک اور کھیرا ابال کر چوپ کرلیں اور یخنی میں نمک، کٹی سیاہ مرچ، سویا ساس کے ساتھ دس منٹ تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ آدھا کپ ٹھنڈے پانی میں کارن فلور گھول کر سوپ میں شامل کردیں۔ گاڑھا ہو جائے تو کریم پھینٹ کر ڈال دیں اور گرم گرم پیش کریں۔

اسپگیٹھی ٹماٹو سوپ بنانا چاہیں تو دو کھانے کے چمچے مکھن میں پیاز فرائی کریں، پھر ایک کپ ٹماٹو پیسٹ اور چار کپ یخنی ڈال کر پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو نمک اور پسی سیاہ مرچ ڈال دیں۔ ڈش میں پہلے ابلی ہوئی اسپگیٹھی پھر سوپ ڈالیں۔ پودینے کے پتوں سے سجاوٹ کریں اور پیش کریں۔

چیز ویجی سوپ بنانا چاہیں تو مکھن میں پیاز نرم کریں۔ ایک کپ بند گوبھی، ایک کپ ابلے آلو کے کیوبز، ایک تیز پتا اور تین کپ بیف یخنی ڈال کر ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ پکائیں۔ باؤل میں نکال کر اوپر سیاہ مرچ اور کدو کش کیا ہوا پنیر ڈالیں اور ڈبل روٹی کے سلائس کے ساتھ پیش کریں۔

☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل	نیلم منیر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

شبانہ.... بہاول پور

آج سے دس سال پہلے میری شادی ہوئی' اس وقت میری عمر 24 سال تھی۔ خوش شکل' سلیقہ مند تھی۔ بی اے تک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ شوہر دور پرے کے رشتہ دار تھے۔ ایک شادی میں ان کی والدہ نے مجھے دیکھا اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کرلیا۔ گھر والوں نے لڑکے کے بارے میں مناسب چھان بین کی' اچھی ملازمت تھی۔ تین بھائی تھے۔ یہ سب سے چھوٹے تھے۔ ایک ہی بہن تھی' اس کی شادی بھی ہوچکی تھی.... ہر لحاظ سے رشتہ مناسب تھا۔ گھر والوں نے ہاں کردی۔ منگنی تقریباً" چھ ماہ رہی' اس دوران انہوں نے کبھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ عید' بقر عید' سالگرہ کے موقع پر بھی کبھی ایک میسج تک نہیں کیا' مجھے یہ بات کچھ عجیب تو لگی کیونکہ ہمارا گھرانہ اگرچہ بہت ماڈرن نہیں' لیکن منگنی کے بعد فون پر بات پر بات کرنے یا میسج کرنے پر منع نہیں کیا جاتا۔ شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ شادی کی تقریبات میں رسموں کے دوران بھی وہ بہت سنجیدہ نظر آئے جبکہ ان کے بارے میں یہ سنا گیا تھا کہ بہت بولتے ہیں۔

شادی کے بعد ان کا رویہ بظاہر نارمل تھا' لیکن مجھے ایک بات کھٹکتی تھی۔ وہ انتہائی نپی تلی بات کرتے اور میری طرف سے والہانہ جذبات کے اظہار کے باوجود ان کا چہرہ بالکل بے تاثر رہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا ان کا مزاج ہی ایسا ہے یا اس سرد مہری کی کوئی وجہ ہے۔ ہمارے ہاں کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی کیونکہ میرے شوہر اولاد نہیں چاہتے تھے۔ معاشرے کی عام سوچ کے مطابق اس کا الزام بھی میرے سر آیا پھر ان کے والد کا انتقال ہوگیا' والد کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک دن یہ کہہ کر میرے سر پر بم پھوڑ دیا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں' میں ہکا بکا رہ گئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک لڑکی کو چاہتے ہیں جو ان کے ساتھ کام کرتی ہے اس کا تعلق دوسرے مسلک سے تھا' ان کے والد راضی نہ تھے۔ والد کی مرضی کے خلاف شادی کرتے تو جائیداد سے بے دخلی کا ڈر تھا۔ اس لیے خاموشی اختیار کی۔ میں اس شخص کو دیکھتی رہ گئی۔ آٹھ سال تک اس شخص نے مجھے اپنے ارادوں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ مجھے ماں نہ بننے دیا۔ میرے جائز حق سے مجھے محروم رکھا۔ دل خون ہوگیا۔ ساری باتیں یاد آنے لگیں ان کا روکھا رویہ' نپا تلا انداز' خاموشی جسے میں ان کی عادت سمجھتی رہی۔ میرا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ انہوں نے کہا' اگر میں انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دوں تو ٹھیک ہے ورنہ وہ مجھے طلاق دے کر دوسری شادی کرلیں گے۔

میرے پاس کوئی دوسرا ٹھکانہ نہ تھا۔ والد کا انتقال ہوچکا تھا۔ والدہ بھائیوں کی محتاج' کہاں جاتی۔ دل پر پتھر رکھ کر دوسری شادی کی اجازت دے دی' ویسے بھی یہ شخص تو کبھی بھی میرا نہ تھا۔ وہ میرے بے اولاد ہونے کا جواز دے کر دوسری شادی کرلائے۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ نہ چھن جائے' صرف اس ڈر سے مجھے اپنی زبان بند رکھنا پڑی۔ دو سال پہلے ان کی دوسری شادی ہوئی۔ اس کے بعد سے ایک دن بھی ایسا نہ گزرا جب میں نے سکون کا سانس لیا ہو۔ ان کی دوسری بیوی مجھے ایک لمحہ کے لیے برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے اسے طلاق دے کر گھر سے نکالو کیونکہ ابھی تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی ہے۔ شاید اس کو ڈر ہے کہ بے اولادی کی وجہ

سے میرے شوہر میری طرف متوجہ نہ ہوجائیں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں؟

ج : عزیز بہن! آپ نے اتنا عرصہ خاموشی سے گزار دیا اور کبھی بھی اصل بات جاننے کی کوشش نہ کی جبکہ آپ کو اولاد نہ ہونے کی بنا پر اس کے گھر والوں کے طعنے بھی سننا پڑے۔ یہ مجرمانہ خاموشی تھی۔ آپ کو کم از کم اپنی پوزیشن ضرور صاف کرنا چاہیے تھی۔ ہوسکتا ہے کہ شوہر کے عزائم اس وقت سامنے آجاتے۔

جس طرح کے حالات میں آپ رہ رہی ہیں' شوہر کسی بھی وقت آپ کو چھوڑ سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنی تعلیمی قابلیت بڑھائیں۔ کوئی کورس یا ڈپلوما کریں تاکہ کہیں جاب کرسکیں۔ آپ کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ کوئی بھی دوسرا راستہ نکل سکتا ہے۔ اس شخص نے تو آپ کو کچھ بھی نہیں دیا اور آپ کے دس سال ضائع کردیے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے لیے کچھ سوچیں۔

نام نہیں لکھا

ج : آپ نے اب تک جو زندگی گزاری ہے اس پر جتنی ملامت کی جائے کم ہے۔ بنت حوا کا یہ روپ لرزہ خیز ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک جو کچھ آپ کرتی رہی ہیں' اس کے ذمہ دار اگرچہ آپ کے والدین بھی ہیں' لیکن اب جبکہ شادی شدہ ہیں' تین بچوں کی ماں ہیں' اب اس بے راہ روی کا کوئی بھی جواز نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ذہنی کج روی ہے اور بے راہ روی ہے۔

جسے آپ عشق سمجھ رہی ہیں اسے عشق تو کجا محبت' لگاؤ' انسیت کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔ آپ نے لکھا ہے۔ "اسے بھولنے کے لیے اپنے خاوند کے بھتیجے سے تعلق جوڑ لیا مگر اسے بھولنے میں ناکام رہی اس کی ایک ایک بات دل میں آگ لگاتی ہے۔"

یہ کیسا عشق ہے۔ جو آپ کو مزید بے راہ روی کی طرف لے جارہا ہے۔

آپ کی بے چینی' بے قراری اور پریشانی صرف اتنی ہے کہ وہ آپ کو چھوڑ چکا ہے جبکہ اس سے پہلے یہ کام آپ کرتی رہی ہیں۔ بقول آپ کے۔

"میرا پہلا دوست اس سے زیادہ خوب صورت تھا' مگر اس کے صرف ایک جملہ کے لیے اسے چھوڑ دیا۔ اس کا میرا ساتھ 17 سال کا تھا۔"

وہ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہے۔ سیدھی راہ چلنا چاہتا ہے اور آپ کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے۔ کتنی عجیب بات لکھی ہے آپ نے کہ "صبح آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال اس کا آتا ہے' میں اسے کیسے بھولوں؟" ایک ماں کو پہلا خیال اپنے بچوں کا آتا ہے۔ ان کی پڑھائی' ان کا مستقبل.... آپ کی بیٹیاں بڑی ہوگئی ہیں اسکول جاتی ہیں' کبھی ان کے بارے میں سوچا؟ ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ آپ کی "داستانیں" ان تک پہنچیں گی تو کیا وہ سر اٹھانے کے قابل رہ جائیں گی؟

آپ اپنے شوہر کی ٹانگیں تڑوانا چاہتی ہیں' وہ آپ کے لیے کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو یہ نہ بھولیں کہ وہ آپ کے بچوں کا باپ ہے۔ دو ماہ بعد آپ کا شوہر آنے والا ہے۔ اپنا گھر بچائیں' اس سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ آپ کرتی رہی ہیں اور اب بھی کررہی ہیں اس میں دین و دنیا کا خسارہ ہے۔





امتہ الصبور

بیوٹی بکس

سعدیہ..... نامعلوم شہر

س۔ میرے چہرے پر بلیک ہیڈز (کیل) بہت ہیں اور چہرے پر سرخ سرخ دانے بنتے ہیں جو بعد میں نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ میرے چہرے پر جھائیاں بھی ہیں۔ شادی سے پہلے رنگ گورا تھا شادی کے بعد چہرہ اور رنگ خراب ہوا۔ میں آج تک پارلر نہیں گئی۔ ہمارے ہاں کوئی بیوٹی پارلر نہیں ہے۔ میں دیہات میں رہتی ہوں۔ میری عمر چھبیس ستائیس سال ہے۔

ج۔ سعدیہ! آپ سب سے پہلے تو اپنے چہرے کی صفائی کا خیال رکھیں۔ کیل مہاسوں کا سب سے بڑا سبب چہرے کی صفائی کا خیال نہ رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ معدے کی خرابی، ہارمونز کا ڈسٹرب ہونا اور سر کی جلد پر خشکی، سکری بھی اس کی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

آپ درج ذیل مشوروں پر عمل کر کے ان سے نجات حاصل کر سکتی ہیں۔

1۔ سب سے پہلے بھاپ لیں، بھاپ سے کیل نرم پڑ جائیں گی اب انہیں آہستہ سے دبا کر نکال دیں۔

2۔ اپنے معدے کا خاص خیال رکھیں، ہلکی غذا استعمال کریں تلی ہوئی ثقیل اشیا سے پرہیز کریں۔

3۔ آج کل کینو کا موسم ہے۔ اگر ممکن ہو تو کم از کم ایک کینو روزانہ ضرور کھائیں۔ سیب اور کینو کا زیادہ سے زیادہ استعمال آپ کی جلد کو تر و تازہ رکھے گا اور جھائیاں بھی دور ہو جائیں گی۔

4۔ کسی صورت بھی قبض نہ ہونے دیں، مہاسوں کا ایک بڑا سبب قبض بھی ہے۔ روزانہ آدھا گھنٹہ پیدل چلیں۔

5۔ روزانہ صبح نہار منہ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ شہد اور ایک لیموں کا رس ڈال کر پئیں۔

6۔ دن میں کم از کم تین بار میڈیکیٹڈ صابن سے منہ دھوئیں اگر یہ صابن دستیاب نہ ہو تو عام صابن بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

7۔ دو چمچ پودینے کا رس دن میں ایک بار پئیں۔

8۔ مٹی کے پیالے میں تین بادام دودھ ے سا رگڑ کر پیسٹ بنالیں سوتے وقت چہرے پر لگائیں۔ منہ دھولیں۔ رنگ نکھر آئے گا اور جھائیاں غائب ہو جائیں گی۔

9۔ تازہ پودینہ پیس لیں، اس میں آدھا چمچہ شہد ملا کر اس کا پیسٹ بنالیں اور چہرے پر لگائیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں یہ ماسک آپ کے چہرے کی صفائی کرے گا اور مسام بند کر دے گا۔

اگر آپ نے ان ہدایات پر عمل کیا تو کیل مہاسوں سے نجات مل جائے گی اور رنگ بھی نکھر آئے گا۔

